

دلیر یا بے وقوف؟

جرم اور سزاغریبی کی پانچ حقیقی سنسنی خیز کہانیاں

احمد یار خاں



فہرست

۵	کانڈ کے گھوڑے
۴۷	ماں کی خاطر
۹۷	ماتا کے سپوت
۱۶۱	کالی چھپکلی اور ریت کے رستم
۲۲۷	وہ دلیر تھا یا بے وقوف

پیش لفظ

احمد یار خان کی تفتیشی کہانیوں کا سچا مجموعہ پیش کیا جا رہا ہے۔ پہلے مین مجموعہ ”کار، شلوار اور دوپٹہ“، ”بال ایک چڑیل کے“ اور ”جب مجھے انگوٹھا لگا گیا“ آپ پڑھ چکے ہوں گے۔

احمد یار خان کا نام جرم اور سراسر غرسانی کی کہانیوں میں ایک سند بن گیا ہے۔ پاکستان میں جرم اور سراسر غرسانی کی کہانیاں امریکہ اور برطانیہ سے درآمد ہوتی رہی ہیں۔ انہیں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ پاکستان کے ڈائجسٹ پرچے انگریزی سے ترجمہ کی جوتی انہی کہانیوں کی بدولت مقبول عام ہوئے۔ شرک ہومز کو ہمارے ہاں خوب استعمال کیا گیا، اور ان رسالوں کے شائقین نے کہا کہ جرم اور تفتیش کی کہانیاں سمندر پار سے ہی ملتی ہیں، لیکن احمد یار خان نے ان لوگوں کو جھٹلایا اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنی کہانیوں سے شرک ہومز کو لوگوں کے ذہن سے اُتار دیا۔

احمد یار خان افسانے نہیں سنانا بلکہ ہمارے اپنے معاشرے کے وہ ڈرامے پیش کرتا ہے جو پڑھ کر جذبات کو بلا دیتے اور سبھی پیدا کر دیتے ہیں مگر ہمارے معاشرے میں یہ ڈرامے ہر روز کھیلے جاتے ہیں۔ احمد یار خان کی کہانیوں میں بلا جواز لذت نہیں چونکا دینے والی حقیقت ہوتی ہے۔

عنایت اللہ

مدیر ”حکایت“ لاہور

کاغذ کے گھوڑے

گھوڑے بیچنے والی کو میں نے
پہلی نظر میں ہی پہچان لیا کہ
شیطان عورت ہے۔ اُس کی
آنکھیں ہر طرف چوکس ہو کر
پھرتی تھیں۔

کی سوچتا۔ ٹانگیں اور بازو توڑ کر یا ٹیڑھے کر کے بھکاری بنانے کی سبھی انسان نے نہیں سوچی تھی۔ یہ تو نئی تہذیب کی کرشمہ سازیاں ہیں کہ انسان جذبات سے خالی ہو کر مشین بن گیا ہے۔ اس میں اخلاق اور کردار بھی نہیں رہا اور انسانی محبت کی جگہ درندگی نے لے لی ہے۔

ہمارے وقتوں میں کسی کا بچہ انتقامی طور پر اغوا کر لیا جاتا تھا اور اغوا کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جنگ کی خانہ بدوش بچوں کو اغوا کر کے اُن کے سر سے موسیائی نکالتے ہیں جس سے بچہ جرات مند ہو جاتا ہے۔ لوگ کہتے تھے کہ موسیائی آپ حیات کی طرح ہر مرض کی دوا ہوتی ہے لیکن میں نے اتنی لمبی سروس میں ایسی ایک بھی واردات نہیں سنی۔ میں نے موسیائی دیکھی بھی نہیں۔ یہ محض ایک سنسنی خیز روایت یا حکایت معلوم ہوتی تھی۔

ہندوستان کے جنگی علاقوں میں ہندو نسل کے بعض قبیلے کبھی کبھی بچے کی قربانی دیا کرتے تھے۔ ایسی وارداتیں بھی بہت ہی کم سننے میں آتی تھیں۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہیں کہ برصغیر کی پولیس کو اغوا کی واردات کی سراغ رسانی کا نہ کوئی تجربہ تھا۔ عملی ٹریننگ میرے پاس جب پانچ سال عمر کے ایک بچے کی گمشدگی کی رپورٹ آئی تو میں پریشان ہو گیا۔ مجھے بھی ایسی وارداتوں کی سراغ رسانی کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ اس سے پہلے میں ایک دودھ پیتی بچی کے اغوا کی تفصیل کامیابی سے کر چکا تھا۔ آپ کو یہ واردات سنا چکا ہوں۔ میرا تجربہ اسی ایک واردات تک محدود تھا۔ میں قتل اور دہشت جیسی سنگین اور پیچیدہ وارداتوں سے کبھی نہیں گھبراہٹا تھا بلکہ مجھ پر تفتیش کا جنون سا طاری ہو جاتا تھا۔ اس دودھ پیتی بچی کے اغوا کے تقریباً سات تین سال بعد میں ہندوستان کے ایک اور قصبے کے تھانے کا انچارج تھا۔ غریب آفتاب سے کچھ دیر بعد ایک مسلمان سفید پوش روتا ہوا آتما نے میں آیا

بچوں کے اغوا کو میں قتل سے زیادہ سمجھا تک اور گھناؤنا جرم سمجھتا ہوں۔ آج کل یہ جرم اور زیادہ سمجھا تک ہو گیا ہے کیونکہ بچے اغوا کر کے خراکوں کے حوالے کر دیتے جاتے ہیں۔ آپ اخباروں میں پڑھتے رہتے ہوں گے کہ خراک داران بچوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ بعض بچوں کو پیشہ ور بھکاری بڑے ہی ظالمانہ طریقوں سے بازوؤں اور ٹانگوں سے معذور کر کے انہیں مانگنے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ایک اچھے گھرانے کے بچے کا ساری ٹرسٹیک مانگتے رہنا تو ایک حادثہ ہے، اگر آپ وہ طریقہ دیکھیں جن سے بچے کے بازوؤں اور ٹانگوں کو ٹیڑھا کیا جاتا ہے تو آپ کے ہوش ٹھکانے نہ رہیں، آپ کا غش کھانا میرا کھانا نہ ہو۔ بچہ شدید درد سے چیخا رہتا ہے اور یہ عمل کئی مہینے جاری رہتا ہے۔ جسمانی معذوری کے ساتھ بچہ اعتماد بے کی ادیت اور درد کے اثر سے ذہنی طور پر بھی معذور ہو جاتا ہے۔

ہمارے وقتوں میں یعنی جب ہم بھی جوان ہو کر تھے تھے بچوں کے اغوا کی روایت بہت ہی کم تھیں۔ اغوا انتقامی کارروائی کے تحت ہو کر تھا۔ اُس وقت انسان نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ بھکاری جیسا درندگی اور انسان کشی سے بھرپور پیشہ اختیار کرنے

کس پر شک ہے؟

اُس نے بڑے پختہ لہجے میں جواب دیا کہ اُس کی کسی کے ساتھ دشمنی نہیں اور اُسے کسی پر شک نہیں۔ میں نے اپنے ڈھنگ اور طریقوں سے اس پر سوالوں کا سلسلہ شروع کر دیا مگر نتیجہ یہی نکلا کہ بچہ کسی دشمنی کا شکار نہیں ہوا۔

میں نے جب اس کے گھریلو حالات معلوم کیے تو میرا ذہن اس کے گھر میں ہی اٹک گیا۔ اس نے بتایا کہ اس کی دو بیویاں ہیں۔ پہلی بیوی سے تین لڑکیاں ہیں جن میں سب سے بڑی گیارہ سال اور سب سے چھوٹی پچھ سال کی ہے۔ اس آخری بچی کی پیدائش سے چھ ماہ بعد اس شخص نے ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ شادی کی تھی۔ گمشدہ بچہ اس دوسری بیوی کا واحد بچہ تھا۔ مجھے اچانک وہ واردات یاد آئی جس میں ایک آدمی کی پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ ہوئی تو اُس آدمی نے دوسری شادی کر لی جس کے بطن سے ایک بچی پیدا ہوئی۔ یہ بچی تین ماہ کی ہوئی تو گھر سے غائب کر دی گئی۔ بچی کی ماں نے اپنی سوت پر الزام عائد کیا کہ اس کی بچی کو اُس نے حسد کی وجہ سے اغوا کر لیا ہے۔ میری تفتیش میں یہ راز نکلا کہ بچی کو اپنی ماں نے خود اپنی نوکرانی اور اپنے آشنا کی مدد سے غائب کر لیا اور اپنے خاندان کی پہلی بیوی پر اغوا کا الزام عائد کر کے اسے خاندان کی نظروں میں گرانے اور طلاق دلانے کی ایک اوجھی کوشش کی تھی۔ (تفصیلی کہانی میری کتاب "کارشلوار اور وٹھ" میں بعنوان "پانی کا پیار" پڑھئے)

اس گمشدہ بچے کے باپ نے بھی جب بتایا کہ اس کے گھر میں دو بیویاں ہیں اور دوسری شادی کی وجہ یہ تھی کہ پہلی بیوی صرف لڑکیوں کو جنم دیتی تھی، اُسے جانیاد کے وارث کی ضرورت تھی جس کے لیے لڑکا ہونا ضروری تھا۔ لہذا لڑکا پیدا کرنے کے لیے

اور بتایا کہ اُس کا لڑکا جس کی عمر پانچ سال سے دو چار مہینے زیادہ ہے، صبح دس گیارہ بجے کے درمیان گھر سے نکلا پھر واپس نہیں آیا۔ گھر والے جہاں جہاں ڈھونڈ سکتے تھے، ڈھونڈ کر بارگتے۔ تب میں وہاں بھی کرانی۔ محلے کے گھر گھر جا کر دیکھا۔ جس قدر تفتیش کر سکتے تھے کی۔ آخر شک بار کر میرے پاس آگئے۔

اُس وقت بچے کو لاپتہ ہونے کے کم و بیش بارہ گھنٹے گزر چکے تھے۔ وقت اس واردا کا سب سے زیادہ خطرناک عنصر تھا۔ بارہ بارہ گھنٹے غماخ کر چکا تھا۔ واردات کے بعد سے شروع ہونے والے وقت کا ایک ایک منٹ بے حد قیمتی ہوتا ہے۔ واردات پر پڑے پڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ بلز مڈورنکل جاسٹے یا زیر زمین ہو جاتے ہیں اور گھر سے کھون مٹی کی تھوں میں دب جاتے ہیں۔

دوسری بیوی نوجوان تھی

اگر یہ بچہ قتل ہو جاتا تو میں اتنا پریشان نہ ہوتا۔ میں سزا لگا ہی لیتا مگر بچہ اغوا ہو گیا تھا۔ بارہ گھنٹوں میں وہ اُس سست رفتار زمانے میں ایک سو میل دور نہیں تو پچاس میل دور تو نہور پچن چکا ہو گا۔ مجھے یہ یقین ہو گیا تھا کہ بچہ گم نہیں ہوا یعنی گھر کا راستہ نہیں بھولا اغوا ہوا ہے۔ وہ چھوٹا سا صاحبہ تھا۔ بھولا بھٹکا بچہ کوئی نہ کوئی گھر پہنچا دینا اس کے علاوہ بچے کی عمر پانچ سال تھی۔ اس قسم کے شک کا سوال ہی نہیں تھا کہ وہ گھر سے مہالگ گیا ہو گا۔ دور یہ تھا کہ بچہ قتل نہ ہو چکا ہو۔ قتل کا باعث خاندانی عداوت یا کسی اور قسم کی عداوت ہو سکتا تھا جس کا شکار بچہ ہوا اور نہ بچے کے ساتھ کسی کو کیا دشمنی ہو سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے بچے کے باپ سے پہلا سوال یہی کیا کہ اُس کی کس کے ساتھ دشمنی ہے اور اُسے

اس نے دوسری شادی کی تھی۔ اس واردات میں بھی مجھے سوت یعنی پہلی بیوی کا جسد نظر آیا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ پہلی بیوی نے حسد کی آگ بجھانے کے لیے پانچ سال کیوں انتظار کیا؟ وہ دونوں بیویاں ایک ہی گھر میں رہی تھیں۔ پہلی بیوی بچے کو کسی طریقے سے قتل کر سکتی تھی لیکن مجھے یہ خیال بھی آگیا کہ یہ عورت مادی مجرم نہیں ہے۔ وہ حسد اور انتقام کے جذباتوں سے اندھنی کی ہوئی عورت ہے۔ یہ دونوں جذبات ایسے ہیں جن کے زیر اثر انسان انتہائی سنگین جرم کر سکتا ہے۔

میں نے سوچا کہ یہ عورت پانچ چھ ماہ حسد اور انتقام کی آگ کو دوبارہ رہی، آخر یہ آگ اُس کے قابو سے نکل کر اچانک بھڑک اُٹھی اور اس نے سوت کے بچے کو غائب کر دیا۔ صاحبِ رادینہ کا مطلب قتل بھی ہو سکتا ہے۔ قتل کرانے کے لیے اُس نے اپنے بھائیوں یا آشنا کو (اگر کوئی ہے) استعمال کیا ہو گا۔ مگر بچے کے باپ نے یہ کہہ کر کہ اس کی پہلی بیوی ایسا سوت بھی نہیں سکتی، یہ بی بی سوچوں پر پانی پھیر دیا۔

”آپ کی دوسری بیوی آپ کی پہلی بیوی کو طلاق دلانے کی خاطر اپنے بچے کو عارضی طور پر غائب کر سکتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ غیہ جانبدار ہو کر سوچیں، ورنہ بچے کی بے گئی ناممکن ہو جائے گی۔“

”نہیں۔“ اُس نے مذہباتی لہجے میں پورے اعتماد سے جواب دیا۔ ”ایسی عجیب حرکت اس کی فطرت کے خلاف ہے۔“

”آپ کی اور آپ کی بیوی کی ٹہنیوں میں کتنا فرق ہے؟“

”انہیں میں سال۔“

”کیا وہ آپ کو اتنا ہی پسند کرتی ہے جتنا اپنے ہم عمر یا اپنی طرح کے جوان خاوند

کو پسند کرتی؟“

”آپ شاید تسلیم نہ کریں۔“ اُس نے کہا۔ ”وہ مجھے ایک جوان خاوند کی نسبت زیادہ پسند کرتی ہے۔“

”تو پھر یہ معاملہ مشکوک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے شک ہے کہ وہ آپ کو بیوقوف بنا رہی ہے۔“

وہ ڈھٹایا۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں اس قسم کے سوال بھی پوچھوں گا جو اُس کے مردانہ وقار اور جذبات کو مجروح کر دیں گے۔ اُس نے احتجاج کے لہجے میں کہا۔ ”میرا معصوم بچہ کم ہو گیا ہے اور آپ مجھ سے ایسی فضول باتیں پوچھ رہے ہیں جن کا بچے کی گمشدگی کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں۔“

میں نے اُسے کہا کہ میں تفتیش شروع کرنے سے پہلے آپ کی اپنی چار پائی کے نیچے سونا پھیر رہا ہوں تاکہ وہ محاورہ سچ ثابت نہ ہو جائے کہ لٹکا بٹل میں دھندلے درہ شہر میں میں نے اُسے بتایا کہ یہ سوال جو میں نے پوچھے ہیں اور پوچھوں گا وہ بے حد ضروری ہیں اور ہم میں اور اسے میرے ہر سوال کا جواب جذبات سے نکل کر دینا ہو گا۔ میں نے اُسے یہ بھی بتایا کہ میں آج رات نہ سوؤں گا نہ اس کی بیویوں کو اور نہ اُسے سونے دوں گا کیونکہ بچے کی زندگی اور موت کا سوال ہے میں نے خود با اُس نے وقت ضائع کیا تو ہو سکتا ہے بچے کی بجائے اس معصوم کی لاش ملے۔ ”خدا اس کے لیے ملک صاحب! ایسی بات نہ کہیں۔“ وہ میرا ہاتھ اپنے ماتحتوں میں لے کر بولا۔ ”یہ میرا ایک ہی بچہ ہے۔“ اور اُس کے منہ سے جو دھاریں نکلیں انہوں نے میرا جگر چاک کر دیا۔

میں نے تو پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ تفتیش فوراً شروع کر دوں گا۔ حالانکہ رات کے ماٹھے دس بج رہے تھے مگر اس کی آہ و بکا نے میرے جذبات کو ایسا جھنجھوڑا کہ میں اٹھ کھڑا

ہوا۔ اپنے اسے۔ ایس۔ آئی کو بلایا۔ اُسے کہا کہ شہر کے تمام بچہ بڑے، سزا یافتہ اور دیگر مشتبہ افراد کو گنتھا کر کے تفتیش کرے۔ میں نے اُسے بتایا کہ واردات کیسی ہے۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ ان افراد میں ایک بھی ایسا نہیں تھا۔ میں نے بروہ فروشی یا کسی بچے کے انگوٹھے ملوث ہوا ہوں۔ یہ شک ضرور تھا کہ ان میں سے کسی کا باپ کے کسی بروہ فروش کے ساتھ پیشہ ورانہ تعلق ہو سکتا ہے۔ اسے۔ ایس۔ آئی کو میں نے روک کر بھی بلانے کو کہا۔

نجومی سے بتایا تھا

میری کمانیوں سے آپ سمجھ چکے ہوں گے کہ شہر کے مشتبہ افراد (سزا یافتہ اور بدعاش وغیرہ) اور بچہ کون لوگ ہوتے ہیں اور تفتیش میں ان کی اہمیت کیا ہے۔ پولیس والے ان کا استعمال بڑی اچھی طرح جانتے ہیں۔ اسے۔ ایس۔ آئی کو معلوم تھا کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ ذرا الگ سے جانچیں گے اُسے کہا کہ اس شخص کی دونوں بیویوں کے متعلق تمام معلومات حاصل کرنی ہیں۔ اس مقصد کے لیے ہمیں ایک عورت کو استعمال کرنا تھا۔ وہ گھاگ عورت تھی۔ گھوگر کے عجیب جانتی تھی۔

میں ایک کانٹیل کو ساتھ لے کر بچے کے باپ کے ساتھ اُس کے گھر کی طرف چل پڑا۔ میں دانستہ آہستہ چل رہا تھا کیونکہ مجھے اُس سے بہت سی باتیں پوچھنی تھیں۔ سب اہم مسئلہ جانیدا کا تھا۔ کیا اس شخص نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اُس کی جائیداد کا وارث یہ بچہ اکیلا یا اُس کے بعد پیدا ہونے والے بھائی ہوں گے؟

جائیدا کے وارث تو اُس کے ہی ہوتے ہیں۔ اُس نے جواب دیا۔

”کیا آپ نے پہلی بیوی کو کبھی بتایا ہے کہ آپ جائیدا اور لڑکوں کو دیں گے؟“

”میں نے جب دوسری شادی کا فیصلہ کیا تھا تو اُسے یہی وجہ بتائی تھی کہ مجھے جائیدا کا وارث چاہیے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”جائیدا کے وارث داماد تو نہیں ہو سکتے۔“

”بیوی نے کیا کہا تھا؟“

”وہ روپڑی تھی۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ آپ بالیس نہ ہوں۔ خدا نے تین لڑکیاں دی ہیں۔ اب وہ ضرور بیٹا دے گا۔“

”آپ اپنے فیصلے سے ہٹے نہیں؟“

”نہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”مجھے ایک نجومی نے بتایا تھا کہ اس عورت کے لہن سے مرو کبھی جنم نہیں لے گا۔ میں نے دوسری شادی کر لی۔“

”پہلی بیوی کے بھائیوں وغیرہ نے آپ کو کوئی دھکی دی ہوگی یا کچھ کہا ہوگا؟“

”وہ شریف لوگ ہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”انہوں نے برادری کے دو معزز آدمیوں کو میرے پاس بھیجا تھا کہ وہ مجھے دوسری شادی سے روکیں۔ لیکن میں نہیں مانا تو دونوں بھائی خود میرے پاس آئے تھے۔ وہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ میں نے انہیں ہر طرح اطمینان دلایا تھا کہ ان کی بہن کی حیثیت اور حقوق میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔“

”دوسرا رشتہ آپ کو آسانی سے بل گیا تھا؟“

”جائیدا کے لیے کون رشتہ دینے سے انکار کرتا ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”میں نے انہیں صاف کہا تھا کہ دو مکان اور چار ایکڑ زمین ہے جو قبیلے کے بالکل ساتھ ہے۔ کچھ عرصہ بعد اس کی قیمت کسی گنا بڑھ جائے گی کیونکہ قصبہ چھیلے سے یہ زمین زری نہیں ہے گی۔ عمارتی بن جائے گی۔ میں نے انہیں کہا تھا کہ میں یہ جائیدا دامادوں کو نہیں دینا چاہتا۔ وہ فوراً رضامند ہو گئے تھے۔“

”آپ نے یہ معلوم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی ہوگی کہ بیس سال کی عمر کی کنواری لڑکی نے بھی آپ کو دل سے قبول کیا ہے یا نہیں؟“

”ملک صاحب! اُس نے کہا۔“ آپ مسلمان ہو کر ایسی باتیں کرتے ہیں کیا آپ عورت ذات کو اتنا سرچھانا چاہتے ہیں کہ میں یا لڑکی کے والدین لڑکی سے پوچھتے کہ اسے یہ رشتہ منظور ہے یا نہیں؟“

”ہاں شیخ صاحب! میں نے کہا۔“ میں عورت ذات کو سرچھانے کا قائل تو نہیں لیکن میں پولیس آفیسر ہوں۔ بڑے ڈرامے دیکھے ہیں۔ بیس سال کی کنواری دامن جب چالیس سال کے خاوند کے سرچھڑا ہے تو وہ اُس کے دماغ کا وہی حال کر دیتی ہے جو آپ کا چور ہوتا ہے۔“

یہ چند ایک اہم اور قابل ذکر سوال اور جواب ہیں۔ میں نے اُس سے بیشتر سوال پوچھے تھے۔ اُسے دونوں بیویوں پر پورا پورا بھروسہ تھا اور وہ اپنے آپ کو دونوں کا بادشاہ سمجھتا تھا۔ میں آج بھی حیران ہوں کہ لوگ بیٹی کو جائیداد کا وارث بنانے سے گریز کرتے ہیں اور اُسے جائیداد کے لالچ میں باپ کی عمر کے آدمی کے حوالے کر دیتے ہیں۔ میری جوانی کے وقت بھی یہی ہوتا تھا۔ آج بھی یہی ہو رہا ہے۔

اس شخص کو بچہ کی گمشدگی پر رونا اور دھاڑیں مارنا دیکھ کر میں نے اپنے آپ سے کہا تھا کہ خدا اسے اسی گناہ کی سزا دے رہا ہے کہ یہ اپنی تین بیٹیوں کو جائیداد سے محروم رکھنا چاہتا ہے اور اس نے ایک عورت کے مہاگ میں دوسری شادی کا زہر گھول دیلے ہے۔ ہو سکتا ہے اس نے اپنی پہلی بیوی سے یہ بھی کہا ہو کہ دیکھ لیا تم نے، میں نے جائیداد کا وارث بن کر لیا ہے۔ پس کہتے ہیں کہ اللہ کی لاشی بے آواز ہے اور یہ کسی کو بھی نظر نہیں آتی میں

اُس سے باتیں پوچھتا رہا اور وہ جواب دیتا رہا۔

اُس نے مجھ ہی مجھے بھیک میں بٹھایا تو ایک جوان عورت دوڑتی ہوئی بیٹیک میں داخل ہوئی۔ وہ ہانگ لگتی تھی۔ اُس نے بے تابی سے پوچھا۔ ”میرے سنے کو لے آئے؟ کہاں ہے وہ؟“

یہ بچے کی ماں تھی۔ اُس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ اُس کا سر ٹول رہا تھا۔ اس نے میرے پاؤں پکڑ کر اتنی آہ و زاری کی کہ میرے آنسو نکال دیئے۔ اس کی آواز بیٹھی بیٹھی گئی تھی۔ ایک ہی رٹ لگاتے جا رہی تھی۔ ”میرا مٹا۔ میرا بچہ۔“

میں نے اُسے تسلی دی، خاوند نے اُسے اٹھایا اور کرسی پر بٹھا دیا۔ خاوند خود بھی حالت میں تھا۔ بولتے بولتے اُس کی سسکیاں نکل جاتی تھیں۔ میں ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ باپ بیٹی لگتے تھے۔

بیٹیک کے اندرونی دروازے میں ایک اور عورت آن کھڑی ہوئی۔ وہ بھی رورہی تھی۔ وہ پہلی بیوی تھی۔ اُس نے وہی سی آواز میں پوچھا۔ ”مٹے کی کیا خبر ہے؟“

”اللہ کرے کہ مل جائے گا۔“ میں نے جواب دیا اور خاوند سے کہا کہ دوسری بیوی کو میرے پاس چھوڑ کر وہ باہر چلا جائے۔ وہ میرے پاس اکیلی رہ گئی۔ بڑی شکل سے اسے ہلایا اور تعیش کے لیے تیار کیا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ خاوند کو وہ کس حد تک پسند کرتی ہے۔ پولیس والے ایسی باتیں ملزم کرنے کے لیے کوئی بھی سوال سیدھا یا صاف نہیں کرتے۔ ایک ڈھنگ اور ایک خاص انداز ہوتا ہے۔ بڑی دھڑکاؤ کا شمار ہے۔ مشتہ کے چہرے کے آتے جاتے رنگ اور جواب دینے کے مختلف انداز اور لہجہ دیکھتے پڑتے ہیں۔ بعض اوقات ایک واضح جواب اتنا واضح نہیں

ہوتا تھا پھرے کا تاثر۔ مشتبہ فرسوالوں کے چکر میں ایسا اُبھتا ہے کہ وہ محسوس ہی نہیں کر سکتا کہ ایک ایک سوال کئی کئی بار پوچھا جا رہا ہے۔ وہ ہر سوال کو نیا سمجھتا ہے، اور اپنے آپ کو ہوشیار اور چالاک سمجھ کر یہ دیکھنے بغیر جواب دیتا چلا جاتا ہے کہ اسی سوال کے وہ دو تین جواب دے چکا ہے اور ہر بار اس نے نکتہ جواب دیا ہے۔ اگر تھانیدار ذہین ہو تو وہ تشدد کے بغیر اقبال جو کم کر دے سکتا ہے۔

پہلی بیوی — بچہ نہ شرار رہا،

اس جوان سال عورت کے گرد میں۔ سوالوں اور سوال در سوال کا بھال پھیلنا شروع کر دیا اور ڈیڑھ دو گنے گزر گئے۔ اسے تسلی و دلالت کی ضرورت تھی جو میں پوری کرنا رہا میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اپنے بچے کی گمشدگی میں اس کا اپنا ہاتھ نہیں اور یہ بھی کہ اپنی سوت پر اسے ذرا براہِ شبہ نہیں۔ میں نے اس کے منہ میں یہ شبہ ڈالنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن اس نے قبول نہیں کیا۔ میں یہ سن کر حیران بھی ہوا کہ اسے اپنی سوت کے خلاف کوئی شکایت نہیں اور وہ دونوں اتفاق سے رہتی ہیں۔

اس دوسری بیوی کا انداز اور اسب ولہجہ تبار ہاتھ تھا کہ اسے کسی پر شک نہیں۔ اپنے خاوند کے متعلق اس نے بتایا کہ اچھا آدمی ہے۔ میں نے اس سے یہ بھی کہلوایا کہ اسے اپنے خاوند کے ساتھ ایسی محبت نہیں جیسی اسے اپنی عمر کے خاوند کے ساتھ ہوتی۔ پھر بھی مجھے اس سے کوئی ایسا اشارہ نہ ملا جس سے کسی شرارت یا سازش کا شک ہو تا۔ وہ بے قابو ہو کر روتی تھی۔ بار بار میرے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر یا میری ٹھوڑی پر کھوکر منتیں کرتی تھی کہ اس کا بچہ اب پس لا دوں۔

اسے باہر بھج کر پہلی بیوی کو بلایا۔ اسے بھی تعینش کے چکر میں ڈالا مگر یہ بھی دھن۔ بیوی سختی نظر آتی تھی۔ میں نے اس کے جذبات کو اس کے خاوند کے خلاف اور دوسری بیوی کے خلاف بھڑکانے کی بھی کوشش کی۔ اس کے فہم میں جانیو بھی ڈالی لیکن یہ عورت یا تو سبذ باقی نمائے مرده ہو چکی تھی یا گھر کی چار دیواری میں ہی تارک الدنیا ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے خاوند اور سوت کے خلاف کوئی شکایت نہ کی۔ اگر وہ خاموش رہتی اور میرے سوالوں کے جواب ادھر سے ادھر سے اور گول گول دیتی تو میں شک میں پڑ جاتا۔ اس کا ہر جواب صاف اور واضح تھا۔

اگر مجھ میں انسان شناسی کی کچھ مہارت تھی تو بچے کی گمشدگی میں اس عورت کا ہاتھ نہیں تھا۔ جائیداد کے متعلق اس نے کہا کہ مجھے جائیداد کی کیا ضرورت ہے۔ بچیاں چھوٹی ہیں۔ پھر بھی باپ نے ابھی سے مجھے اس مقصد کے لیے الگ پیسے دینے شروع کر دیئے ہیں کہ ان کا جینرنا شروع کر دو۔ بچیاں اپنے گھروں میں چلی جائیں گی۔ میں اس دنیا سے چلی جاؤں گی۔ خاوند ہے تو سب کچھ ہے۔ میں ابھی بوڑھی نہیں ہوئی۔ اللہ مجھے بھی لڑکا دے گا۔

”تمہاری سوت کے والدین جائیداد کے لالچی معلوم ہوتے ہیں۔“ میں نے کہا۔
”اسی لالچ میں انہوں نے جوان بچی اتنی بڑی عمر کے آدمی کے حوالے کر دی ہے جس کے پہلے بیوی بچے بھی ہیں“

”نہیں۔ ایسا نہیں۔“ اس نے کہا۔ ”انہوں نے کسی لالچ میں اگر لڑکی نہیں دی۔ میں انہیں جانتی ہوں۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو کہا کرتے ہیں کہ لڑکی وہاں دیں گے جہاں وہ بادشاہی کرے گی۔ وہ اپنی لڑکی کو جائیداد دلانا چاہتے تھے مگر میرا خاوند اپنے لڑکے کو جائیداد دینا چاہتا ہے۔ ویسے وہ لوگ اچھے ہیں۔“

اس طرح اُس نے جوابات سبھی کی اس میں مجھے جرم اور شرارت کا شائبہ تک نظر نہیں آتا تھا۔ کبھی کبھی خیال آتا تھا جیسے اس نے اپنے آپ کو اپنے اللہ اور رسول کے حوالے کر دیا ہے۔ مختصر یہ کہ میرے تجربے کے مطابق اس واردات میں یہ عورت ملوث نہیں تھی۔ میں نے اس کے خاندان اور سوت کو بھی اندر بلا لیا۔ سوت یعنی گندہ بچے کی ماں کے والدین بھی وہیں آگئے تھے۔ انہیں بھی بلا لیا۔ بچے کی عادتوں وغیرہ کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ مجھے بچے کا فوٹو دکھایا گیا جو ایک سال بچہ کا تھا۔ پیارا بچہ تھا۔ اُس کی آنکھیں بہت دلکش تھیں۔ مجھے اس کو گنگ گورا بتایا گیا۔ اُس کا رنگ ماں پر گیا تھا۔ اس کی گردن لمبی تھی۔ اگر تصویر میں اس کے ہاں چھوٹے نہ ہوتے، تو میں اسے لڑکی سمجھتا۔ اس کی عادتوں کے متعلق مجھے بتایا گیا کہ اس میں بچوں والی جھجک نہیں ہے۔ اجنبیوں کے سامنے بھی فوراً بے لکھت ہو جاتا ہے۔ اس کا معمول یہ تھا کہ دس گیارہ بجے کے درمیان باہر نکل جاتا تھا۔ گلی جہاں ختم ہوتی تھی وہاں کچھ بندہ خانی تھی جہاں یہ بچہ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلتا کرتا تھا۔ ان تمام بچوں سے اس کے متعلق پوچھا جا چکا تھا۔ کسی ایک بچے نے سبھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ یعنی وہ کھینے کے لیے بچوں تک پہنچا ہی نہیں تھا۔

”کبھی ایسا ہوا ہے کہ بچہ کہیں ڈونگل گیا ہو اور آپ لوگ اسے ڈھونڈ کر لائے ہوں؟“
 ”کبھی نہیں“ اُس کی ماں نے جواب دیا۔ ”خود ہی جاتا اور گھنٹہ ڈھونڈ کھنڈ کھیل کر واپس آ جاتا ہے۔“

”گھر میں کسی ایسی عورت کا آنا جانا تو نہیں جس کو کچال پلن کی بوتل“
 ”نہیں۔“ سب نے تائید کی کہ اس گھر میں مجھے برادری کی عورتوں کے سوا اور کوئی نہیں

آتا۔

پھر بچہ کہاں جا سکتا تھا؟ جیسا کہ میں کہ چکا ہوں کہ وہ زمانہ خنکاروں کا نہیں تھا اور بچوں کو معذور کرنے کا پتہ بھی موجود نہیں تھا۔ اگر بچہ لڑکی ہوتی تو گندگی قابل فہم ہو سکتی تھی۔ اُس کی خوبصورتی غیر معمولی تھی۔ ٹیکسک بھی پیدا ہوا کہ ہندوؤں کے اُس قبیلے کا کوئی آدمی اُسے نہ اٹھا لے گیا ہو جو بچوں کی قربانی دیا کرتے ہیں۔ چند سال پہلے میرے تھانے سے پچاس میل دُور برہمنوں نے اچھوتوں کے ایک بچے کو ذبح کر دیا تھا۔ یہ قربانی چیمپک کی دیوی کو دی گئی تھی۔ وہ لوگ پکڑے گئے تھے۔ غالباً انہیں سزا بھی ملی تھی۔ اس کے علاوہ مجھے کوئی اور وجہ سمجھ نہیں آتی تھی۔

بچہ بہر حال اغوا ہو گیا تھا اور مجھے بچے کو براہِ کرنا تھا۔ رات کے دو بج چکے تھے۔ میں نے بچے کی ماں کو تسلیاں دیں اور اسے اور باقی سب کو روتا چھوڑ کر تھانے چلا گیا۔ وہاں مژوری علی باباگ رہا تھا۔ سب جانتے تھے کہ میں تفتیش کے معاملے میں کتنا بے آرام اور بے صبر ہوں۔ بچے کی ماں کی فریادیں مجھے مجبور کر رہی تھیں کہ میں وردی نہ اتاروں اور میری آنکھ نہ لگ جائے۔

شہر کے جرائم پیشہ اور شبہ افرا آپکے تھے۔ دو مجر بھی موجود تھے۔ مجھے یہ شک بھی ہوا کہ اگر دونوں کے کسی پیشہ ور مجرم نے یہ واردات کی ہوگی۔ قصبے کے ارد گرد دیہاتی علاقے میں دو پیشہ ور ڈکیت اور رہزن تھے۔ گودہ بڑے پیمانے کی وارداتیں کرتے تھے لیکن اُن کے ریکارڈ میں اغوا اور بردہ فروشی کی ایک بھی واردات نہیں تھی۔ وہ کوئی ایسے نامی گرامی پیشہ ور بھی نہیں تھے کہ جرائم کی تاریخ میں ان کا ذکر آتا۔ ان کی بہادری یہ تھی کہ اس دیہاتی علاقے کے لوگ غریب اور بزدل تھے۔ زیادہ تر گاؤں گھاس اور سرکنڈوں کے بنے ہوئے جموں پڑیوں کے تھے۔ یہ لوگ ان مجرموں سے اتنا ڈرتے کہ انہیں پناہ دے دیتے اور پولیس اگر چلی جائے تو پولیس کو گمراہ کر دیتے تھے۔ مجرم انہیں دھکیلا تو دیتے ہی سب سے تھے لیکن روپے پیسے اور اجناس سے انہیں خوش بھی رکھتے تھے۔

ان دو پیشہ ور مجرموں کے ٹھکانوں پر چھاپہ مارنا یا انہیں تلاش کرنا اس لیے بیکار تھا کہ وہ ایک بیک یعنی بے فخری میں مبتلا نہ آئے تو ہوشیار ہو جائیں گے جس کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بچے کو کہیں دھڑ بھڑا دیں گے، یا قتل کیا کہیں دفن کر دیں گے۔

ماں پر غشی کے دور۔۔۔

شہر کے پیشہ ور مشتبہ افراد اس تین ایسے تھے جو زرا دلیرانہ واردات کر سکتے تھے۔ باقی سب اکیلے اکیلے چھوٹا موٹا مجرم رہنے کے عادی تھے یا خفیہ اڈوں پر چرس اور جوئے کا کاروبار کرتے تھے۔ اگر باہر کے کسی پیشہ ور نے بچہ اغوا کیا ہے تو یہ بچہ کوئی بے جان چیز تو نہیں تھا کہ کوئی تھپا اور اٹھ کر چل دیا۔ میں نے ان افراد کو اپنے مخصوص طریقے سے گھیرا۔ وہ پولیس کی کمزوریوں سے واقف تھے اور میں ان کی کمزوریوں کو جاننا تھا۔ انہی میں میرے خیر بھی تھے۔ میں نے ان کے ساتھ جھجک جھجک کرتے رات کا باقی حصہ گزار دیا اور حاصل صرف یہ ہوا کہ ایک جرم پر مشتمل گروشتہ پندرہ دونوں میں دوبار قصبے میں دیکھا گیا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اُس روز یعنی واردات کے دن بھی اسے دیکھا گیا تھا۔ اُس کا لباس پاجامہ کڑی اور سر پر چادر بنا گیا تھا۔ جہاں گھسے یا دبتے وہ سرمہ ایسا نہیں تھا کہ دن کے وقت سر پر چادر لی جاتی۔ چادر لینے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنا چہرہ چھپائے رکھنا چاہتا تھا۔ چادر سلٹی رنگ کی بتائی گئی تھی۔ باہر کے بڑے جرائم پیشہ جب شہر میں آتے تھے تو رہنے یا چھپنے کے لیے انہیں ٹھکانے کی ضرورت ہوتی تھی۔ یہ ٹھکانہ شہر کا کوئی جرائم پیشہ میاں کرتا تھا۔ مجھے ایسا کوئی سرائے نہ ملا کہ وہ کسی کے پاس ٹھہرے۔ اور مجھے ایسا بھی کوئی اشارہ نہ ملا جو مجھے اس شک میں ڈالے کہ بچے کے اغوا کا جرم یہی شخص ہے۔ اس کا نام بدروین عرف بودا تھا۔ یہ ان دو پیشہ وروں میں سے تھا جن کا میں نے

پلے ذکر کیا ہے۔ میں نے اُسی وقت ایک مخبر اس کی شک لینے کے لیے بھیج دیا۔ رات گزر گئی۔ میرا سر ٹکڑا رہا تھا۔ اڑھائی تین گھنٹے آرام کیا اور جب تھانے میں آیا تو بچے کا باپ اور دو ماموں وہاں بیٹھے تھے۔ وہ میرے لیے کوئی نئی خبر یا کوئی نیا سراغ نہیں لائے تھے۔ وہ میرا سوال بن کر آئے تھے۔ ان کی آنکھیں اور چہرے بتا رہے تھے کہ رات بھر سوئے نہیں۔ انہوں نے یہی ایک خبر سنا لی کہ بچے کی ماں پر غشی کے دورے پڑ رہے ہیں اور صبح ڈاکٹر کو گھر لے گئے تھے جس نے اسے دوائیاں دے کر سلا دیا ہے۔ میں اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ کوئی واضح راستہ نہیں ملتا تھا۔

بہت سوچ و بچار کے بعد میں بچے کے باپ کے ساتھ تھانے سے نکل گیا۔ میں نے شہر کے مشتبہ افراد کو تھانے میں پابند رکھا کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ انہیں آزاد کر دیا تو ان میں سے جس کسی کو مجرم کا علم ہے وہ اسے بتا دے گا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ پیشہ ور مجرموں کے بھی مخبر ہوا کرتے تھے۔ اے۔ ایس۔ آئی سے میں نے کہہ دیا تھا کہ اپنے مخبروں کو اور تین چار بغیر دی کانسیلوں کو قصبے میں گھومتے پھرنے کے لیے اس ہدایت کے ساتھ بھیج دے کہ باہر کا کوئی جرائم پیشہ نظر آئے تو فوراً اطلاع دیں۔

میں یہ نظامات کرتا رہا تھا لیکن بالکل ہی غیر یقینی حالت میں۔ یہ تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ مجرموں کے اغوا کی وارداتوں کی تفتیش اور سراغ رسانی کا مجھے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ بعض اوقات محسوس ہوتا تھا جیسے میں احمقانہ حرکتیں کر رہا ہوں۔ البتہ پولیس کا دیگر تجربہ اور اپنی عقل کچھ ساتھ دے رہی تھی۔ یہ ثابت ہو چکا تھا کہ بچہ گھر کی چھتیلیں کا شکار نہیں ہوا۔ مجرموں نے بھی صبح سویرے اگر قصد یہی کر دی تھی کہ بچے کے باپ کی دونوں بیویاں شریف اور دونوں کے خاندان باعزت ہیں۔ ان گھرانوں میں کوئی سازش نہیں ہو سکتی۔

میں بچے کے باپ اور دو ماہیوں کے ساتھ ان کے گھر کی طرف چل پڑا۔ وہاں جا کر وہ جگہ دیکھی جہاں بچہ جا کر کھیل کر رہا تھا۔ وہاں چھوٹے بڑے بچے کھیل رہے تھے۔ ان سے کچھ باتیں پوچھیں جن میں اہم یہ تھی کہ انہوں نے کسی آدمی کو مشہدہ بچے کے ساتھ باتیں یا پاپا کرتے دیکھا ہے یا نہ انہوں نے بتایا کہ بچے کو میرے سے دیکھا ہی نہیں۔

اس جگہ کے قریب چھوٹی چھوٹی دوکانیں تھیں۔ دوکانداروں سے یہی سوال پوچھا۔ انہوں نے بھی یہی جواب دیا کہ انہوں نے... بچے کو نہیں دیکھا۔ میں دراصل یہ سوچ رہا تھا کہ بچہ کو کئی میں سے ہی لے لیا گیا ہے۔ اس کا بھی ایک طریقہ ہو سکتا تھا کہ اسے کوئی لاپرواہ کر اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ یہ ممکن نہیں۔ تاکہ اسے کوئی دن دہاڑے کبل میں پیٹ کر یا پوری میں ڈال کر لے گیا ہو۔ لاپرواہ سے کہ اپنے پیچھے پیچھے لے جانے کے لیے کوئی ایسا راستہ اختیار کیا گیا ہو گا جس پر آمدورفت کم ہوگی۔ اس زمانے میں آبادی آج کی نسبت بہت کم تھی۔ لوگ بہت کم تھے۔ مکان بھی کم تھے۔

بچے کے ہاتھ میں گھوڑا

میں نے وہاں کھڑے کھڑے یہ فرض کر لیا کہ میں ایک بچے کو اغوا کرنا چاہتا ہوں۔ اسے ٹھکانا دکھاتا ہوں۔ پانچ سال کی عمر کا نادان بچہ میرے پیچھے چل پڑتا ہے۔ میں لیتا کوئی ویران راستہ اختیار کروں گا۔ بچہ میرے ساتھ ساتھ آتا ہے۔ ذرا اگے جا کر اس کے ہاتھ میں تھوڑی سی مٹھائی دے دیتا ہوں۔ وہ میرے ساتھ یا پیچھے چلا آ رہا ہے۔ میں کون سا راستہ اختیار کروں گا؟

میں نے ادھر ادھر دیکھا تو مجھے ایک فران لگی نظر آئی جس کے دائیں بائیں تھوڑے

سے مکان تھے۔ کچھ جگہ خالی بھی تھی۔ یہ گلی کھیتوں سے جا ملتی تھی۔ اگے سڑک تھی۔ سڑک پر چڑھ کر باؤ تو قصبہ پہنچے رہ جاتا تھا۔ میں ٹمٹماتا اس گلی میں چلا گیا۔ محفوظ راستہ قصبے سے نکلنے کے لیے یہی تھا۔ میں گلی کے وسط میں جا کھڑا ہوا۔ زیادہ تر مکان ہندوؤں کے تھے۔ میرے ساتھ بچوں اور بڑی عمر کے آدمیوں کا جلوس تھا۔ میں چاہتا بھی یہی تھا کہ یہ جلوس میرے ساتھ رہے بلکہ بڑھ جائے اس سے مجھے سراخ ملے کی توقع تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس گلی کے مکانوں میں سے چند ایک آدمی نکل آئے۔ عورتیں دروازوں میں کھڑی رہیں۔

میں نے ان سے بلند آواز میں خوشی تقریر کرنے کے لیے میں کہا کہ ایک بچہ تمہاری نظروں کے سامنے سے گزرا کہ کوئی لے گیا ہے۔ اگر مجرم پکڑا نہ گیا تو تمہارے بچے بھی اسی طرح اغوا ہوں گے۔ ذرا یاد کرنے کی کوشش کرو کہ پانچ چھ سال عمر کا ایک بچہ کسی آدمی کے ساتھ کل دوپہر کے وقت یہاں سے گزرا ہو گا۔

میرا یہ سوال بظاہر احمقانہ تھا۔ وہ گلی تھی۔ کبھی بچے اپنے باپوں کے ساتھ یہاں سے گزرتے ہوں گے۔ تمام لوگ خاموش رہے۔ میں نے کچھ اور باتیں کیں اور لوگوں کو کچھ اشارے بھی دیئے۔ مہربانی نظر ایک بڑے ہندو پر پڑی جو ایک مکان کے سامنے چھوٹی سی چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اٹھا اور لاسٹھی کے سہارے میری طرف آیا۔ وہ مجھے ہاتھ اُپر کر کے اشارے کر رہا تھا۔ میں اس کی طرف بڑھا۔

اس نے مجھے بتایا کہ وہ صبح سے شام تک اس چارپائی پر بیٹھا یا بیٹھا رہا ہے۔ عمر کی زیادتی کے علاوہ کہ اور بائیں ٹانگ کا درد اسے اٹھنے نہیں دیتا۔ وہ سارا دن آتے جاتے لوگوں کو اٹھاتا رہتا ہے۔ یہ راستہ چونکہ عام راستہ نہیں ہے کیونکہ اگے کبیت ہیں اس لیے ادھر سے بہت کم لوگ گزر رہے ہیں۔ یہ بوڑھا جہانمیدہ آدمی تھا۔ وہ میرا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے ہنس کر

کہا کہ اہل میں کوئی دخل ہوتا ہے تو میں اُسے دیکھنا شروع کرتا ہوں۔ نظروں سے اوجھل ہونے تک میں اُسے دیکھتا رہتا ہوں یہی میرا شغل رہ گیا ہے۔ اسی سے دل بہلاتا ہوں۔

اُس نے گشتہ روز کے مشاہدات سُنانے شروع کر دیئے۔ اس نے تفصیل سے بتایا کہ اس گلی سے کتنے لوگ گزر رہے تھے، اور وہ کس کس ٹھیلے کے تھے۔ کتنے گشتہ روز سے یہی گزرا کرتے تھے جن پر اینٹیں لڑی ہوئی تھیں۔ اور وہ پھر کے وقت پانچ چھ سال کی عمر کا ایک بچہ بھی گزرا تھا جسے اُس نے اس لیے زیادہ غور سے دیکھا کہ بہت خوبصورت بچہ تھا۔ بچے کے ساتھ ایک آدمی تھا جس نے پاچا لکھ کر تھپہن رکھا تھا۔ اس آدمی کا چہرہ پوری طرح نظر نہیں آتا تھا کیونکہ اُس نے سر پر چادر لے رکھی تھی۔ چادر باقی حصہ کندھوں تک تھا۔

میں نے چادر کا رنگ پوچھا تو بڑھاپا میں پرگیا۔ اس نے تین رنگ بتائے۔ ”سیٹھی، ہلکا نیلا یا چار بہت سیلی تھی“۔ ٹوٹے نے بتایا کہ بچے کے ہاتھ میں کانڈوں کا ہاتھوڑا سیاہ گھوڑا تھا۔ ایسا ہی ایک گھوڑا اُس آدمی کے ہاتھ میں تھا۔

یہاں کانڈوں کے گھوڑے کی تشریح ضروری معلوم ہوتی ہے۔ یہ کھلونا ہوتا ہے۔ کھانوں اور خوبصورت وغیرہ گھوڑا بنا کر اوپر سیاہ پٹا چڑھا دیا جاتا ہے۔ اس پر رنگا رنگ کانڈ چڑتے ہوئے ہوتے ہیں۔ ٹانگیں سرخڑوں کی بنائی جاتی ہیں۔ اُس زمانے میں ایسے گھوڑے عام ہوتے تھے۔ آج کل کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ ایسے گھوڑے کسی کارخانے میں نہیں بلکہ دیہات میں بیٹھے تھے۔ ہوتا خانہ پروش قسم کی عورتیں بنا کر شہروں میں لایا کرتیں اور گلی گلی چپا کرتی تھیں۔ بچوں کے لیے یہ بڑا دکھش کھلونا ہوا کرتا تھا۔

ٹوٹے ہندو نے بتایا کہ وہ چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ اُس نے لیٹے لیٹے بچے اور اس آدمی کو دیکھا اور دیکھتا رہا۔ اسے ایسا کوئی شک نہیں تھا کہ بچہ انوکھا کیا جا رہا ہے۔ اسے بہت

پیارا لگا۔ وہ جب اس کے قریب سے گزرا تو بچے نے کہا ”میں اپنے گھر جا رہا ہوں“۔ آدمی نے کہا ”اُدھر سے نزدیک ہے۔ گھر ہی جا رہے ہیں۔ دوسرا گھوڑا گھر مل کر ملے گا“۔ بچہ اُس کے ساتھ چلنا لگا۔ وہ دونوں چلے گئے تو آگے یعنی بعد وہ گئے تھے ایک بوڑھی عورت آہی تھی۔ وہ مسلمان تھی۔ ہندو نے اس کا نام بھی بتایا جو مجھے یاد نہیں رہا۔ اسی گلی کے قریب رہتی تھی۔ ہندو اور یہ مسلمان عورت ہم عمر تھیں۔ ایک دوسرے کو ابھی طرح جانتے تھے۔ پرانے وقتوں کے لوگ تھے۔ بڑھاپا اس کے پاس رک گئی اور وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ باتوں باتوں میں اس بچے کا ذکر آ گیا۔ ہندو دراصل بچے کی خوبصورتی کی تعریف کرنا چاہتا تھا۔ بڑھاپے نے اُسے بتایا کہ یہ دوسری بیوی کا بچہ ہے، پہلی بے جاری کی صرف لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں۔ بوڑھوں کی عادت ہوتی ہے کہ بے معنی سامانوں کو لے کر کتنی ہی دیر اسی میں اُلجھے رہتے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ کتنے ہی اہم موضوع پر باتیں کر رہے ہیں۔

میں نے اس مسلمان بڑھاپا کو بلوایا اور ہندو سے پوچھا کہ اُس نے کل ایک بچے کی کشگی کی منادی سنی تھی، اُس نے منادی سنی تھی لیکن اسے بالکل شک نہیں تھا کہ یہ وہی بچہ ہے جس کی کشگی کی منادی کرائی جا رہی ہے۔ بڑھاپا آئی تو اُس نے بتایا کہ اس نے منادی سنی یہی نہیں اُس نے تصدیق کی کہ اُس نے گشتہ بچہ ایک آدمی کے ساتھ جاتا دیکھا تھا لیکن اس نے اس آدمی کا علیہ اور لباس غور سے نہیں دیکھا۔ کانڈوں کا ایک گھوڑا بچے کے ہاتھ میں اور ایک اس آدمی کے ہاتھ میں دیکھا تھا۔

اس قیمتی سرائے سے یہ ثابت ہو گیا کہ بچہ انوکھا ہو گیا ہے اور اس راستے سے گیا ہے۔ اب یہ معلوم کرنا تھا کہ یہاں سے آگے بچہ کہاں اور کس طرح لے جایا گیا۔ آگے تا نگہ انتظار میں تھا یا گھوڑا یا کوئی اور انتظام تھا۔ اس سے پہلے ایک خبر بتا چکا تھا کہ بودا کو شہر میں دیکھا گیا تھا۔

اُس کے سر پہ لٹٹی رنگ کی چادر تھی۔

عصمت فروشی بھی کرتی تھی

گشہہ بچے کا باپ میرے ساتھ تھا۔ اُس نے کہا۔ ”میرا بچہ کاغذوں کے گھوڑوں کا عاشق ہے۔ تین گھوڑے پھاڑ چکا ہے۔“ اسے گھوڑے کے لالچ میں ہی اغوا کیا گیا ہے۔
یہ سن کر میری ایک اور حس بیتاب ہو گئی۔ یہ الفاظ میرے لیے بڑے اہم تھے۔
”بچہ کاغذوں کے گھوڑوں کا عاشق تھا۔“ اس کا مطلب یہ تھا کہ اغوا کرنے والے کو معلوم تھا کہ بچہ گھوڑے کے لالچ میں پھنسے گا۔ مجھے یہ خیال یہ آیا کہ اغوا کرنے والا ان کے اپنے ہی نمائندہ گھوڑوں کی آویں جو بچے کی عادتوں سے واقف ہوگا لیکن میں یقین کر چکا تھا کہ اس خاندان میں ایسا جوہر نہ والا کوئی آدمی نہیں۔ سب عورت دار لوگ تھے۔ یہاں میری عقل کا امتحان تھا۔

میں وہاں سے پہل بڑا اور بچے کے گھر جا بیٹھا۔ باپ سے پوچھا کہ اس کے بچے نے جو تین گھوڑے پھاڑے ہیں وہ کہاں سے خریدے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ ایک دیہاتی عورت کچھ عرصہ سے گھوڑے بیچنے آتی ہے۔ اُسے چونکہ معلوم ہے کہ بچہ گھوڑے پسند کرتا ہے، اس لیے ان کے دروازے پر آکر ضرور آواز دیتی ہے۔ میرے پوچھنے پر مجھے بتایا گیا کہ وہ پندرہ بیس روپے بعد آتی ہے۔ واردات کے روز یعنی ایک روز پہلے وہ نہیں آتی تھی۔

میں نے ایک آدمی کو یہ کہہ کر باہر بھیجا کہ، بچوں سے یادوں و کاغذوں سے معلوم کرے کہ کیا یہ عورت کل گھوڑے بیچنے آئی تھی؟ میں نے اس دوران بچے کی ماں سے کچھ باتیں کاغذوں کے گھوڑوں کے متعلق پوچھیں۔ ان سے یہی تصدیق ہوئی کہ بچہ ان گھوڑوں کا بے حد شوقین تھا۔
نیا انکشاف یہ ہوا کہ یہ عورت اندرا جاتی تھی اور بچے کے ساتھ پیار کرتی تھی۔ میرے کریدنے پر

یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ عورت بچے کو عجیب سی نظروں سے دیکھا کرتی تھی۔ یہاں تک کہ ماں نے ایک بار بچے کے ماتھے پر سرنے کی لکیر ڈال دی تھی کہ بچے کو نظر بد نہ لگ جائے۔

یہاں میں اپنے قارئین کو تفتیش کے معاملے میں یہ بات بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ تفتیش کرنے والے پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ کس بات کو اہم سمجھتا ہے اور کس بات کو معمولی سمجھ کر ٹال جاتا ہے۔ اس کے لیے تجربے اور عقل کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے ساتھ خلوص اور فرض کی لگن کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ تفتیش کی کامیابی کا دار و مدار اسی پر ہوتا ہے۔ مثلاً کاغذوں کا گھوڑا اور گھوڑے بیچنے والی عورت میرے ذہن میں ایک گئی، لہذا میں نے جرح اور پوچھ گچھ اسی پر مرکوز کر دی۔ اس پر تو جو مرکوز کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ عورتیں جو گھوڑے اور مٹی کے کھونے بنا کر شہر بیچنے آیا کرتی تھیں، اچھے چلن کی عورتیں نہیں ہوتی تھیں۔ ان کی ذہنیت مجرمانہ تھی۔ عصمت فروشی تک کرتی تھیں۔ اس عورت کے متعلق یہ کہنا کہ یہ اغوا کے جرم میں شامل ہے غلط نہیں ہو سکتا تھا۔

اتنے میں باہر سے وہ آدمی یہ اطلاع لایا کہ کل یہ عورت گھوڑے بیچنے آئی تھی اور اسے گلی کے سرے پر کھڑے دیکھا گیا تھا۔ اب ایک آدمی ایسا بھی مل گیا جس نے بتایا کہ سر پر چادر لیے ہوئے ایک آدمی گلی کے سرے پر کھڑا دیکھا گیا تھا۔ یہ خبر دینے والے کو بھی میں نے بلالیا۔ اللہ میری مدد کر رہا تھا۔ یہ آدمی اتفاقیہ سانسے آگیا تھا مگر بچے کو اس آدمی کے ساتھ باتیں کرتے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ بہر حال میرے لیے اہم مسئلہ یہ تھا کہ گھوڑے بیچنے والی عورت آئی تھی اور وہ اس بچے کے گھر نہیں آئی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ یہاں ایک بچہ اس کا مستقل گاہک ہے۔

میں تھانے چلا گیا۔ شائبہ افراد تھانے میں موجود تھے۔ ان سے گھوڑے بیچنے والی

عورت کے متعلق پوچھا کہ ان میں سے اسے کوئی جانتا ہے یا نہیں۔ تین چار نے بتایا کہ وہ اسے صرف جانتے ہی نہیں بلکہ یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ وہ کہاں رہتی ہے۔ انہوں نے اس کا نام بھی بتایا جو آج مجھے بالکل یاد نہیں رہا۔ انا نام تھا۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ پچیس چھبیس سال عمر کی تھیں۔ خوبصورت تھیں لیکن اتنی عواذ نہ تھیں جتنی چالاک اور نکار تھیں۔

میرے لیے یہ کافی تھا کہ میرے نام کے جرائم پیشہ آدمی اسے جانتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس فحاشی کی عورت ہے۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ گھوڑے پہنچا تو بہانہ ہے، وہ حمل پر نہیں۔ کیسے کیسے نکل کھاتی ہے۔ و صرف میرے ہی قصبہ میں نہیں آتی تھی، دوسرے قصبوں اور شہروں تک بھی پہنچتی تھی۔ یہ ایک قبیلہ تھا جس کا پیشہ لفظ پر کچھ اور، درپردہ کچھ اور تھا۔ میں نے ضروری سمجھا کہ اس عورت کو کچھ کر شامل تفتیش کیا جائے۔ کاغذوں کے گھوڑے اسی سے خریدے گئے ہوں گے اور اسی تپہ چل سکتا ہے کہ اس سے دو گھوڑے کس نے خریدے تھے اور انہیں کہاں سے، یہ تھے تو کیا وہ اسے جانتی پہچانتی تھی؟

مجھے اس کا جو ٹھکانہ بتایا گیا وہ قصبے سے ایک میل سے کچھ زیادہ دُور تھا۔ وہ گھاس اور برآمدلوں کی بنی ہوئی سات آٹھ جگہوں کی ایک بستی تھی جس میں اسی عورت کا قبیلہ رہتا تھا۔ میں نے دو کانسیل اس عورت کو ساتھ لانے کے لیے بھیج دیئے۔ یہ کانسیل روانہ ہوئے تو میرا وہ مجر واپس آگیا جسے میں نے بودا کے گاؤں بھیجا تھا۔ وہ صرف یہ خبر لایا کہ بودا کاؤں میں سے تین تھیں بچے کیسے متعلق کسی کو نہیں تھیں تھی۔

میں ہندوستان کے جس علاقے کی وارداتیں سنا رہا ہوں وہ کچھ چٹانی سا، کچھ جنگلاتی سا اور کچھ میدانی بھی تھا۔ وہاں رہنری کی وارداتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اس لیے بعض جگہوں پر پچیس چوکیاں قائم کر دی گئی تھیں۔ ایسی پانچ چوکیاں میرے تھانے کے ماتحت تھیں میں نے

اس چوکی کے اے۔ ایس۔ آئی کو جس میں بودا کا گاؤں آتا تھا یہ اطلاع بھیجوائی کہ بودا کو پتہ لگے بغیر اسے نظر میں رکھو اور تمام رات اس کے گھر کے ارد گرد گُڑ جوڑ رہے۔ میں نے مختصر یہ کہیں بھی اسے بتا دیا۔ میرا ایک کانسیل اسی وقت روانہ ہو گیا۔ وہاں شمس الحق نام کا ایک لے۔ ایس آئی تھا جو وہیں اور پھرتا تھا۔ بودا ہمارے ریکارڈ میں تھا۔ شمس الحق اسے اچھی طرح جانتا تھا۔

عورت شوخ، خاوند مر جھپایا ہوا

گھوڑے پیچنے والی آگئی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ وہ گھر پر لگی ورنہ ان جنگلیوں کی ٹوٹیں دن بھر غائب رہتیں اور رات کو گھڑلتی تھیں میں نے اسے پہلی نظر میں پہچان لیا کہ شیطان عورت ہے۔ گھبراہٹ اپنے ہوتے تھی۔ جسم نہایت اچھا اور پیرے میں کشش تھی۔ اس کی آنکھیں ہر طرف چوکس ہو کر پھرتی تھیں۔ مجھے توقع تھی کہ مجھ سے اور تھانے سے ڈر جائے گی، مگر اندر آتے ہی اس نے افسوس کی طرح پوچھا۔ ”مجھے کیوں بلایا ہے داروغہ جی؟“

اس کے ساتھ دوسرے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر اور ایک اس عورت سے کچھ بڑا لگتا تھا۔ ادھیڑ عمر تو اس کا ماموں یا چچا تھا، دوسرا اس کا خاوند تھا۔ خاوند اس عورت کے بالکل الٹ تھا۔ پتھر مر جھپایا ہوا، لاغر سا جسم اور وہ مرعیش لگتا تھا۔ دونوں مردوں سے ہوتے تھے۔ میرے کمرے کے دروازے میں کھڑے رہے۔ مجھ سے اس عورت نے (جو دراصل عورت نہیں بلکہ جوان لڑکی تھی) نظر سنا ہونے کے پوچھا کہ میں نے اسے کیوں بلایا ہے۔

”کل تم یہاں کاغذوں کے گھوڑے بیچنے آئی تھیں؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”ہاں اے۔ اس نے تن کر جواب دیا۔“ آئی تھی۔“

”کتنے گھوڑے بیچے تھے؟“

اُسے اندر بلایا تو اُس نے عورت کو پہچان لیا اور کہا کہ یہ اس کھلی کے سر سے پرکھڑی تھی اور اس کے پاس ایک آدمی سر پر چادر لیے کھڑا تھا۔

”وہ آدمی کون تھا؟“ میں نے گھوڑے بیچنے والی سے پوچھا۔

”میں کیا جانوں؟“ اس نے جواب دیا۔ ”کھلونے بیچنے آتی ہوں۔ سو آدمی میرے پاس رُک کر دیکھتے ہیں۔“

میں نے اُسے کو جھجکا کر اسے کہا۔ ”تم نے اتنے زیادہ جھوٹ بولے ہیں کہ تم اپنے آپ میرے حال میں اگنی بنو۔ اب بھی وقت ہے۔ اگر بچو واپس کر دو تو وعدہ کرتا ہوں کہ صاف چھوڑ دوں گا۔ اگر اسی طرح نکاری کرتی رہو گی تو بچہ بھی برآمد کر لوں گا اور تمہیں ساری عمر جیل سے نہیں نکلنے دوں گا۔“

”میرے پاس کوئی بچہ نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اگر تم کہتے ہو کہ ہے تو پلو میرے گھر سے برآمد کر لو۔“

مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ اس کے ساتھ جو آدمی آئے ہیں ان میں ایک اس کا خاوند ہے۔ میں نے خاوند کو اندر بلایا اور اس چرطیل کو برآمدے میں بھیج دیا۔

”تمہاری بیوی نے ایک بچہ اغوا کر لیا ہے۔“ میں نے خاوند سے کہا۔ ”تم بھی اس جرم میں شامل ہو گے۔ میں اب تمہیں واپس نہیں جانے دوں گا۔“

اُس نے میرے پاؤں میں بیٹھ کر میرے پاؤں پر ہاتھ رکھ دیئے، پھر ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”میں کسی بھی جرم میں شامل نہیں۔ میرے گھر میں اغوا کیا ہوا کوئی بچہ نہیں ہے۔ میں اپنی بیوی کے لیے قسم نہیں کھا سکتا۔ یہ بڑی ظالم عورت ہے۔“

”کیا تم اس کے خاوند نہیں ہو؟“

”یاد نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”سوچ کر بتاتی ہوں۔“
”رہنے دو۔“ میں نے کہا۔ ”ہوئے نے تم سے کتنے گھوڑے خریدے تھے؟“
”ہو دو کون؟“

اُس نے ایسے بارعب لہجہ میں اور ایسی خود اعتمادی سے جواب دیا کہ میں چکر گیا اور میں سمجھا کہ وہ واقعی ہونے کو نہیں جانتا، مگر میں سنبھل گیا۔ مجھے اتنی جلدی تسلیم نہیں کرنا چاہیے تھا کہ وہ اغوا میں ملوث نہیں۔ میں نے اُسے بٹھالیا اور اپنے مخصوص انداز سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ یہ سوالوں کا ایک سلسلہ تھا کہ اس کی سمجھت عورت نے مجھے پریشان کر دیا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ میرے ہاتھ نہ آنے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ معصوموں میں جھگڑا کر رہی تھی۔ وہ بے شک میرے ہاتھ نہیں آئے۔ مگر یہی نہیں کہ وہ میرے ہاتھ سے بچ رہی ہے۔ وہ بڑبڑ رہی ہے اور ہودا کے ساتھ اگر اس کا اور کوئی تعلق نہیں تو کل اس نے ہودے کو دو گھوڑے ضرور دیئے تھے۔

گمشدہ بچے کا باپ تھانے میں ہی تھا۔ میں نے اُسے بلایا اور پوچھا کہ کیا اس کے گھر پر عورت گھوڑے لے کے آیا کرتی تھی؟ اُس نے اس عورت کو پہچان لیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ جب جس یہاں آتی، ان کے گھر ضرور جایا کرتی تھی، کھلی کیوں نہیں گئی؟
”میری مرضی۔“ اُس نے جواب دیا۔

”تم ان کی کھلی تک تو لگتی تھیں۔“ میں نے کہا۔ ”چند قدم آگے کیوں نہ گئی؟ وہاں تھا کھلی کا کھتا۔“

”میں ان کی کھلی تک بھی نہیں گئی؟“
میں نے وہ آدمی بھی ساتھ کھاتا تھا جس نے اس عورت کو کھلی کے سر سے پرکھیا تھا۔

”نام کا خاوند ہوں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”ہمارے قبیلے کا رواج ہے کہ شادی
پہنت کرتا ہے۔ رشتے وہی جوڑتا ہے۔ حساب ایسا بیٹھتا تھا کہ میری شادی اسی کے ساتھ
ہونی تھی سو ہو گئی۔ مگر یہ عورت ایسی پیچھے ہے کہ مجھے نوکر سمجھتی ہے۔“

”تم بدین حرفت ہوئے کو ہاتھ نہ بڑھو؟“

”بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔“ کاہل۔ اُس نے جواب دیا۔ ”اُس کچھ کو نہ بتانا ورنہ
مجھے جان سے مار ڈالے گی۔ اُس کا خاوند ہوا ہے، میں نہیں ہوں۔ ہم دونوں تو یوں کہو کہ
ایک جھبونیڑے میں رہتے ہیں کبھی۔۔۔ اودا ہمارے گھر آتا ہے تو بیوی مجھے کسی کام سے شہر
بجین دیتی ہے۔ ہمارے باقی لوگ بودے سے ڈرتے ہیں۔ بودا سب کی ٹہل سدا بھی کرتا ہے۔“
”کل صبح بودا تمہارے گھر آیا تھا؟“

”رات ساری ہمارے گھر ٹھہرا تھا۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”صبح سویرے پہلے بودا
نکلا اور شہر کی طرف چلا گیا۔ پھر میری بیوی بانس کے ساتھ گھوڑے لٹاکر شہر چلی گئی۔“

”بودا واپس آیا تھا؟“

”نہیں۔“ اُس نے جواب دیا اور ہاتھ جوڑ کر التجا کی۔ ”اُس ڈان کو نہ بتانا سرکار کہ
میں نے یہ ساری باتیں آپ کو بتائی ہیں ورنہ مجھے جینے نہیں دے گی اور یہ مجھے بودے سے
مروا دے گی۔ میں تو کہتا ہوں سرکار! اسے قید کر لو اور اسے ساری عمر نہ چھوڑو۔“ مچھوڑے جاتے تو
مجھے خوشی ہو گی۔“

اپنے خاوند کو لائٹیاں ماریں

یہ مرلیاں بنگلی انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ میں اُس کے جذبات کو اچھی طرح سمجھتا

تھا۔ میں نے اس سے کچھ اور کام کی باتیں پوچھ کر باہر برآمدے میں بیٹھنے کو کہا اور اس کی
بیوی کو اندر بلایا۔ میں اپنی کامیابی پر اتنا زیادہ خوش تھا کہ میں جلد بازی کر گیا۔ میں نے اسے
کہہ دیا۔ ”اب جھوٹ نہ بولنا۔ بودا کو ساری رات اپنے گھر رکھ کر تم کس کس سے چھپاؤ گی؟“

وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ یہ غصے کا رنگ تھا۔
اتنے میں ایک کانٹیل لائٹیاں اٹھائے میرے دروازے میں داخل ہوا۔ مجھے یاد نہیں وہ میرے
پاس کیوں آیا تھا اور اُس نے لائٹیاں کیوں اٹھا رکھی تھی۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا تو گھوڑے
بیچنے والی نے بھی اُس کی طرف دیکھا۔ کانٹیل اس کے قریب آچکا تھا۔ پھر ایسے ہوا جیسے بجلی
چمکی ہو۔ اس جوان عورت نے حیران کر دینے والی پھرتی سے کانٹیل کے ہاتھ سے لائٹیاں چھین لی اور
دروازے سے باہر نکل گئی۔ کانٹیل نے لائٹیاں ڈھیلی سی گرفت میں لے رکھی تھی۔ برآمدے میں سے
مجھے لائٹیاں کی ضربوں کی اور کسی کی آہ و بکا کی آوازیں سنائی دیں۔

کانٹیل کے پیچھے پیچھے میں باہر کو دوڑا۔ وہ عورت لائٹیاں سے اپنے خاوند کو اوندھا کر
چلی تھی اور پھونکارتے بیوے کے گھر بھی تھی۔ ”اٹھ، دے بیان دارو نہ کو۔“

لڑکی کو کانٹیلوں نے پکڑ لیا تھا اور اُس سے لائٹیاں لے لی تھی۔ اس کا خاوند برآمدے
میں اوندھے منہ پڑا تھا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ عورت کو میں نے حوالات میں بند کر
دیا۔ اس کے خاوند کے زخم دیکھے۔ سر پر دو ضربیں تھیں جو اتنی زور سے لگی تھیں کہ خون بہہ رہا تھا
اور دو ضربیں پیٹھ پر تھیں۔ یہ پولیس کی لائٹیاں تھیں۔ اس لائٹیاں کے نیچے والے سرے پر
تقریباً ڈیڑھ فٹ لمبا وہ بے کاغذ چڑھا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس عورت کے جسم میں
جوانی کی طاقت اور اس طاقت میں قمر پیدا کرنے کے لیے دہائیوں میں خاوند کے خلاف نفرت
اور انتقام کا جذبہ تھا۔ خاوند کے جسم میں اتنی جان ہی نہیں تھی۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا میں

نے اُسے چار پائی پڑوا کر مستقبل بھیج دیا اور اس کی بیوی کے خلاف کیس رجسٹر کر لیا۔

اب کسی شک کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ شام ہو چلی تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اگلی کارروائی آج ہی رات کروں گا۔ میں نے اسی وقت ایک گھوڑا منگوا کر شمس الحق کی پولیس چوکی کو ایک کانسٹیبل سوار کے اس پیغام کے ساتھ دوڑا دیا کہ بوردے کے گھر کو خفیہ گھرے میں لے لو۔ میں تہا پہ مارنے آ رہا ہوں۔ مجھے یہ توفیق ہو کہ شمس الحق کو بچہ بوردے کے گھر میں ہو گا۔ یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ بچے کو کس مقصد کے لیے انوا کیا گیا تھا۔

میں نے بچے کے باپ سے کہا کہ وہ گھر جا کر کھانا کھا لے اور ساڑھے تین میل پیدل جانے اور آنے کے لیے تیار ہو کر آ جائے۔ اُسے یہ بھی کہا کہ اُسے کوئی ٹوٹا گھوڑا اپنی سواری کے لیے مل جائے تو لے آئے اور ایک گھنٹے سے زیادہ وقت نہ لگائے۔ اُسے ایک دو آدمی اپنے ساتھ لگانے کی بھی اجازت دے دی۔ چھاپہ مارنے کے لیے آٹھ کانسٹیبل تیار کیے اور انہیں کہا کہ وہ کھانا کھا کر راتوں سے صبح ہو جائیں۔ میں بھی کھانا کھانے چلا گیا۔ اپنے لیے اور اپنے بیٹہ کانسٹیبل کے لیے میں نے دو گھوڑوں کا انتظام کر لیا۔

کھانا وغیرہ کھا کر میں واپس آیا تو ہر کوئی تیار تھا۔ بچے کا باپ بچے کے دو مانوئل کو سامنے لے آیا تھا لیکن ان کی سواری کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ سورج ڈوبے کچھ دیر ہو گئی تھی۔ مجھے اندھیرہ کی ہی ضرورت تھی۔ کانسٹیبلوں کو پیدل جانا تھا۔ میں نے بچے کے باپ اور اُس کے ساتھیوں کو کانسٹیبلوں کے ماتھے روانہ کر دیا۔ بچے کی برآمدگی کی صورت میں مجھے شناخت کے لیے اُس کے باپ کی ضرورت تھی۔ کانسٹیبلوں کو میں نے ضروری ہدایات دے دیں اور بتا دیا تھا کہ میں انہیں کہاں ملوں گا۔ ہمارے سامنے ساڑھے تین میل کا سفر تھا۔ بوردے کے گاؤں کا راستہ مجھے معلوم تھا۔ میرا گھوڑا سوار قاصدا ہے۔ اس آئی شمس الحق کو پیغام دینے

کے لیے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے روانہ ہو گیا تھا۔ وہ کبھی کا پہنچ چکا ہو گا۔ میں نے اسے گھوڑا دوڑا کر لے جانے کو کہا تھا۔ ہم بھی روانہ ہو گئے۔ کانسٹیبل پیدل تھے اس لیے مجھے گھوڑے کی رفتار ان کے مطابق رکھنی تھی۔ مجھے سب سے پہلے چوکی جانا تھا۔

میں اپنے بیٹہ کانسٹیبل کے ساتھ چوکی پہنچا۔ مجھے اطلاع ملی کہ میرے کانسٹیبلوں کی پارٹی معززہ جگہ پہنچ گئی ہے۔ بوردے کا گاؤں چوکی سے ایک میل سے ذرا کم تھا۔ شمس الحق بچہ سے بغل گیر ہو کر ملا اور بڑی مسرت سے یہ خوشخبری سنائی۔ آپ کا ملازم حاضر ہے۔

”اور بچہ؟“ میں نے پوچھا۔

”بچے کا تو مجھے کچھ پتہ نہیں“ اُس نے جواب دیا۔ ”میں نے بوردے کے گھر تلاشی نہیں لی۔ آپ نے پیغام بھیجا تھا کہ اسے گھر لو۔ میں نے اس کے گاؤں کانسٹیبل بھیج کر اسے بلالیا اور یہاں پابند کر لیا۔“

میں نے گھوڑا سوار کانسٹیبل سے پوچھا کہ اس نے کیا پیغام دیا تھا۔ اس نے بتایا تو میں پٹھانیا۔ اس نے میرا پیغام غلط دیا تھا۔ میں نے پیغام میں یہ بھی کہا تھا کہ میں چھاپہ مار چوکی اور پہلے چوکی میں آؤں گا۔ کانسٹیبل نے چھاپے کا نام تمہارے لیا اور کہا کہ میں چوکی تک آ رہا ہوں۔ شمس الحق نے اپنی عقل استعمال کر کے بوردے کو گھر سے بلا کر تھانے بٹھالیا۔ مجھے نقصان یہ نظر آ رہا تھا اگر بچہ بوردے کے قبضے میں ہے تو اس کی غیر حاضری میں اس کا کوئی ساتھی بچے کو غائب کر دے گا۔

بوردے کو تھانے میں آئے نصف گھنٹہ گزر رہا تھا۔ میں نے اسے کمرے میں بلوایا۔ دو تیس سال سے کچھ زیادہ عمر کا خوبصورت جوان تھا۔ میں نے اسے دوستانہ لہجے میں کہا۔

”بوردے! اپنا کسب جاری رکھنا چاہتے ہو تو بچہ میرے حوالے کر دو۔“

کے گھوڑے دکھا کر کہا کہ شہر میں اسے دیکھنے والے کو اہوں کی شہادت کو ان گھوڑ
پکڑ دیا ہے اور اصل ثبوت میری حوالات میں بند ہے۔

گاؤں کے گھگھیا کوئیں نے بلالیا تھا۔ میں اس سے بات کر رہا تھا کہ میری نظر اچا
بودے کی بیویوں پر پڑی۔ ایک بیوی بودے کی طرف دیکھ رہی تھی اور بودا اسے دیکھ رہا
تھا بیوی نے سر سے ہلکا سا اشارہ کیا۔ یہ اشارہ میرے لیے بہت اہم شہادت تھا۔ میں
بودے کو سب سے الگ لے گیا اور اسے کہا۔ ”بچہ دیتے ہو یا نہیں۔ ہاں یا نہ میں جواب دے“
اُس نے ٹال مٹول اور باتوں کی اسادی کا مظاہرہ کیا۔ میں نے کانٹیلوں سے کہا۔
”اسے اور ان دونوں عورتوں کو گرفتار کر لو۔ تینوں کو چوکی لے چلو۔“

بچے کا باپ میرے ساتھ تھا۔ میں چوکی کو چل دیا۔ بودے کے مکان پر پہرے کا
انتظام کر دیا۔ راستے میں میں نے بودے سے کوئی بات نہ کی بچے کا باپ رورہا تھا اور
بار بار کہتا تھا۔ ”ملک صاحب! اس سے پوچھو کہتے پیسے مانگتا ہے میں دے دوں گا۔
یہ بچہ واپس کر دے۔“
میں اسے ہلارہا تھا۔

ہم چوکی پہنچے۔ میرا دل اس خیال سے بوجھل ہو گیا تھا کہ میں نے مجرم کو تو پکڑ لیا
تھا مگر بچہ برآمد نہیں ہوا تھا۔ ڈر یہ تھا کہ بچہ قتل ہو چکا ہو گا۔ شمس الحق کے کمرے میں لائین
جل رہی تھی۔ وہ میرے ساتھ تھا۔ اس کے کمرے میں داخل ہوتے وقت بچے کا باپ میرے
ساتھ چل رہا تھا۔ اُس نے اپنا منہ بڑی زور سے کہا۔ ”میرا منہ!“ اور وہ آگے کو دوڑا۔
دوکان ایک آدمی بیٹھا تھا جس کی گود میں پانچ چھ سال عمر کا ایک بچہ تھا۔ باپ
نے اس بچے کو اٹھا کر گالے لگا لیا اور پانکھوں کی طرح اس کا منہ چومنے لگا۔ میں پریشان ہو گیا۔

اُس نے اعلیٰ کا اظہار کیا۔ میں نے اسے بتایا کہ جس کے جھوٹے میں اس نے
رات گزار دی ہے وہ میری حوالہ۔ میں بند ہے۔ میں نے اس عورت کا نام اسے بتایا اور
یہ بھی بتایا کہ اس کا خاوند میرے سب کے بیان سے چکا ہے۔ میں نے یہ جھوٹ بھی بولا کہ
اس عورت نے سب کچھ اگل دیا۔ چہ اور جس محلے سے بچہ اغوا کیا گیا ہے اس کے تین آدمیوں
نے اسے سر پر چادر ڈالے بچے کے ساتھ جاتے دیکھا ہے مگر بودا گھاگ تھا۔ اس نے
اعتراف نہ کیا۔ اس نے جبکہ ہمارے میں اس کے گھر کی تلاشی لے لوں تو میں سمجھ گیا کہ بچہ
وہاں نہیں ہے۔

مجھے اپنے قاصد اور شمس الحق پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ بنانا یا کھیل گیا تھا۔ اس
گبڑی ہوئی صورت حال میں میں نے بودے کے گھر کی تلاشی کا فیصلہ کیا۔ اُسی وقت اسے
ساتھ لیا اور راستے میں میری جو پارٹی انتظار کر رہی تھی اسے بھی ساتھ لیا اور بودے کے
گھر پہنچا۔

بودے کی بیوی

اس کے ساتھ اس کے گھر میں داخل ہوا تو وہاں دو عورتیں تھیں۔ دونوں اس
کی بیویاں تھیں۔ مکان کچا تھا اور اس کے دو کمرے تھے۔ میں نے بڑی سختی سے تلاشی
لی۔ بچے کا تو کہیں نام و نشان نہ تھا البتہ کاغذوں کے دو گھوڑے مل گئے۔ سلیٹی رنگ کا
چادر مل گئی اور اس چادر کے ساتھ مصنوعی موچیں ملیں۔ یہ بڑی بڑی تھیں۔ اُس
زمانے میں لوگ بڑی بڑی موچوں کو مردانگی کی نشانی سمجھا کرتے تھے۔ بودے کی اپنی موچیں
چھوٹی تھیں۔ اتنی سخت تلاشی سے مجھے بچے کا سراغ نہ ملا تو میں نے بودے کو کاغذوں

یہ معاملہ فلمی کہانیوں والا معلوم ہوتا تھا۔ فلموں میں جو کچھ بھی ہوتا رہے، آخر میں شادی ور ہو جاتی ہے، اور اگر کوئی بچہ گم ہو تو وہ اپنی بغل سے ہی مل جاتا ہے۔

چرور پاتھا اور اڈھک بھی رہا تھا۔ میرے ساتھ بودا اور اُس کی دونوں بیویاں تھیں جو کہ رے میں لالٹین کی روشنی میں اگنی تھیں۔ میں نے بچے سے پکار کر کہے پوچھا۔ ”مٹے اُم کہاں تھے؟“

اس نے بودے کی ایک۔ جوی کی ٹاٹ اشارہ کر کے جواب دیا۔ ”شام کو یہ مجھے اپنے گھر سے اٹھا کر بہت دُور چھوڑ آئی تھی میں ڈرتا رہا اور روتا رہا۔ پھر یہ آدمی (اجنبی) گھوڑے پر آیا اور مجھے اٹھا کر یہاں لے آیا۔“

میں نے بودے اور اس کی بیویوں کو باہر بھیج دیا۔ تینوں اب حراست میں تھے میں نے وہیں مغل جانی میرے کنبے پر شمس اُمتی نے بچے کے لیے دودھ منگوایا جو بچہ پی کر اپنے باپ کی گرد میں سو گیا۔ میں نے اس اجنبی آدمی سے کہا کہ وہ پورا بیان دے کہ اسے کچھ کس طرح اور کہاں سے ملا ہے۔ اُس نے بتایا کہ شام گری ہو جانے کے بعد وہ کسی گاؤں سے اپنے گاؤں کو گھوڑی پر جہاز رہا تھا۔ بودے کے گاؤں سے پانچ چھ فزلانگ دُور کھٹانوں کا ویران اور ڈراؤنا سا علاقہ ہے۔ یہ آدمی اس علاقے کے قریب سے گزر رہا تھا۔ اندھیرا گرا تھا۔ اسے کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ سوار ڈر گیا۔ وہ اسے کسی بدروح اور شہر شار کی آواز سمجھ رہا تھا۔ اُس نے کسی آیت کا ورد شروع کر دیا اور وہاں سے جلدی بکل جانے کی سوچی۔ بچے نے روتے ہوئے کہا۔ ”امی جان۔۔۔۔۔ اتی۔۔۔۔۔ آؤ۔۔۔۔۔ اور ایسی ہی کچھ آوازیں تھیں جن سے گھوڑ سوار کو ٹسک ہوا کہ یہ انسان کا بچہ ہے۔ وہ چونکہ خود بچوں والا تھا اس لیے اس کے دل میں رحم پیدا ہو گیا۔ بچے کی خوش نصیبی تھی کہ یہ شخص مسلمان تھا اس

لیے اس میں دلیری تھی۔ اگر ہندو ہوتا تو اس ویرانے میں بچے کے رونے کی آواز پر سر پٹ بھاگ اُٹھتا یا خوف کے مارے بے ہوش ہو جاتا۔ اس گھوڑ سوار نے ڈراؤگ کر دیکھ لینا مناسب سمجھا۔

بچہ روتے روتے قریب آگیا۔ سوار نے پوچھا۔ کون ہے تُو؟ بچے نے ڈر کر چرخ بازی۔ سوار گھوڑے سے اُترا۔ اس کے پاس لمبا سا چاقو تھا جسے کھول کر وہ کہے گیا۔ بچہ اس کے قریب آگیا۔ اس آدمی نے ڈرتے ڈرتے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور اسے یہاں کون لایا ہے۔ بچے نے اُسے بتایا کہ پہلے ایک آدمی اسے شہر سے اپنے گھر ایک گاؤں میں لے آیا تھا۔ وہاں اسے چھپائے رکھا۔ اسے ڈرتا رہا۔ آج شام کے بعد اس کے گھر کی ایک عورت اسے یہاں چھوڑ کر چلی گئی ہے۔

یہ آدمی عقل اور دل گڑے والا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے بچے کو گھوڑے پر بٹھایا اور پولیس چوکی لے آیا۔ پولیس چوکی تک وہ ڈرتا رہا کہ بچہ ابھی غائب ہو جائے گا یا کسی جانور کا روپ دھار لے گا۔ وہ خدا کے کلام کا ورد کرتا رہا۔ چوکی میں آکر اسے پتہ چلا کہ اُس نے کتنی بڑی نیکی کی ہے اور خدا نے اسے فرشتے کی طرح اس ویرانے میں بھیجا تھا اگر وہ ادھر سے نکلتا تو بچہ خوف سے ہی مرجاتا یا بھڑیلوں کا شکار ہو جاتا جن کی وہاں کمی نہیں تھی۔

میں نے بودے کی اس بیوی کو بلایا جس کے تعلق بچے نے کہا کہ یہ اُسے اس ویرانے میں چھوڑ آئی تھی۔ اسے میں نے بڑے تحمل سے کہا کہ اس کے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ بچے کے انوکھا ثبوت بودے کے خلاف شہرے مل گیا ہے۔ اب بہتر یہ ہے کہ اپنی زبان سے بیان دے دو۔ وہ کسی غریب باپ کی خوبصورت بیٹی تھی جسے بودے نے دھونس اور تھوڑی سی رقم کے عوض حاصل کیا تھا۔ ابھی وہ جوانی کی عمر میں تھی۔ سیڑھی سادی بھی نہیں تھی۔ اُس نے مجھے

پکڑ دینے کی کوشش کی۔ میں نے اُسے بتایا کہ بچہ اُسے شناخت کر چکا ہے۔ میں نے اسے
 بڑی ہی گندی دھکی دی اور یہ بھی کہا کہ میں اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے وہیں پھینک دوں
 گا جہاں وہ بچے کو چھوڑ آئی تھی۔ صبح کو گھر پہنچے اور گھیر ڈال کر اس کی ہڈیاں بھی کھا چکے ہوں
 گے۔ میں نے کہا۔۔۔ میں تمہیں اللہ کی قسم میں پیش نہیں کروں گا تاکہ تمہیں کوئی دلیل چھڑا
 سکے۔ میں تمہیں یہ سزا دوں گا جو تباہی کا ہوں۔ مجھے پوچھنے والا کوئی نہیں۔“

کانڈ کے گھوڑوں کے سوار

پولیس کا رعب کام کر گیا۔ وہ بولنے پر آمادہ ہو گئی۔ میرے لیے یہ بہت بڑی کامیابی
 تھی کہ میں نے ایک دن اور رات میں بچہ برآمد کر لیا تھا اور یہ ایسی واردات تھی جس کی
 تفتیش کا مجھے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ میں دراصل کانڈوں کے گھوڑے پر سوار تھا، کانڈوں
 کے گھوڑے بھی مجھے منزل پر لے گئے۔ اس عورت نے پہلے تو اپنی مطلوبیت کی تفصیل سنا لی
 جس سے یہ فائدہ ہوا کہ میں نے اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کر کے اس کے دل پر قبضہ
 کر لیا۔ بار بار کی ہمدردی سے وہ پوری طرح آزادی اور بے تکلفی سے بولنے لگی۔ وہ واقعی غلووم
 تھی۔ اُسے ایک جرائم پیشہ آدمی کے ہاتھ بچا گیا تھا۔

بچے کے متعلق اُس نے بتایا کہ ایک روز پہلے بودا اس بچے کو اپنی گھوڑی پر لایا۔ بچے
 کے ہاتھ میں کانڈوں کے دو گھوڑے تھے۔ بچہ رو رہا تھا اور گھر جانے کی مندرک تھا۔ بودے
 نے بچے کو ہلانے کی بہت کوشش کی مگر بچہ رو رہا تھا۔ بودے نے اسے چاقو دکھا کر اور
 طرح طرح کے طریقوں سے ڈرانا شروع کر دیا۔ اس سے بچہ اور زیادہ چپٹا تھا۔ بودے نے
 اپنی بیویوں کو اتنا ہی بتایا کہ کسی کو اس بچے کا علم نہ ہو۔ یہ تو بیویوں کو معلوم تھا کہ بودے کی

زندگی ایک بھید ہے جسے چھپائے رکھنا بیویوں کا فرض ہے۔ رات کو بچہ سو گیا لیکن صبح
 سویرے جب کہ بچہ پروٹنے لگا۔ ایک بیوی نے بودے سے کہا کہ اسے لاتے ہو تو چلتا کرو۔ اس
 طرح یہ کپڑا دے گا۔

بودا بانہ نکلا لیکن واپس گھر چلا گیا۔ اُس نے بیویوں سے کہا کہ گاؤں میں مشکوک سا
 ایک آدمی موجود ہے۔ یہ دراصل میرا بیجا ہوا مجر تھا۔ سارا گاؤں (جو اتنا بڑا نہیں تھا) بودے
 سے ڈرتا تھا۔ مجھ کو بچے کی کوئی خبر نہیں مل سکی تھی۔ اس کا یہ فائدہ ہوا کہ بودا گھر سے نکل سکا۔ بودا
 سارا دن گھر رہا اور بچے کو ڈراتا رہا۔ اس نے بیویوں سے پوچھا کہ گھر میں افیم ہے؟ بودا چرس
 اور شراب پیتا تھا۔ گھر میں افیم نہیں تھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ گاؤں سے بھی افیم نہ ملی۔ اس
 لیے وہ بچے کو بے ہوش نہ کر سکا۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ جس طرح میں بچے کے اغوا کی تفتیش میں ناتجربہ کار تھا اسی
 طرح بودا بچوں کے اغوا میں انارٹی تھا۔ اس نے اپنی مجرمانہ زندگی میں پہلا بچہ اغوا کیا تھا
 درندہ بچے کو بے ہوش کرنے اور پوری میں ڈال کر لے جانے کا انتظام پہلے سے کر لیا۔ اس
 کی بیوی نے بیان میں کہا کہ شام سے کچھ دیر پہلے بودے نے بتایا کہ گاؤں کے ارد گرد مشکوک
 آدمی نظر آتے ہیں۔ تیس اشخاص کا انتظام تھا جس سے بودا گھر میں قید ہو گیا۔

شام کے بعد شمس اشخاص نے میرا پیغام غلط سن کر یا غلط سمجھ کر بودے کو چوکی بلالیا اور
 مجبوروں کا گھیرا اٹھو ادیا۔ بودا سمجھ گیا کہ معاملہ اٹھ ہو گیا ہے۔ اُس نے اپنی بیویوں سے کہا کہ
 اس کے جانے کے بعد بچے کو اٹھا کر ویرانے میں لے جانا اور اس کی شرنگ چاقو سے کاٹ
 دینا۔ صبح تک درندے لاش کھالیں گے۔ ایک بیوی نے یہ بھیانک کام کرنے سے انکار
 کر دیا۔ دوسری بیوی جو مجھے بیان دے رہی تھی، مان گئی۔ اُس نے چاقو لیا اور بچے کو یہ

کہ کر اٹھا لیا کہ اسے اس کے گھرے جا رہی ہے۔ بچہ خاموشی سے اپنے انجام کی سمت چلا گیا،
 نیکن اُس ویرانے میں جا کر اس عورت کے دل میں وہ ماں جاگ اٹھی جس کا دو سال کی عمر
 کا ایک بچہ مر گیا تھا۔ وہ اپنے خد روت بچے کی شہرگ کاٹنے سے گھر گئی۔ اُس نے بچے کو
 ویرانے کے اندر ایک کھڑے میں چھوڑا اور وہاں سے بھاگ آئی۔ گھرائی تو تھوڑی دیر بعد میں
 وہاں پہنچ گیا اور ان کے راستہ بند ہو گئے۔

بودے کے پنج نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اُس نے اپنی اسادی دکھانے کی
 کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ ان حالت میں اور میرے طریقہ تفتیش کے سامنے اس کی اسادی
 جلد ہی ختم ہو گئی۔ اُس نے طویل بیان دیا جس میں آپ کے مطلب کی کہانی یہ ہے کہ بچوں کا
 اغوا اس کے پیشے میں شامل نہیں تھا۔ کچھ عرصے سے اس کا ایک دوست جو درے کے ایک
 علاقے میں بروہ فروشی اور رہبری کرتا تھا یہ کہہ رہا تھا کہ کسی مہاراجے کو گورے سے چنے کس لڑکے
 کی ضرورت ہے جنہیں وہ ایک خاص ناپن کے لیے تیار کرنا چاہتا ہے۔ اگر بودا ایک دو
 بچے اغوا کر لائے تو اسے دو ہزار روپیہ فی بچہ ملے گا۔ اُس زمانے کا دو ہزار روپیہ آج کے
 بیس ہزار کے برابر تھا۔ بودا اس کام کے لیے تیار ہو گیا۔ دوست نے اُسے کہا تھا کہ وہ جب کبھی
 بچے اغوا کرے اسے اطلاع دے دے۔

بودے کا بیان سنانے سے پہلے میں یہ بتانا موزوں سمجھتا ہوں کہ کسی مہاراجے کو کس
 لڑکوں کی کیا ضرورت تھی۔ آپ نے ہندوستان کی بے شمار ریاستوں کے مہاراجے اور نواب
 ہوں گے۔ یہ انگریزوں کے غلام تھے اور اپنی ریاستوں کے بے حس اور ظالم بادشاہ۔ اُن کی رعایا
 کی فاقہ مستی اور غربت کی رویت اور بڑی دردناک سیہ اور مہاراجوں کی عیاشیوں کی تفصیل بیان کرنا
 ان میں بعض بڑے بڑے مہاراجے جن میں مہاراجہ پٹیل خاص طور پر قابل ذکر ہے، ناپن لگانے

کے شوقین تو تھے ہی جیسے سب تھے لیکن وہ اپنے اعلیٰ قسم کے مہمانوں کے لیے جو رقص
 پیش کرتے تھے وہ غیر معمولی طور پر خوبصورت لڑکے ناپا کرتے تھے۔ اسے BELLY
 DANCE کہتے تھے۔ لڑکے نیم برہنہ ہوتے تھے۔ اس خصوصی رقص میں لڑکا رنگ رشتی
 کا خاص انتظام ہوتا تھا۔ عام دعوتوں میں یہ رقص نہیں دکھایا جاتا تھا۔ یہ غالباً الف لیلیہ کی
 خیالی داستانوں سے اخذ کیا گیا ہے۔ مراکش اور مصر میں اب بھی "بلی ڈانس" ہوتا ہے۔
 ہندوستان کے بعض مہاراجوں نے اسے اپنے ماں راج کیا اور غیر ملکی مہمانوں کا دل بہلاتے
 رہے۔ یہ ناپن لگانے والے لڑکوں کو حرم کی عورتوں کی طرف پردے میں رکھا جاتا تھا۔ دائرہ
 مونچھ نکلنے تک یہ لڑکے مہاراجوں کے قیدی رہتے تھے۔ ان کے لیے خوبصورت بچے حاصل
 کر کے (غیر دیکر یا اغوا کر کے) تیار کیے جاتے تھے۔

خاوند بُزدل تھا، خاموش رہا

بودے کو یہ معلوم نہیں تھا کہ کون سے مہاراجے کو بچوں کی ضرورت ہے۔ اسے صرف
 ضرورت اور اس کی قیمت بتائی گئی تھی۔ اس کا دوستانہ کاغذوں کے گھوڑے بچنے والی جاگ
 لڑکی کے ساتھ تھا۔ اُس نے اس لڑکی کے خاوند اور اس کے چند ایک گھنوں کے قبیلے کو
 اپنے رعب، خوف اور کرم نوازیوں تلے دبا رکھا تھا۔ خاوند اتنا بُزدل تھا کہ سب کچھ جانتے
 اور دیکھتے ہوئے بھی خاموش تھا۔ یہ قبیلے کے رسم و رواج کی پابندیوں کا نتیجہ تھا کہ اسے
 لڑکی کے ساتھ شادی کرنی اور اسی کے ساتھ عمر گزارنی تھی۔ یہ لڑکی پاگل پن کی حد تک دلیر تھی۔
 میں آپ کو اس کی دلیری کی جھلک دکھا چکا ہوں۔ بودے کو معلوم تھا کہ یہ لڑکی شہروں میں
 جا کر کاغذوں کے گھوڑے بیچتی ہے۔ گھوڑے اس کے قبیلے کی عورتیں بناتی تھیں۔

بودے نے اپنے بیان میں کہا کہ اس لڑکی کا تعلق شہر کے بچوں کے ساتھ تھا۔ اس لیے اس نے اس لڑکی سے کہا کہ اسے ایک بڑے ہی خوبصورت بچے کی ضرورت ہے جسے وہ اغوا کر کے بیچے گا اور اسے دو ہزار روپے ملیں گے۔ اس نے لڑکی کے ساتھ وعدہ کیا کہ وہ اسے پانچ سو روپے دے گا۔ لڑکی اور بچوں کے ساتھ تو دل چسپی تھی ہی اس کی اصل دلچسپی بودے کے ساتھ تھی۔ بودے نے اسے بتایا کہ بچے کی عمر پانچ سال سے اوپر ہونی چاہیئے۔

کچھ روز بعد گھوڑے بیچنے والے نے اسے اس بچے کے متعلق بتایا جسے اغوا کیا گیا تھا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ بچہ کاغذوں کے گھوڑوں کا شوقین ہے۔ داروات سے پہلی رات بودا لڑکی کے قبضہ پڑے میں رہا۔ انہوں نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ لڑکی گلی میں گھوڑے بیچنے کی معدا لگائے گی۔ بچہ باہر آجائے گا۔ لڑکی اُسے مفت گھوڑے کا لالچ دے کر پرے لے جائے گی۔ موقع دیکھ کر بودا اسے اپنے ساتھ لے جائے گا۔

بودے نے صبح قصبے میں جا کر اپنی گھڑی کھیتوں میں باندھ دی اور اپنا مندر چادریں ڈھک کر اس گلی کے سرے پر گیا جس میں بچے کا گھر تھا۔ لڑکی گھوڑے اٹھائے آچکی تھی۔ اتفاق سے بچہ کھیلنے کے لیے باہر آگیا۔ لڑکی ذرا ایک طرف بدگئی۔ بچہ آیا تو بودے نے دو گھوڑے جو اُس نے چادریں چھپا رکھے تھے بچے کو دکھائے اور گھوڑے بیچنے والی کو اشارہ کیا کہ وہ چل جائے۔ وہ چل گئی تو بودے نے بچے سے کہا کہ آؤ تمہیں گھوڑے دوں۔ بچہ اُس کے ساتھ چل پڑا۔ دوسری گلی میں مبرا کہ اُس نے ایک گھوڑا بچے کو دے دیا اور کہا کہ آؤ دوسرا گے چل کر دوں گا۔ وہ بچے کے ساتھ پیار بھی کرتا رہا۔

راستے میں بچے نے کہا کہ میں گھر جاؤں گا۔ بودے نے اُسے کہا کہ اس راستے

سے چلتے ہیں، دوسرا گھوڑا بھی گھر لے جانا۔ بچہ اُس کے ساتھ چلا گیا۔ بودا اُسے اپنی گھڑی تک لے گیا اور پیار پیار میں اسے گھوڑی پر بٹھا کر چلتا بنا۔ اس سے آگے اس نے وہی کچھ سنایا جو اس کی بیوی سُنا چکی تھی۔ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ وہ مخبروں کی نظر میں آگیا ہے۔ وہ مخبروں کو پہچانتا تھا۔ اسے توقع تھی کہ مخبروں کے حوالے سے نکل جائے گا لیکن اسے مرق نہ ملا اور میں پہنچ گیا۔ میں رات کو ہی اسے اور اس کی بیویوں کو اپنے تھانے میں لے گیا۔ اس کے بعد مقدمہ قائم کرنے کا مرحلہ تھا۔ میں نے بودے اور اس کی بیوی کے بیان جو بچے کو ویرانے میں چھوڑ آئی تھی، مجسٹریٹ کے پاس ریکارڈ کر وا کر دونوں کو جیل کی حوالات میں بھجوا دیا۔ گھوڑے بیچنے والی کے دو جرم تھے۔ ایک اغوا میں اعانت اور دوسرے اپنے خاوند پر قاتلانہ حملہ۔ اس کا میں نے اپنی حوالات میں رکھنے کا ریمانڈ لے لیا۔ وہ اتنی ڈھیٹ نکلی کہ اس نے اقبالی بیان نہیں لکھوایا۔ اُس کا خاوند بچ گیا تھا۔

مقدمہ مجسٹریٹ سے ہو کر سیشن کورٹ میں چلا گیا جہاں بودا اپنے اقبالی بیان سے منحرف ہو گیا۔ اس کی بیوی یہ جرات نہ کر سکی۔ اُس کی دوسری بیوی کو بری کر دیا گیا۔ اُس کے خلاف کچھ بھی ثابت نہ ہو سکا۔ ایک بیوی کو سات سال سزائے قید دی گئی۔ بودے کو بھی سات سال اور کاغذوں کے گھوڑے بیچنے والی کو تین سال اور پانچ سال کی سزائے قید دی گئی۔

ماں کی خاطر

اس عورت نے میرے لیے بہت
جھوٹ بولے تھے۔ مجری اور
سراغزانی کے لیے بہت ایکنگ
کی تھی۔ اپنے اندھے خاوند کی
بہت خدمت کی تھی، مگر اب
وہ مجرم تھی۔ میں اس کے لیے
جھوٹ بولنے پر تیار ہو گیا۔

دیوار کی کھدائی سے نکلا تھا۔ بیوی نے اٹھالیا اور ٹیگر دبا دیا۔ نالی بیوی کے سینے کی طرف
 متھی۔ معلوم نہیں تھا کہ ریوالور میں گولی ہے۔ گولی نکلی اور بیوی کے سینے سے پار ہو گئی۔ بیوی کو
 جلدی دفن کر دینے کی کوشش کی گئی لیکن بیوی کا باپ جو پولیس کا ریٹائرڈ سب انسپکٹر تھا،
 تھانے چلا گیا اور معاملہ پولیس کے آگے رکھ دیا۔ چونکہ وہ خود مجرم اور تفتیش کے چکر میں بوٹھا
 ہوا تھا اس لیے اُس نے پولیس کی مدد کی اور انکشاف ہوا کہ اس کی بیٹی کے گھر میں کوئی کھدائی
 نہیں ہوئی تھی۔ دیوار کا ایک حصہ بارش اور آندھی سے گرا تھا۔ ریوالور زمین سے یا بلے سے
 برآمد نہیں ہوا تھا بلکہ یہ بلا لائسنس خاوند کے پاس تھا۔ اس سے اس نے بیوی کو قتل کیا اور
 ایک جھوٹی کمانی گھڑ لی۔ اس قتل کے پس منظر میں برادری کے معمولی اور چھوٹے چھوٹے تنازعات
 تھے جو بڑی آسانی سے طے ہو سکتے تھے لیکن برادری میں ایک دو حضرات ایسے تھے (جو ہر برادری
 میں ہوتے ہیں) جو شر پسند تھے۔

یہ حادثہ تو ضمننا یاد آگیا ہے۔ میں آپ کو ایک پرانی واردات سنا تا ہوں۔ اس میں ایک
 آدمی نے پچاس سال کی عمر میں بائیس سال کی کنواری لڑکی کے ساتھ شادی اس مقصد کے لیے
 کی کہ پہلی بیوی سے اولاد نہیں ہوتی تھی۔ یہ بھی ایک گاؤں مناقبہ کی واردات ہے۔ میں یہاں
 کے تھانے کا انچارج تھا۔ منافعاتی دیات بھی میرے تھانے میں آتے تھے۔ ایک صبح رپورٹ
 آئی کہ قصبہ کے ایک گھر میں ایک آدمی رات کو مر گیا ہے۔ اس کی عمر پچاس سال بتائی گئی۔
 رپورٹ دینے والوں نے دو طرح کی اطلاع دی۔ ایک یہ کہ اس کی حرکت قلب بند ہو گئی ہے۔
 دوسری یہ کہ معاملہ مشکوک ہے۔

”مشکوک“ ایسا لفظ ہے جسے کسی بھی تھانیدار کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ میں اسی لفظ
 پر اُن کے ساتھ چل پڑا۔ راتے میں اُن سے معلومات لینا رہا۔ مرنے والا گھر میں اکیلا تھا۔

یہ قتل اور اغوا جیسے سنگین مجرم کی کمانی ہے جو سنانے سے پہلے میں آپ سے
 گزارش کروں گا کہ اسے مجرم اور سر اغوا سنانی کی ایک دلچسپ کمانی سمجھ کر نہ پڑھیں۔ کمانیاں
 تفریح طبع کے لیے پڑھی جاتی اور پھر ذہن سے اتار دی جاتی ہیں۔ میرا مقصد تفریح ممت
 کرنے کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ آپ نے شاید محسوس کیا ہو گا کہ میں آپ کو اپنی تفتیش کے
 وہی کیس سناتا ہوں جو آپ کے مستقل عنوان ”چار دیواری کی دنیا“ کے تحت آتے ہیں۔ میں
 آپ سے توقع رکھتا ہوں کہ آپ گھر محفل اور برادری میں دیکھیں کہ ایسے کردار اور ایسا ہی
 کوئی ڈرامہ وہاں بھی نہ ہو۔ اور جتنے روکا نہ گیا تو بہت بڑا حادثہ ہو گا، مگر میں دیکھ رہا ہوں
 (اور آپ بھی دیکھ رہے ہیں) کہ ان خرابیوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا جس کے نتیجے میں
 حادثے ہوتے رہتے ہیں۔ انہیں اخباروں والے اخباروں میں شائع کرتے اور لوگ انہیں
 دلچسپ خبریں سمجھ کر پڑھتے اور لطف اٹھاتے ہیں اور جب اگلی دلچسپ ”خبر آتی ہے تو پچھلی
 کو بھول جاتے ہیں۔

یہ کہتے کہتے مجھے یاد آیا ہے کہ تین ساڑھے تین سال گزرے پاکستان کے ایک گاؤں نما
 قصبہ میں ایک جوان بیوی ریوالور کی گولی سے ماری گئی۔ خاوند نے بیان دیا کہ یہ ریوالور ایک

صحن میں سویا ہوا تھا۔ آدھی رات سے ذرا پہلے بیوی گھرائی تو اُس نے دیکھا کہ وہ مرا ہوا ہے۔ بیوی نے دایلا ہلکا تو ملے والے گھونڈے ایک آواز آئی کہ سوتے میں مارٹ خیل ہو گیا ہے۔ کچھ دیر بعد مرنے والے کمرے رشتہ دار آگئے۔ ان میں اُس کا ایک بھائی تھا۔ اُس نے ہنگامہ مٹا کر دیا۔ اُس نے سب کو ناکارہ کر کے لاش جہاز پہنچا دی۔ وہیں پڑی رہے۔ اسے قتل کیا گیا ہے۔

اگر یہ لوگ اُس وقت تھما مٹے جاتے تو میں اگر دیکھ لیتا کہ لاش کس حالت میں پڑی تھی۔ لاش کی پوزیشن سے معلوم کیا جاتا تھا کہ مرنے والا سکون سے سوتے میں مر گیا ہے یا مرنے سے پہلے تڑپتا رہا ہے یا اسے قتل کیا گیا ہے۔ قتل کر کے لاش چارپائی پر پھینکی گئی ہے۔ اب کچھ اندیشے ہیں۔ مرنے کی تلاش کرنی تھی۔ میں نے جب رپورٹ دینے والوں میں اختلاف دیکھا تو کچھ یقین ہو گیا کہ کچھ گورنر ورثے میں نے سب سے پہلے تو بہن میں یہ جھٹایا کہ کون کیا کرتا ہے۔ سب کچھ جی بول رہے تھے۔ میں نے انہیں روکنا نہیں۔ کسی سے کوئی سوال نہ پوچھا تاکہ کوئی چرکس اور پکڑتا نہ ہو جائے۔ انہیں بولنے کا موقع دیا اور میں ہر ایک پر اور الفاظ ذہن میں دھنسا رہا۔ رات کو تھما مٹے رپورٹ نہ کرنے کی وجہ یہی تھی کہ یہ لوگ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے تھے۔

وہ تڑپ تڑپ کر مرا

میں نے لاش دیکھی۔ چارپائی پر برآمدے میں پڑی تھی۔ موت اسی چارپائی پر واقع ہوئی تھی۔ اُس وقت اپنی رات کے وقت چارپائی صحن میں تھی۔ خاوند کو مردہ حالت میں سب سے پہلے اُس کی بیوی نے دیکھا تھا۔ میں نے سب کو وہاں سے ہٹا کر لاش کا چہرہ، بازو، ہاتھ اور پاؤں دیکھے۔ ناخن دیکھے اور میں نے مان لیا کہ حرکت قلاب بند ہونے کا کیس نہیں۔ لاش کے ہونٹ اور ناخن نیلے ہو گئے تھے۔ ہاتھوں اور پاؤں پر بھی نیلا بٹ تھی۔ ہونٹوں سے تھوڑی سی

جھاگ بھی نکلی تھی۔ یہ سانس روک کر مارنے کی نشانیاں تھیں۔ لاش کی گردن دیکھی۔ انگلیوں یا رستی وغیرہ کا کوئی نشان نہیں تھا۔ گلا نہیں کھوٹا گیا تھا۔ قمیض ہٹا کر پیٹ دیکھا۔ وہاں بھی کوئی نشان نہیں تھا۔ بعض اوقات تکہ کے مقام پر زور سے گھونسا یا لاشی گھنے سے انسان مر جاتا ہے۔ وہاں بھی ضرب کا یا جے ہوئے خون کا کوئی نشان نہ تھا۔

میں نے سب سے پہلے بیوی سے پوچھ گچھ کی۔ اُس نے بتایا کہ وہ شام کھانے کے بعد ایک شادی والے گھر چلی گئی تھی۔ تیل وغیرہ جیسی کوئی رسم تھی۔ وہ آدھی رات سے ذرا پہلے گھرائی۔ اس کی چارپائی خاوند کی چارپائی کے ساتھ تھی۔

اُس نے باہر والا دروازہ کھلا دیکھا۔ دروازہ اندر سے بند ہونا چاہیے تھا۔ بیوی کو دروازہ کھٹکنا تھا اور خاوند نے اٹھ کر دروازہ کھولنا تھا، مگر دروازہ کھلا ہوا تھا جس سے بیوی کچھ حیران ہوئی۔ اُسے کوئی شک نہ ہوا۔ اُس نے سوچا کہ خاوند دروازہ بند کرنا بھول گیا ہو گا۔ اندر آ کر اُس نے خاوند کو بلایا۔ بلایا، وہ نہ جا گا۔ اُس نے خاوند کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو ہاتھ غیر معمولی طور پر ٹھنڈا تھا۔ بیوی نے جی جھکا کر دیکھا تو اُسے پتہ چلا کہ وہ تو مر چکا ہے۔

”لاش کس حالت میں پڑی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

اُس نے بتایا کہ ایک ٹانگ دُبی تھی۔ دوسری چارپائی سے نیچے لٹک رہی تھی۔ ایک ہاتھ پیٹ پر اور دوسرا کچے پر تھا۔ میں نے اور زیادہ گہرائی اور باریکی میں جانے کے لیے بہت سے سوال کیے۔ ان سے یہ انکشاف ہوا کہ کمبے کے نیچے نہیں بلکہ مرنے والے کے منہ پر پڑا تھا، اور یہ کمبے بیوی کے بستر کا تھا۔ خاوند کا کمبہ اس کے سر کے نیچے تھا۔ اُس نے چادر اوپر سے رکھی تھی جو لاش پر پوری نہیں تھی۔ آدھی پیٹ سے گھٹنوں تک اور باقی چارپائی سے نیچے تھی۔ میرے پوچھنے پر بیوی نے بتایا کہ خاوند کے نیچے جو چادر بھی ہوئی تھی وہ کئی بجوں سے

”اولاد نہیں ہوئی۔“

نوجوان بیوی، پراسرار کردار

اس عورت کی عمر پینتالیس اور چھاس کے درمیان تھی اور اس کے خاوند کی عمر پچاس سال سے ایک آدھ سال اوپر یا کم۔ اس عورت نے یہ نیا انکشاف کیا کہ صرف ایک مہینہ پہلے اُس کے خاوند نے بائیس سال کی عمر کی ایک لڑکی کے ساتھ شادی کی ہے۔

اس انکشاف نے مجھے چونکا دیا۔

میں نے لاش پوٹھارٹم کے لیے سمجھانے کا انتظام کر لیا۔ اس عورت کو جسے اب میں پہلی بیوی کہوں گا کمرے میں بٹھائے رکھا، میں جب اپنے غم کو پوٹھارٹم کے لیے لاش سے جانے کے لیے کہہ چکا تو پہلی بیوی نے کہا۔ ”یہ بھی ایک وجہ تھی کہ میں اس پر زور دے۔ نبی تھی کہ اس کا ہارٹ فیل ہو گیا ہے۔ اس کا خاوند کا، جہاں شور مچا رہا تھا کہ وہ لاش تھانے لے جائے گا تو میں نے ات کہنا تھا کہ پولیس لاش کو ہسپتال میں دے گی اور ڈاکٹر اسے چیر بھانڈ دیں گے۔ میں نے خاوند کو زندگی میں کبھی آپش نہیں آنے دی تھی۔ نے کہ بعد اسے نہ چیرو۔ میرا دل پھٹ جانے لگا۔“ یہ کہہ کر وہ ایسی بلبلا کر رونے لگی کہ اُسے منہ باننا مشکل ہو گیا اور اُس وقت تو میرے لیے اور زیادہ مشکل پیدا ہو گئی جب اس کے خاوند کی لاش پوسٹ ڈم کے لیے گھر سے نکالی گئی۔ میں اگر دوڑ کر اس عورت کو دبوچ نہ لیتا اور دو عورتیں اس کے آگے نہ آ جاتیں تو وہ چار پائی سے خاوند کی لاش کو گھسیٹ لیتی، اور اگر میں اسے یہ بتا دیتا کہ اس کے خاوند کا دل اور پھیپھڑے یا پھیپھڑوں کا کچھ حصہ کاٹ کر ضلع کے ہسپتال میں ماہرین کے پاس بھیجا جائے گا اور خاوند کے جسم کے یہ دونوں حصے اُسے نہیں ملیں گے تو وہ

اکٹھی ہو گئی تھی۔ یہ تمام نشانیاں بتا رہی تھیں کہ مرنے والا مرنے سے پہلے تڑپتا رہا ہے۔ دل کی حرکت بند ہونے سے جسم تڑپتا نہیں۔ انسان سکون سے مر جاتا ہے۔ تکیہ منہ پر تھا۔ یہ ایک واضح ثبوت تھا کہ یہ شخص چوت سو یا تھوڑا سا اسے سوتے میں پہلو سے چپٹ کیا گیا اور ساتھ والی چار پائی سے تکیہ اٹھ کر اس کے منہ پر رکھا گیا اور اوپر سے دبا لیا گیا۔ ناک اور منہ بند ہو جانے سے سانس رُک گیا اور موت واقع ہوئی۔

یہ بلاشبک و شبہ قتل کی دو رات تھی۔

”تم نے کہا تھا اس کا ہارٹ فیل ہو گیا ہے۔“ میں نے اُس کی بیوی سے کہا۔ ”کیا اسے دل کی کوئی تکلیف تھی؟ کبھی دل کا دورہ پڑا تھا؟“

”کبھی نہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔

”چھوڑ تمہارے ذہن میں یہ خیال کیوں آیا کہ اس کا ہارٹ فیل ہو گیا ہے؟“

”اس کے علاوہ اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔“ اُس نے جواب دیا۔

”کیا تمہارا خاوند منہ پر تکیہ رکھنے کا عادی تھا؟“ میں نے کہا۔ ”بعض لوگ سوتے وقت تکیہ نیچے سے نکال کر ماتھے اور سر پر رکھ لیا کرتے ہیں۔“

”اُس نے ایسا کبھی نہیں کیا تھا۔“

”گھر میں اور کوئی نہیں تھا؟“

”کوئی بھی نہیں۔“

”بچے کہاں ہیں؟“

”بچے ہیں ہی نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیوں؟“

تیرا نہ بچن لیتی۔

”تو کیا میں یہ سمجھوں کہ خاوند کے قتل میں اس عورت کا ہاتھ نہیں ہے؟۔ یہ سوال مجھے پریشان کرنے لگا۔ اس کے ساتھ چارے، شرے کا وہی کردار سامنے آگیا جو قتل اور خودکشی کا باعث بننا چلا آیا ہے۔ اور بتا چلا ہوا ہے۔ یہ ہے بوڑھا خاوند نوجوان بیوی۔ اور جب نوجوان بیوی بوڑھی بیوی کی سون بن کر رہتی ہے۔ تو اسرار و راتوں کے لیے زمین ہموار ہو جاتی ہے۔ ان خاوندوں کی قتل پر حیرت ہوتی ہے۔ یہ دیکھنے بغیر کہہ نہ اے انہیں اولاد پیدا کرنے کا باعث بننا کیا ہے یا نہیں دوسری شادی کرنا ہے۔

اور پھر بڑھاپے میں اگر دوسری شادی کرنا بہت بڑی حماقت ہے۔ پہلی بیوی کا دل توڑنا اور دوسری بیوی کی انگلیں تباہ کر دینا ایک ایسا گناہ ہے جو قدرت معاف نہیں کیا کرتی۔ خاوند اپنے لیے اذیت پیدا کر لیتا ہے، یا مارا جاتا ہے، جیسا اس واردات میں مجھے نظر آ رہا تھا۔ مجھے اب یہ معلوم کرنا تھا کہ خاوند کو قتل پہلی بیوی نے کروایا ہے یا دوسری نے۔ یہ امکان بھی تھا کہ دوسری بیوی کے کسی امیدوار نے یہ واردات کی ہو۔

پہلی بیوی کی جذباتی کیفیت اور اس کا یہ کہنا کہ وہ خاوند کی لاش کو چیر بھاڑ سے بچانا چاہتی تھی مجھے قائل کرنے کے لیے کافی نہیں تھا کہ قتل کرنے یا کرانے میں اس کا ہاتھ نہیں۔ میں نے اس سے دوسری بیوی کے متعلق پوچھا کہ کہاں ہے۔ اس نے بتایا کہ دو روز سے نیچے گئی ہوئی ہے۔ اس کا میکہ اسی تھبہ کا ہی ایک حصہ تھا جسے ایک برساتی نالے نے الگ کر رکھا تھا۔

”کیا وہ اس شادی پر خوش ہے یا بخیریدہ ہے؟“

”چُپ چُپ رہتی ہے۔“ پہلی بیوی نے جواب دیا۔ ”دو روز یہاں رہتی ہے دو

روز ماں باپ کے گھر گزارتی ہے۔“

”شوخی کرنے والی ہے؟۔ میں نے پوچھا۔“ ”یہ سیدھی سادی سی لڑکی ہے؟“

”ایسی شوخ بھی نہیں اور میں اسے سیدھی سادی بھی نہیں کہہ سکتی۔“

”اسے خاوند کی موت کی اطلاع مل چکی ہوگی؟۔ میں نے کہا۔“ وہ انکسی ہوگی؟“

”اس کے ماں باپ اور دوسرے رشتہ دار شمع سویرے آگئے تھے۔“ پہلی بیوی نے جواب

دیا۔ ”وہ نہیں آئی۔ میں نے رات کو ہی اطلاع بھجوا دی تھی۔“

میں بہت حیران ہوا کہ خاوند کی موت کی اطلاع پر نہیں آئی۔ میں نے پہلی بیوی سے

کہا کہ اندر جا کر دیکھئے۔ وہ مندر آئی ہوگی۔ اس نے واپس آکر بتایا کہ وہ نہیں آئی۔ میرا شک

پختہ ہونے لگا۔ میں نے پہلی بیوی کو باہر بھیج کر دوسری بیوی کے باپ کو بلایا۔ اس سے

پوچھا کہ اس کی بیٹی کیوں نہیں آئی؟ اس کے چہرے پر جو رنگ آئے اور گئے اور جس طرح

وہ سر سے پاؤں تک کانپنے لگا وہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ وہ صرف بے ہوش

نہیں ہوا، باقی کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔ طرح طرح کی باتیں کر کے میں نے اسے سنبھال دیا۔ کچھ

دیر بعد اس نے بتایا کہ اس کی بیٹی گزشتہ رات سے لاپتہ ہے۔ وہ اسے ادھر ادھر کیٹھنے رہے۔

بے عورتی کے ڈر سے وہ ابھی پولیس کو اطلاع نہیں دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنی بیٹی

کے خاوند کو بھی اطلاع نہ دی۔ اس گھر میں اگر دیکھا بھی نہیں۔ انہیں یقین تھا کہ وہ اپنے

خاوند کے گھر نہیں گئی۔

میرے ذہن میں بات واضح ہو گئی۔ یہ نوجوان لڑکی اپنی عمر سے وگنی سے بھی زیادہ

عمر کے آدمی کے ساتھ شادی پر خوش نہیں تھی۔ اس پر یہ زیادتی بھی ہوئی تھی کہ اسے سون بنا یا

گیا تھا۔ پہلی بیوی کو بھی اس کے خاوند کے ساتھ رہنا تھا۔ یہ بات نئی بیوی کے لیے اور

سگرٹ کا کٹا

میں نے اس لڑکی (دوسری بیوی) کی ماں کو بلا لیا۔ باپ کو باہر بھیج دیا۔ کوئی باپ اپنی بیٹی کے چال چلن کو برا نہیں کتا۔ بعض باپ اپنی بیٹیوں کی ذاتی سرگرمیوں اور میل ملاپ سے واقف بھی نہیں ہوتے۔ مائیں بیٹیوں کی راز دان ہوتی ہیں۔ میں نے ماں سے پوچھا کہ اس کی سہیلیوں میں سے کون اُس کی بہت گہری سہیلیاں تھیں جن کے گھروں میں وہ بہت زیادہ جاتی تھی۔ ماں نے ایک تو یہ بتائی جس کے گھر وہ کہ گئی تھی کہ جابا ہی ہوں۔ اس کے علاوہ ایک اور تھی۔

میں نے پوچھا کہ ان میں سے کسی کے یا دونوں کے جوان بھائی ہیں؟ اُس نے بتایا کہ ایک سہیلی کے دو بھائی جوان ہیں۔ ایک شادی شدہ ہے اور دوسرا غیر شادی شدہ دوسری کے بھائی چھوٹے ہیں۔

”تم جب رات اس سہیلی کے گھر اپنی بیٹی کے متعلق پوچھ گئی تو اس کے دونوں بھائی گھر میں موجود تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”دونوں موجود تھے۔“ اُس نے جواب دیا۔

”اگر تم چاہتی ہو کہ تمہاری بیٹی تمہیں واپس مل جائے تو مجھے وہ سب کچھ بتا دو جو تمہارے دل میں ہے۔“ میں نے اسے کہا۔ ”وہ کسے پسند کرتی تھی؟“

”میں کچھ بھی نہیں جانتی۔“ اُس نے بڑے ہی اُداس لہجے میں جواب دیا۔ ”کبھی ایسا شک بھی نہیں ہوا تھا کہ اُس کی کسی کے ساتھ خفیہ ملاقات ہے۔ وہ ایسی تھی جی نہیں۔“ اس کے ساتھ یہ زیادتی تم نے کی ہے یا تمہارے خاوند نے کہ اُسے سو کن بنا کر اُس کے

زیادہ مانگو اور ہو سکتی تھی کہ اسے بچتے پیدا کرنے کا فرض سونپا گیا تھا۔ اُس نے یقیناً کسی اور کو دل میں ٹھان لیا تھا جو کا جس کے۔ اور وہ بھاگ گئی ہوگی۔ سبب میں اپنے ذہن سے اس سوال کا جواب حاصل نہ کر سکا کہ خاوند کو قتل کرنے کی کیا مدت تھی؟

یہ لڑکی اپنے ماں باپ کے گھر میں تھی۔ مگر خاوند کے گھر سے بھاگتی تو قتل کی وجہ یہ بن سکتی تھی کہ خاوند نے مزاحمت کی اور لڑکی کے دوست نے اُسے قتل کر دیا مگر خاوند کا قتل تو کسی اور نوعیت کا تھا۔ میرے خیال سے واقعاتی شواہد کے مطابق اس کے منہ پر تکیہ رکھ کر اُسے قتل کیا گیا تھا۔ لہذا یہ وجہ ہو سکتی تھی کہ لڑکی جس کے ساتھ بھاگی ہے اُس نے سوچا ہو گا کہ شادی شدہ لڑکی کا ساتھ خاوند کی زندگی میں شادی بائز نہیں ہوگی۔ طلاق تو لی نہیں جا سکتی تھی۔ اس نے قتل کا دوسری سمجھا لیا۔

مجھے پہلی یہ دلیل خاصی کمزور لگی۔ ناجائز سوال یہ ہے ذہن میں ٹھہرنے والا کہ لڑکی اپنے گھر سے بھاگتی تو خاوند کو اُس کے گھر میں قتل نہ کر لے گی اور نہ ہی ستا جائے ایک سوال یہ بھی سامنے آیا کہ لڑکی کو قتل کیا گیا ہے اور خاوند کو قتل کیا گیا ہے؟ اس صورت میں لڑکی کے شہ کے ”میدان“ ایک یا ایک سے زیادہ ہوں گے۔ ہر ممکنہ کی ان میں سے ہو سکتا تھا میں نے اس کے باپ سے پوچھا کہ وہ گھر سے زیادہ اتنے دن گئے ہیں کہ لڑکی باپ نے قسمیں کھا کر کہا کہ لڑکی لاپتہ نہیں تھی۔ وہ کچھ بھی نے کہیں گئی تھی۔ شام کا آگے کے بعد اُس نے ایک سہیلی کے ساتھ گھر جا رہی ہے۔ سہیلی کا گھر باؤنی تہ بابا کی طرف ہے اور لڑکی بھی بہت دیر سے وہاں تو آئی ہے۔ یہ سہیلی کا گھر خاوند کے گھر کے ایک کمرے میں ہے۔ لڑکی کو وہاں بھی لے گیا۔ وہ وہاں بھی نہیں گئی۔

باپ کی ٹمکے آدمی کے حوالے کر دیا؟

”ہم نے سوچا تھا کہ وہ امیر کبیر آدمی ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”آنا بڑا مکان سیہ۔
جین کسپی رہے گی۔ اولاد ہونے کی صورت میں وہ گھر کی مکمل بن سکتی تھی۔“

”مگر وہ کسی اور سے لکھ کر مکمل بنا پاتا جی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے وہ آدمی بتاؤ؟“
اُس نے اس سوال کا جواب دینے کی بجائے پوچھا۔ ”آپ کا کیا خیال ہے کہ قتل میں
میری بیٹی کا بھی نام آتا ہے؟“

”غور ہی نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اس کے دل سے خوف نکالنے کے لیے کہا۔“ تمہاری
بیٹی اپنے گھر سے گئی۔ یہ۔ خداوند کو قتل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے ڈر ہے کہ تمہاری
بیٹی کو کوئی اغوا کر لے گیا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ اُس کے رشتے کے لیے تم لوگوں نے آنے والوں کو
جواب دیا ہوگا۔ اُن میں کوئی اتنا دلیر ہے جس نے یہ انتقامی کارروائی کی ہو؟

اُس نے ذہن پر زور دے کر جواب دیا۔ ”اُن میں سے کوئی ایک بھی اتنا دلیر نہیں۔“
اس سے چند اور باتیں پوچھیں اور اسے فارغ کر دیا۔ یہ ابتدائی کارروائی تھی۔ مجھے یہ
دیکھنا تھا کہ اس ڈرامے میں کون کیا ہے۔ میں صحن میں گیا اور مکان کا جائزہ لیا۔ قاتل باہر سے آیا
ہوگا۔ پہلی بیوی نے کہا تھا کہ وہ شادی والے گھر چلی گئی تھی۔ گھر کا دروازہ اندر سے بند ہونا چاہیے
تھا۔ میں نے کہا تھا۔ میں نے فرض کیا کہ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس صورت میں قاتل کس طرف
سے اندر آسکتا تھا؟ کوئی نظر جانے سے پہلے میری نظر صحن کی دیوار پر پڑی۔ اُس طرف باہر
کشادہ گلی تھی۔ دیوار پر اندر کی طرف سے سفیدی کی گئی تھی۔ دیوار پر مجھے ایک صاف نشان نظر
آیا۔ یہ ننگے پاؤں کی انگلیوں کی رگڑ ہو سکتی تھی اور یہ میرا وہم بھی ہو سکتا تھا۔ مجھے اب وہم اور
انسانے میں سے حقیقت کا نام لینی تھی۔ یہ نشان غور سے دیکھا۔ تازہ معلوم ہوتا تھا۔ دیوار کی بلندی

سات فٹ کے لگ بھگ تھی۔ اوپر سے گولا گئی میں نہیں بلکہ چپٹی تھی۔

میزنگلو کر میں اس پر کھڑا ہو گیا۔ اوپر کر دکھائی تھی۔ ایک جگہ سے گرد و صاف تھی۔
اس کے دائیں بائیں ایسے نشان بڑے صاف تھے جسے باہر سے کوئی اوپر آیا اور وہاں اُس نے
ہاتھ رکھے۔ دیوار پر جا کر میں باہر کو کوڑا گیا۔ اُدھر بھی کچھ غصہ پرانی سفیدی تھی اور وہاں اوپر چڑھنے
کے صاف نشان تھے۔ باہر ایک جگہ ہاتھ ڈالنے کی ذرا سی جگہ تھی۔ پاؤں کی رگڑ کے نشان واضح
تھے۔ پاؤں ننگے معلوم ہوتے تھے۔ گلی کچی تھی۔ دیوار کے ساتھ ننگے پاؤں کے نشان تھے اور
جوڑوں کے بھی۔

ایک نشان تو بہت ہی واضح تھا۔ دیوار کے ساتھ پاؤں کے نشانات کے قریب مجھے
ہوئے سگریٹ کا ٹکڑا پڑا تھا جس کے جلنے ہوئے سرے کو رگڑ کر بھجایا گیا تھا۔ دیوار پر سیاہ نشان
تھا جس کے متعلق کوئی شک نہیں تھا کہ یہاں سگریٹ بھجایا گیا ہے۔ میں اور ہر تھانہ پر مجھروں
کی عادات اور نفسیات سے واقف تھا۔ میں نے سگریٹ کا ٹکڑا اٹھا کر منو لگھا۔ اس میں چرس ملی ہوئی
تھی۔ اپنے ہیڈ کائٹیل کو دیا۔ اُس نے بھی منو لگھ کر کہا کہ چرس ہے۔

چرس ثابت کرتی تھی کہ اگر یہی آدمی دیوار پھلانگ کر اندر گیا اور قتل کی واردات کی ہے
تو یہ کوئی عادی مجرم ہے۔ ان کل تو پتہ چلا ہے کہ کاجوں کے لڑکے اور لڑکیاں بھی چرس پیتی ہیں۔
اُس زمانے میں چرس صرف جرائم پیشہ لوگ یا ملنگ وغیرہ یعنی بہت ہی گھٹیا درجے کے لوگ پیتے
تھے۔ یہ سوچا ہی نہیں جا سکتا تھا کہ یہاں دیوار کے ساتھ اچھے خاندانوں کے لڑکے بیٹے کر چرس
پیتے رہے ہوں۔ میں نے سگریٹ اپنے پاس رکھ لیا۔

مجھے یہ یقین ہو گیا کہ قاتل کراسے کا ہے اور پیشہ ور ہے۔ سات فٹ کی دیوار پھلانگنا بھی
پیشہ ور کا کام تھا۔ اُس نے اندر جا کر متول کے منہ پر تکیہ رکھا اور اسے مار کر دروازہ اندر سے کھولا

اور باہر نکل گیا۔ پہلی بیوی نے کہا تھا کہ دروازہ اندر سے بند ہونا چاہیے تھا لیکن کھلا ہوا تھا۔ یہ قاتل نے کھولا تھا۔ وہ جوتے پہننے کے لیے پھر دیوار کے اُس طرف گیا ہوگا جہاں سے اُوپر چڑھا تھا۔ جُرم، خصوصاً ڈاکے اور قتل جیسے بڑے جُرم سے پہلے اکثر جُرم جس یا شراب پیتے ہیں۔ اس جُرم نے جس کے کش لگائے اور گڈیٹ دیوار کے ساتھ، بچھا کر اُوپر چلا گیا۔ دیوار کے اُوپر چڑھ کر اندر آہستہ آہستہ اُتر گیا۔

اغویا فرار

اگر قاتل کرانے کا تھا تو یہ انتظام پہلی بیوی نے کیا ہوگا۔ یہ شک اس لیے ہوا کہ وہ پرانی عمر کی عورت تھی۔ تجربہ کار اور ہوشیار تھی۔ نئی عمر کی لڑکی کے لیے یہ کام آسان نہیں تھا یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ لڑکی کا گھرانہ متوسط درجے سے ذرا کم ہی تھا۔ مقتول کا معیار اُونچا تھا۔ اس کے مقابلے میں لڑکی کا خاندان غریب تھا۔ لڑکی کے متعلق ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ جہاں جلہن کی کسی تھی۔ یہ راستے میں نے ضرور قافم کرنی تھی کہ عورت ذات جب انتقامی کارروائی پر اُتر آتی ہے تو کمرسہ میں بند کی ہوئی بلی کی طرح ایسا جوابی حملہ کرتی ہے کہ انسان دنگ رہ جاتا ہے۔

بات ذرا اگھلتی آرہی تھی۔ میں نے اُن دو آدمیوں کو معلوم کر کے الگ کر لیا جو پہلی بیوی کے واویلے پر اس کے گھر میں آئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ اُنہی رات سے ذرا پہلے انہیں پڑوس میں اس عورت کی چڑی و پکار سُنانی دی۔ دونوں ایک دوسرے کے پیچھے آگئے۔ انہوں نے یہ دیکھ کر پہلی بیوی اپنا سینہ پیٹ رہی تھی۔ لاش کے منہ پر کیمہ نہیں متاجو پہلی بیوی نے اُٹھا کر دوسری چار پائی پر رکھ دیا ہوگا۔ لاش کی پوزیشن انہوں نے وہی بتائی جو پہلی بیوی بتا چکی تھی۔ بیوی

نے انہیں بتایا کہ وہ شادی کے گھر سے آئی تو خاندان کو اس حالت میں دیکھا۔

ان آدمیوں نے لاش کو اپنی عقل کے مطابق دیکھا۔ گردن بھی دیکھی۔ جسم بھی دیکھا۔ انہیں کہیں بھی منہ یا زخم نظر نہ آیا۔ بیوی نے کہا کہ اس کا ہارٹ فیل ہو گیا ہوگا۔ انہوں نے کوئی ٹھنک نہ کیا۔ لاش سیدھی کی اور چار پائی اُٹھا کر برآمدے میں کر دی۔ پھر محلے کی عورتیں آگئے گیئیں۔ چند اور مرد آگئے تھے جو عورتوں کو دیکھ کر باہر چلے گئے۔

ان دو آدمیوں میں ایک مجھے خاصا مانا لگا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اس کا تجربہ کیا کرتا ہے۔ یہ حرکت قلب بند ہونے کا کیس ہے یا قاتل کا۔ اُس نے جواب دیا۔ ”میں اس وجہ سے اسے دل کی حرکت بند ہونے کا کیس سمجھا تھا کہ پچاس سال کی عمر میں بائیس سال کی لڑکی کے ساتھ شادی کرنا اور جس بیوی نے تیس سال غلاموں کی طرح ساتھ نبھایا، اُس کے ساتھ شرمندگی کی حالت میں رہنا دل کی حرکت بند کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ مقتول شریف آدمی تھا۔ بد معاش آدمی بہت کچھ برواشت کر لیتے ہیں۔“

چونکہ یہ گھرانے مسلمانوں کے تھے، پردہ تھا، اس لیے مرد عورتوں کے متعلق وہی راستے دیتے تھے جو ان کی عورتیں انہیں بتاتی تھیں۔ ان دونوں نے اپنی عورتوں کی زبانی بتایا کہ دوسری بیوی غریب گھرانے کی ہے، خوبصورت ہے، جالاک نہیں۔ پہلی بیوی زیادہ عمر کی وجہ سے تجربہ کار ہے لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ آنا بڑا جرم کر سکتی ہے۔ وہ اتنی ہوشیار نہیں۔ اپنی قیمت کا رونا روتی ہے کہ اُس کی اولاد نہ ہوئی۔ اُس نے کسی شے کا یہ نکتہ دیکھا کہ اس کے خاوند نے دوسری شادی کر لی تھی۔ یہ بھی سنا گیا ہے کہ اپنے خاوند کو بہ وقت اداس دیکھ کر اس نے اُسے بخوشی دوسری شادی کی اجازت دی تھی۔

ان سے بہت سی معلومات لے کر میں نے اپنی ضرورت کے مطابق آدمی جمع کیے اور انہیں

تھانے چنے کو کہا۔ ان میں پہلی بیوی کے دو بچائی تھے۔ متھول کا ایک بچائی دوسری بیوی کا باپ اور متھول کے یہ دو آدمی تھے جو پہلی بیوی کے شوہر پر پہنچے تھے۔ ان سے تو ادھر ادھر کی حلف وری معلومات یعنی تھیں۔ صحیح اطلاعیں۔ ان کے لیے خبروں کو استعمال کرنا تھا۔ ان میں دو عورتیں تھیں۔ متھول کے تین بچائیں۔ انہوں نے انہوں سے سوچا تو سب سے پہلے دل سے یہ دعا نکلی کہ یہ موت قدرتی نہ تھی۔ اور پوٹھارٹھ پر ان کا ثابت کر دے کہ یہ قتل نہیں، مرنے والے نے خود ہی تکمیل اپنے شوہر پر کر لیا ہو۔ جس سے سترہ میں اس کا سانس روک دیا۔ اس کے بعد میرے مانع میں، یہ خیال آیا کہ پہلی بیوی کے لیے قتل کا یہ جو ایسا ہو سکتا ہے کہ جاسید خاندانہ کے نام پر ہوگی۔ اس عورت کو یہ خوف ہوگا کہ وہ نئی نوپل دامن کے جمال میں آکر جا خیل داس کے نام کر دے گا۔ گمانی دامن کا اغوا یا فرار میرے لیے الجھن پیدا کر رہا تھا اور مجھے اس سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا کہ لڑکی اگر اغوا ہوئی ہے تو کیا قتل اور اغوا ایک دوسرے سے متعلق ہیں یا اغوا یا فرار ممکن اتفاق سے قتل کی رات ہوا ہے؟

انفیتش میں بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ بچہ بچل میں اور دھندل اور اشہر میں والی بات ہوتی ہے اور مجھ جیسے مغز پرے سے تھانیدار سے متھانے کی حد دینی اپنے تمام تر ملاقات کی خاک چھانتے اور ہر شے کے لیے قیامت کھڑی کیے رکھتے ہیں، مگر ایسی خوش نصیبی کہیں کہیں دیکھنے میں آتی ہے۔ میں نے انفیتش کی انسانی شین کی کو خوب شق کر رکھی تھی۔ ادھر واردات ہوتی تھی۔ ادھر میرے سرکاری اور غیر سرکاری ٹھکانے اپنی ڈیوٹی سنبھال لیتے تھے۔ ان میں زیادہ تر افراد فقیہ تھے جن کے متعلق ان کے عزیز دوست اور قریبی رشتہ دار بھی نہیں جانتے تھے کہ یہ کتنے خطرناک لوگ ہیں۔ اس کیس میں مجھے ان کا خصوصی استعمال کرنا تھا۔ میں نے انہیں باریا اور دونوں مجر عورتوں کو بھی باریا۔

مجھے پوٹھارٹھ رپورٹ کا انتظار تھا۔ اس میں معمول سے زیادہ وقت لگ گیا۔ رپورٹ شام کو آئی۔ ڈاکٹر نے لکھا تھا کہ حرکت قلب بند ہونے سے موت واقع نہیں ہوتی سانس رکنے سے ہوتی ہے۔ ڈاکٹر یہ تو نہیں لکھ سکتا تھا کہ کسی نے اس کی ناک اور منہ پر سڑاؤ لگا کر اوپر سے دبائے رکھا۔ جتنی کہ وہ مر گیا۔ اس کیس میں سانس رکنے سے مراد قتل تھا۔ ڈاکٹر نے مزید تصدیق کے لیے متھول کا دل اور پیپٹروں کا کچھ حصہ اور غالباً اندر کے ایک دو اور اعضا نکال کر منٹلے یا سو بے کے ماہرین کو بھجوا دیے تھے۔ میرے لیے معاملہ صاف تھا۔ یہ قتل کی واردات تھی۔

میں نے دونوں مجر عورتوں سے کہا کہ وہ متھول کی پہلی بیوی کے متعلق معلومات حاصل کریں اور دوسری بیوی کے متعلق تفصیل سے معلوم کریں کہ کپال چین کی کیسی تھی۔ اس کا کسی کے ساتھ دوستانہ تھا یا کسی کے ساتھ چوری چھپے میل ملاپ تھا یا اور کیا وہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے یا اغوا ہوئی ہے یا دوسرے مجروں کو بھی ضروری ہدایات دیں اور رخصت کر دیا۔ رات کو میں نے نفیتش جاری رکھی۔

دوسری بیوی کے باپ سے پوچھا کہ وہ لڑکی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرنا چاہتا ہے یا اسے یقین ہے کہ وہ اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ چلی گئی ہے۔ اس بے چارے کی حالت ایسی تھی کہ منہ کھول کر مجھے دیکھتا رہا۔ بولا کچھ بھی نہیں۔ مجھے بہر حال اس لڑکی کو ڈھونڈنا تھا کیونکہ خاندانہ کے قتل کے ساتھ اس کا تعلق تھا خواہ گواہ کی شہیت سے ہی سہی۔ میں نے اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج نہ کی۔ اس کے باپ پر ہر زاویے سے حملہ کیا۔ اسے بہت پکڑ دینے لگا۔ اس سوال کا جواب نہ ملا کہ اس کی بیٹی کی گمشدگی اغوا ہے یا فرار۔

مجھے یہ یقین ہو گیا تھا کہ باپ کچھ چھپا نہیں رہا تھا۔ اس نے تو یہ بھی نہ چھپا یا کہ اس نے اپنی بیٹی کا رشتہ تہ پانچ ہزار روپیہ نقد لے کر متھول کو دیا تھا۔ اس دور کا پانچ ہزار آج کے

چالیس ہزار کے برابر تھا، باپ نے خدا کے نام پر اپنی بیٹی بھی تھی اور اب ایسی اقلیت میں مبتلا تھا کہ اس کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی اور اس کے ہوش ٹھکانے نہیں تھے۔

پہلی بیوی کے بھائی - ایڈیٹنگ می

میں نے مقتول کے بھائی کو اپنے پاس بٹھایا اور پوچھا کہ اُس نے لاش دیکھ کر کہا کیوں کہ دیا تھا کہ اس کا باٹ فیل نہیں ہوا۔ اسے نقل کیا گیا ہے؟

”میرے بھائی نے جب دوسرے ماہی کا دن مقرر کر دیا تو اس کی پہلی بیوی کے بھائی نے مجھے کہا تھا کہ میں بھائی کو دوسری شادی سے منع کروں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”میں نے اُسے کہا کہ میں اُسے منع کر چکا ہوں مگر وہ نہیں مانا۔ میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ میرے بھائی نے جب سے دوسری شادی کا فیصلہ کیا تھا میں اُس کی مخالفت کر رہا تھا۔ میں اُسے کہہ رہا تھا کہ چچا سال تہائی ہو چکے ہیں۔ نوجوان لڑکی معلوم نہیں تمہیں دل سے قبول کرے نہ کرے۔ کئی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں لیکن وہ نہیں مانا۔ اس کے داماد پر اولاد سوار تھی۔ کہتا تھا کہ اتنا بڑا مکان اور اتنی بڑی دولت ہے۔ وہ ان سب کے گاہکوں کے بھائی کو کہا جانیس گے۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ خدا نے تمہیں بڑا نام دیا تو تم اس کے لڑکپن میں ہی بوڑھے ہو کر مر چکے ہو گے۔ ہم میں سے بھی کوئی نہ ہوگا۔ اس لڑکے کا کیا بٹے گا؟ ایسی اور بہت سی باتیں اُسے سمجھائیں لیکن اس غریب باپ نے میرے بھائی کو اپنی کنوار سی بیٹی دے دی۔ اس کے بعد میرے بھائی کی پہلی بیوی کے بھائی نے مجھے غصے سے کہا کہ بھائی کو شادی سے منع کرو ورنہ تم سب چھٹاؤ گے۔ میں بھی غصے میں آ گیا۔ آپس میں بہت بحث ہوئی۔ وہ طبیعت کا ذرا کڑوا اور تیز ہے۔ اُس نے کہا کہ بھائی اور اپنی بیٹی بھی کو سنہال کر رکھنا۔“

”کیا یہ شخص اتنا دلیر ہے کہ اُس نے تمہارے بھائی کو قتل کر دیا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔ ”میرے پاس کوئی ثبوت نہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”جہاں تک دلیری کا تعلق ہے وہ کوئی ایسا گناہ نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے غصے میں اُس کا دماغ خراب ہو گیا ہو۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ شک ضرور ہے۔“

”تمہاری بڑی بھابھی نے اس سلسلے میں تمہارے ساتھ کوئی بات کی تھی؟“ میں خود اُس کے پاس گیا تھا۔ ”اُس نے جواب دیا۔“ میں نے اُسے کہا تھا کہ بھابھی نے اپنے بھائی کو شادی سے بہت روکا ہے لیکن وہ نہیں مانا۔ مجھے یہ ناراض نہ ہونا۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں اس کی شادی میں راضی ہوں۔ وہ روتی تھی اور کہتی تھی کہ میں نے ان کی بہت خدمت کی ہے۔ اب وہ مجھ سے یہ قربانی مانگتے ہیں تو میں نے خود ساتھ ہو کر رشتہ کر دیا ہے۔ میری قسمت میں جو کچھ تھا اس پر صبر کرنا پڑتا ہے۔“

”لیکن تمہیں معلوم ہے کہ مکان اور دوکان کس کے نام پر ہے؟“

”اچھی طرح معلوم ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”یہ ابھی بھائی کے نام پر ہیں۔“ ”کیا تم کہتے ہو کہ تمہاری بڑی بھابھی نے تمہارے بھائی کو اس خطرے سے قتل کر دیا ہو کہ وہ جانیدار دوسری بیوی کے نام پر لکھ دے گا؟“

”میرے خیال ہے کہ وہ اتنے بڑے جرم کی سوچ بھی نہیں سکتی۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”اور کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری بیٹی بھائی رات سے لاپتہ ہے؟“

اُس کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ کچھ دیر تک وہ بول بھی نہ سکا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ بیٹی ولسن غائب ہے۔ وہ جب بولا تو اُس نے کہا۔ ”مجھے بھائی کے گھر جا کر دیکھنا پڑے گا کہ زیورات اور نقدی تو نہیں لے گئی۔ وہ ضرور لے گئی ہوگی۔ اگر وہ نہیں لے گئی اور غوٹنیں

جہاں کی تو اس میری بڑی جہاں کے جہاں نے غائب کرایا ہے۔“

”تم ابھی جہاں کے گھر جاؤ اور ایک تو یہ معلوم کرو کہ گھر سے زیورات، نقدی اور جہاں کے کوغذات غائب ہیں یا موجود ہیں، اور دوسرے یہ معلوم کرو کہ اس لڑکی کا گھر میں روکیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی بات معلوم کرنا تو ضرور اور جہاں جلد ہی ہو سکے مجھے بتاؤ۔“

اُس نے پہلی ہی بات کہ اُس جہاں کو بلایا جس نے مقتول کے جہاں کو دھکی دی تھی۔ اس کے ساتھ مجھے اُسادی سے باز کرنی تھیں۔ کچھ اگلا تھا۔ اس نے مقتول کی دوسری ہین کے خلاف خوب زہر لگایا۔ اُسے ہکا بکا اور جہنم میں آیا تھا چلا گیا۔ میں نے اُسے کما کر وہ اپنے کیتے میں تھی۔ خاوند کی موت کی خبر سن کر آئی ہوگی۔ اُس نے بیکار سا جواب دیا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ لڑکی غائب ہے۔ میں نے اُسے کما کر وہ بدجلین سے تو مجھے صرف ایک آدمی بتا دو جس کے ساتھ اُس کے تعلقات ہیں۔ وہ بغلیں جھانکنے لگا۔ میں اُس کے پیچھے پڑ گیا اور یہ بھی کہتا کہ کسی کا نام بتائے کیونکہ مجھے شک ہے کہ تمہارے بہنوئی کو اسی لڑکی نے اپنے کسی آشنا سے قتل کرایا ہے۔ اُس نے کوئی نشانہ ہی نہ کی۔

وہ غلط بیانی کر رہا تھا۔ میں نے اسے اپنے سوالوں کی لپیٹ میں لینا شروع کر دیا اور میں نے جب اُسے دھکی یاد دلانی جو اُس نے مقتول کے جہاں کو دی تھی تو پہلے اُس نے لنگار کیا پھر میری جہن سے گھبرا کر فنسول سی ہنسی ہنس پڑا اور کہنے لگا۔ ”وہ تو غصے کا اظہار تھا۔ میں اُسے ڈرا رہا تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ اپنے جہاں کو بتائے گا اور وہ شادی سے باز آجائے گا۔“ میں نے اُسے دھمکا نہیں چھوڑا۔ وہ اگلا گیا اور بکلائے لگا۔ میں نے سوالوں میں بیچھری کی۔ اُسے بہت کچھ دینے۔ وہ اگلا تاہی چلا گیا اور اپنے خلاف میرے شک کو پختہ کرنا کیا لگے یہ نہ صرف شک تھا۔ اُس کے منہ سے میرے کام کوئی بات ابھی نکلی نہیں تھی۔ میں نے اُسے

مشتبہ قرار دے دیا۔

پہلی بیوی کا ایک جہاں اور بھی تھا۔ اُسے بلایا۔ وہ بھی تھانے میں موجود تھا کیکن میں جلد ہی جان گیا کہ مولوی قسم کا آدمی ہے اور اس قتل کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہیں نے اسے اور اُن سب کو جنہیں میں نے تھانے بٹھائے رکھا تھا گھروں کو جانے کی اجازت دے دی۔ پہلی بیوی کے ایک جہاں کو حراست میں تو نہ لیا، تھانے میں ہی سُلانے کا انتظام کر دیا۔ اسے میں گرفتار نہیں کر سکتا تھا اور چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔

ایک حیران کن انکشاف

میں نے بھی چھٹی کی شام کو تھانے میں آتے ہی میں نے اسے ایس۔ آئی اور ہیڈ کانسٹبل سے کہہ دیا تھا کہ شہر اور ارد گرد کے جرائم پیشہ اور سزا یافتہ افراد کو تھانے میں بلالیں اور تھانے کے علاقے کے نمبرداروں اور چوکیداروں سے بھی کہ دیں کہ ایک لڑکی کا دھیان رکھیں جو شہر سے اغوا یا فرار ہوئی ہے۔ جرائم پیشہ لوگوں کو بلانا اس لیے ضروری سمجھا تھا کہ مجرم یا مجرموں نے جہاں سے دیوار چھلانگی تھی وہاں سے مجھے چرس والے سگریٹ کا ٹکڑا ملا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ مجرم جرائم پیشہ ہیں۔

میں اگلے روز تھانے میں آیا تو غنڈے بدعاش اور دیگر مطلوبہ افراد آئے ہوئے تھے۔ یہ چھوٹے چھوٹے جرائم کرنے والے، بھوٹے باز اور چرسی تھے۔ دیہاتی علاقے میں دو آدمی ایسے تھے جو کرائے کا قتل کر سکتے تھے۔ وہ دونوں آگئے۔ ان لوگوں کے ساتھ پولیس کی گفتگو کچھ اور انداز سے ہو کر رہی ہے۔ میں نے وہ انداز اختیار کیا۔ بہت جھک جھک کی۔ ہاتھ کچھ بھی ڈالیا میں انہیں اکیلے اکیلے بلارہا تھا۔ انہیں ایک دوسرے کے خلاف بھڑکا اور اُن کا سبھی رہا تھا۔ ڈرایا

دھکا کا یا بھی مگر بات گول پی رہی۔ میں نے انہیں اکٹھا بٹھا کر شرم دلائی کہ ان کے شہر میں باہر سے کڑ کوئی واردات کر گیا ہے۔ میں نے انہیں بتایا تھا کہ یہ قتل اجرت پر کیا گیا ہے اور شہر کی ایک لڑکی بھی لٹل گئی۔ یہ سن کر ان کے متعلق معلوم نہیں کہ انہیں ہونی ہے یا اپنی مرضی سے گئی ہے۔ میں نے کہا کہ اگر انہیں ہونی ہے تو تم سب پر اذیت ہے۔

جرام پیشہ افراد ایک دوسرے کے سامنے پولیس کو کوئی بات نہیں بتاتے۔ اس طرح وہ بدنام ہو جاتے ہیں۔ ان کے ہم پیشہ سافٹی کہتے ہیں کہ یہ مجبزی کرتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مجبزی سب کرتے ہیں۔

میں نے انہیں ایک بار پھر اکیسے اکیسے اندر بلایا اور ایک ہی سوال پوچھا۔ ”باہر سے کون آیا تھا؟“ میرا مطلب تھا کہ باہر کو کوئی جرم پیشہ شہر میں دیکھا گیا ہوگا۔

صرف ایک نے کہا۔ ”آسی آیا تھا۔“

میں اسی کو نہیں جانتا تھا۔ میں اپنے آپ پر حیران ہوا کہ یہ شخص اگر جرم پیشہ ہے تو میں اُسے نہیں جانتا۔ معلوم ہوا کہ وہ تھا نے کے دیکھا لڑ پر نہیں اور شہر سے دور رہتا ہے۔ میں نے دوسروں سے پوچھا کہ اسی کون ہے؟ کیا وہ ہمارے کام کا آدمی ہے؟

میرے ان سوالوں پر ایک اور عظیم مدعا پیش ہوا جیسا کہ میں نے کہا تھا۔ ”ہاں شک صاحب اس واردات میں وہ آپ کے کام کا آدمی ہو سکتا ہے۔ اللہ کی توفیق ہی جانتا ہے۔ لیکن اسی کا تعلق بتا ہے۔“

اس پر دو اور بول پڑے۔ ”معلوم ہو کہ واردات والی رات سے ایک روز پہلے اسی کو شہر میں دیکھا گیا تھا۔“

اور جب انہوں نے مجھے بتایا کہ اسی کون ہے تو ایسے لگا جیسے ان لوگوں نے میرے ہم

کے ساتھ بجلی کے ننگے تار لگا دیئے ہوں۔ انہوں نے بتایا کہ اسی مقتول کی پہلی بیوی کے پتلے خاوند کا بیٹا ہے۔ اس کا نام آصف علی تھا اور اُسے اسی کہتے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ مقتول کی پہلی بیوی کی سیک کسی اور سے شادی ہوئی تھی۔ اُس کا ایک بیٹا پیدا ہوا جو یہ اسی تھا۔ یہ چار پانچ سال کا بچہ تھا تو اس کا باپ مر گیا۔ اس کی ماں کی عمر ابھی بائیس تیس سال ہی ہوئی تھی۔ برادری نے اس کی شادی مستقبل کے ساتھ کر دی۔ اسی آوارہ ہو گیا اور لڑکپن میں بڑی بیچک میں چلا گیا۔ وہاں سے واپس نہ ہوا۔ نوجوانی تک وہ استادوں کے پاس پہنچ چکا تھا۔ قتل کی اس واردات کے وقت وہ ایک گروہ کے ساتھ تھا لیکن ان لوگوں نے بتایا کہ اسی اکیلے واردات کرنے کے قابل نہیں ہوا۔ گروہ کے لیے مجبزی کرتا اور ہر طرح کی مدد کرتا ہے۔ یہ بھی بتایا گیا کہ وہ شہر میں کبھی آتا ہے۔ ماں سے ماموں سے اسی کو رشتہ دار سے نہیں ملتا۔ برادری اسے دھتکار چکی ہے۔

یہ انکشاف میرے لیے بڑا قیمتی تھا۔ اس کے ساتھ ہی ان لوگوں نے ایک اور انکشاف کیا۔ وہ یہ تھا کہ اُسے کبھی بارشنگ کے ساتھ باتیں کرتے دیکھا گیا ہے۔ اس موقع پر ایک نے بتایا کہ پرسوں یعنی قتل کی رات سے پہلے دن اُسے شہر کے ساتھ باتیں کرتے دیکھا گیا تھا۔

شہر میری ایک مجبزی عورت تھی۔ میں نے دو مجبزی عورتوں کو سواغریانی ڈیوٹی دے رکھی تھی۔ ان میں ایک شہر تھی۔ یہ تو لگے کہ قتل تھا۔ اسی کے متعلق مجھے شہر سب کچھ بتا سکتی تھی۔ اس سے پہلے کسی نے اسی کا نام تک نہیں لیا تھا۔ مجھے شک ہونے لگا کہ اسی کو قتل کے لیے استعمال کیا گیا ہوگا۔ یہ ماں مقتول کی پہلی بیوی ابھی رستہ تھی اور اسی کا یہ ماموں بھی ہے میں نے مشتبہ لگایا تھا۔ میں نے ان جرائم پیشہ اشخاص سے اسی کے متعلق کچھ اور معلومات حاصل کیں اور شہر کا نظارہ کرنے لگا۔ اس سے بات کے بغیر میں پہلی بیوی کے مشتبہ بھائی اور پہلی بیوی سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

شام سے کچھ دیر پہلے شب تو رانی دوسری عورت آگئی۔ اُس نے وثوق سے رپورٹ دی کہ رانی (دوسری بیوی) چال چلن کی صاف معلوم ہوتی ہے۔ اُس کے متعلق کوئی جھوٹا قصہ بھی کسی نے نہیں سنا یا۔

مقتول کی پہلی بیوی کے متعلق رپورٹ بطور صاف تھی لیکن محلے اور برادری میں یہ شک کیا جا رہا تھا کہ قتل میں بیوی بیوی۔ بڑا گناہ نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی سب کو پتہ چل چکا تھا کہ دوسری بیوی لاپتہ ہے۔ عورتوں سے اس کی گشتی پچھانی نہیں جاسکتی تھی۔ سرکسی نے دیکھا کہ خاوند کی موت پر وہ کہیں نظر نہیں آرہی۔ جبکہ ملوہ گناہ کو وہ یاں نہ ہی نہیں تو رانہ لکھ گیا اور عورتوں نے باتیں گشتی شروع کر دیں۔ فخر عورت نے۔ باتیں غور سے نہیں لیکن اس کی نگاہ میں یہ سب ممکن لگتا تھا۔ مجھے شک بھی ہوا کہ لڑکی نے کہیں جا کر خودکشی کر لی ہوگی۔ اس صورت میں مجھے اطلاع سنبھانی پانچ تھی۔ لاش کی اطلاع تھانے میں ہی آئی تھی۔

میں نے اس فخر عورت سے مقتول کی پہلی بیوی کے پہلے خاوند اور بیٹے (آسی) کے متعلق پوچھا۔ اس نے تصدیق کی کہ اس کا پہلے ایک خاوند تھا جس سے ایک بیٹا تھا۔ یہ آسی تھا جو بڑا بوجھ بھاش اور خندہ بن گیا اور غائب ہو گیا۔ اس عورت نے کہا۔ ”میں نے دو تین دفعہ اُسے شہر میں دیکھا ہے لیکن میری اس کے ساتھ کوئی بات چیت نہیں۔ شب تو اُسے اچھی طرح جانتی ہے۔“

اتنے میں مقتول کا سنبھانی آگیا۔ اُسے میں نے کہا تھا کہ مقتول کے گھر جا کر معلوم کرے کہ زیورات وغیرہ غائب ہیں یا نہیں۔ اُس نے بتایا کہ ایک بھی چیز غائب نہیں، بلکہ دوسری بیوی کے زیورات کی بھی کچھ چیزیں گھر میں موجود ہیں۔ میں نے اُس سے بھی آسی کے متعلق پوچھا۔ اُس نے بھی تصدیق کی اور یہ بھی بتایا کہ مقتول آسی کو بالکل پسند نہیں کرتا تھا۔ قتل سے بہت عرصہ

پہلے کی بات ہے کہ آسی اپنی ماں سے ملنے آیا تھا۔ مقتول نے اُسے بہت بُرا سبکا کہا اور اُسے گھر میں بیٹھے بھی نہیں دیا تھا۔ اُس وقت اتفاق سے یہ سنبھانی مقتول کے گھر میں موجود تھا۔ پہلی بیوی (آسی) کی ماں بہت روٹی تھی۔

”کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ قتل میں آسی کا ہاتھ ہو؟“ میں نے پوچھا۔
 ”میں کچھ کہ نہیں سکتا۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ خندہ لڑکی اور بدعاشی کرتا ہے یا نہیں یا کہیں نوکری چاکری کرتا ہے۔ یہ بتا سکتا ہوں کہ کبھی گھر میں آتا ہے۔ اُس کی ماں کے سنبھانی بھی اُسے منہ نہیں لگاتے۔“

شب تو۔ مخبر یا مشتبہ؟

پھر شب تو بھی آگئی۔ میں اُسے الگ لے گیا۔ اُسے فوراً نہیں کہا کہ وہ آسی کو جانتی ہے اور اُس کے متعلق کچھ بتائے۔ فخر عورتیں اور مرد بڑے شک پولیس کے لوگ ہوتے ہیں لیکن قتل والے متاثرہ رانہ کی ہر رپورٹ کو سچ نہیں مان لیا کرتے کیونکہ یہ لوگ صاف چال چلن کے نہیں ہوتے۔ بعض جرائم پیشہ منہ مانگے پیسے دے کر ان کے منہ بند کر دیتے اور ان کی زبان سے پولیس کو گمراہ کراتے ہیں۔ پولیس کے لیے مخبر کا وجود ضروری ہوتا ہے لیکن مشکوک بھی۔

میں نے پہلے شب تو کی رپورٹ سنی۔ اُس نے دوسری بیوی کے متعلق جو رپورٹ دی وہ اس سے مختلف تھی جو مجھے دوسری فخر عورت دے چکی تھی۔ اُس نے بتایا کہ لڑکی چال باز ہے۔ شادی سے پہلے صاف نہیں تھی۔ وہ اپنی مرضی سے گئی ہے۔ شب تو نے اپنی رپورٹ صحت ثابت کرنے کے لیے بہت سے زبانی ثبوت پیش کیے اور مجھے شک میں ڈال دیا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ مقتول نے ساتھ شادی کر کے یہ لڑکی دو تین روز خاوند کے پاس رہتی تھی اور دو تین روز ماں باپ کے

گھر۔ میں نے اس کی یہ بات مان لی۔ یہی بات مجھے مقتول کی پہلی بیوی بتا چکی تھی۔ شبو نے راکھی کے متعلق چند ایک عظیم باتیں بھی کہیں۔

”شبو!۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ یہ اسی کون ہے؟“

”اسی؟۔۔۔ اُس نے میرا دل جو جواب دیا۔۔۔ ”کون اسی؟ میں تو کسی اسی کو نہیں جانتی۔“

”میں جانتا ہوں۔“ میں نے۔۔۔ اور شبو کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ بہت ہی چالاک عورت تھی۔ وہ گہرائی تو نہیں لیکن میں نے اُس کے چہرے کے رنگ کی تبدیلی دیکھ لی۔ میں اُس سے کچھ زیادہ ہی ڈانک تھا۔ اُس نے مجھے نمایاں شک میں ڈال دیا۔ میں نے ڈراما ہاؤس پر اُس سے بات کی۔ ”میں اُسے جانتا ہوں شبو! اُسے وہ مقتول کی پہلی بیوی کا پہلی شادی سے جانتا ہے۔ مجھے اُس کے متعلق اس سے زیادہ کچھ بھی معلوم نہیں۔ تمہیں کچھ علم ہو تو بتاؤ۔“ ”ہاں، یاد آگیا۔“ اُس نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ”میں نے اُسے عرصہ ہو ا دیکھا تھا۔ کبھی خیال نہیں آیا کہ ماں چلا گیا ہے۔ اتنا یاد ہے اس عورت کا ایک بیٹا جو اکرتا تھا۔ آج آپ سے پتہ چلا ہے کہ اُس کا نام اسی تھا۔ اُس نے اس مومنوع کو گول کرنے کے لیے دوسری باتیں شروع کر دیں۔

”شبو!۔۔۔ میں نے اُسے روک دیا اور کہا۔۔۔ تم نے مقتول کی دوسری بیوی کے چال چلن کے متعلق جو رپورٹ دی ہے وہ ایسی ہے کہ مجھے اُن لوگوں سے بھی پوچھنا پڑے گا جنہوں نے تمہیں بتایا ہے کہ راکھی جالباڑے اور شادی سے پہلے صاف نہیں تھی۔ مجھے دو تین آدمی یا عورتیں بتاؤ؟“

”وہ سب پولیس سے ڈرنے والے لوگ ہیں۔“ اُس نے کہا۔ ”میں اُن کے نام بتا

دوں گی لیکن آئندہ میں ان لوگوں سے کوئی بات معلوم نہیں کر سکوں گی۔ میرا اعتبار ٹوٹ جاتے گا۔“

میں نے شک کی بنا پر اس پر جرح شروع کر دی، لیکن ایسے انداز سے کہ اُسے شک نہ ہو کہ میں اُس پر شک کر رہا ہوں۔ میں مجبوراً اور انجان بن گیا اور اُس کا انداز ایسا ہو گیا جیسے مجھے نہیں بلکہ کسی بچے کو کوئی بات سمجھا رہی ہو۔ اس سے میرا شک پختہ ہوتا گیا۔

”شبو!۔۔۔ میں نے مسکرا کر کہا۔۔۔ ”تم جو کچھ سوچ کر آئی تھیں وہ تم نے کہ لیا ہے۔ آؤ اب کام کی باتیں کریں۔ یہ یاد کر لو کہ ایک آدمی قتل ہو گیا ہے اور ایک لڑکی لاپتہ ہے جو مقتول کی بیوی تھی۔ تم جانتی ہو کہ یہ معمولی چوری چکاری یا کسی کے لڑائی جھگڑے کی واردات نہیں۔ یہ بھی یاد کر لو کہ یہ علاقہ ہندوؤں کا ہے اور یہیں مسلمان ہوں۔ تم بھی مسلمان ہو۔ ہندوؤں کے دل میں میرے خلاف دشمنی ہے۔ اگر کوئی میرا سنگ عزیز مشتبہ ہو گا تو میں اُسے بھی نہیں بخشوں گا تم اب ذرا دل کو صاف کر کے بات کرو۔ تم اُسی کو نہ صرف جانتی ہو بلکہ کئی بار اُس کے ساتھ تمہاری باتیں بھی ہوئی ہیں۔ جھوٹ بولنے سے پہلے سوچ لینا کہ یہ اطلاع مجھے تم جیسے مجبوروں نے دی ہے۔ اس شہر میں مجرم بھی ہیں اور ان میں ایسے بھی ہیں جن کی نظریں تم سے زیادہ گہری ہیں۔“

وہ پریشان ہو گئی لیکن عورت چالاک تھی۔ زبان کی اُشاد تھی۔ اس نے مجھے چکر دینے کی کوشش کی، پھر یہ کہا کہ خجروں وغیرہ کے گرد وہیں کچھ لوگ اس سے جلتے ہیں کیونکہ وہ ہر رپورٹ معجز لاتی ہے۔ میں نے اب سیدھے سوال پھینکے شروع کر دیئے تھے۔ وہ روپڑی جوا کار تھی۔ وہ مجھے اُنہیں بنا سکتی تھی۔

”تم نے آخری بار اُسی کو کب دیکھا تھا؟“ میں نے کہا۔ ”سوچ سمجھ کر جواب دینا۔ اب

”تم نہیں مشتبه ہو۔ اس تھانے سے اب باہر نہیں جاسکو گی۔ بتاؤ تم نے اُسے کب دیکھا تھا؟“
”کہ تو یہی ہوں کراؤ دیکھو مجھے عرصہ ہو گیا ہے۔“ اُس نے مظلوموں کے لیے جس
جواب دیا۔

”اور یہ خبر صرف دو دو تک پہنچے۔“ میں نے کہا۔ ”قتل اور اغوا سے پہلے وہ تمہیں
ملا تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اب، وہ گھر آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔“ اگر وہ تمہیں ملا تھا تو چھپانے
کی کیا ضرورت ہے؟ یہ کوئی جرم نہیں۔“

اُس کی ڈالاکھی ختم ہو چکی تھی۔ ذرا سوچ کر بولی۔ ”راستے میں مل گیا تھا۔ کوئی خاص
بات نہیں ہوئی۔ مجھے دیکھ کر گرک گیا۔ خیر خیر یہ تو چھپی اور چلا گیا۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں وہ اتنی اچھی طرح جانتا ہے کہ اُس نے خیر خیر یہ پوچھنے
کی ضرورت محسوس کی۔“ میں نے کہا اور اُسے مشورہ دیا۔ ”تم تھانے میں ہی رہو گی بٹھٹھے
دل سے سوچو اور اپنا دل کھول کر میرے آگے رکھ دینا۔ دیکھو شبو! ہم ایک دوسرے کی مدد کرتے
ہیں تو بچوں کا پیٹ پالتے اور سڑت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ تم نے میری اور میرے بھائی کی
بہت خدمت کی ہے۔ میں تمہاری خدمت کروں گا، لیکن مجھے بچہ سمجھ کر چھپانے کی کوشش
نہ کرو۔“

اس طرح کی کچھ اور باتیں کہ کر اُسے اپنے بیڈ کانسٹیبل کے حوالے کر دیا۔

لڑکی اندھیرے راستے سے گئی

میں نے تین افراد کو تھانے بلایا۔ ایک مستول کی دوسری بیوی کی ماں۔ اس کا باپ
اور مستول کی پہلی بیوی۔

یہ لوگ آگئے تو میں نے دوسری بیوی کی ماں کو الگ کر کے دفتر میں بٹھا لیا۔ اسے
کہا کہ اچھی طرح یاد کرو کہ جس شام اس کی بیٹی لاپتہ ہوئی اُس روز یا اس سے ایک دو روز
پہلے اُس کے گھر کون کون سی عورت آئی تھی۔ میں نے یہ سوال اپنے تجربے کی بنا پر کیا تھا۔ لڑکیوں
کے اغوا یا فرار میں بعض اوقات شبو کی تلاش کی عورتیں کام کیا کرتی ہیں۔ وہ لڑکی کو جاکر پیغام
دیتی ہیں۔ وقت اور جگہ بتاتی ہیں۔ اگر اغوا کرانا ہو تو انہیں کسی کا غلط پیغام دے کر ایسی جگہ پہنچا
دیتی ہیں جہاں اغوا کرنے والے موجود ہوتے ہیں۔ میرے دماغ میں پہلے کی کچھ وارداتیں آگئی تھیں
جن کی روشنی میں میں نے سوچا تھا کہ مستول کی دوسری بیوی کے اغوا یا فرار میں شبو نے مدد دی ہوگی۔
لڑکی کی ماں نے سوچ سوچ کر بتانا شروع کیا۔ اُس نے تین چار عورتوں کے نام لیے۔

ان میں شبو کا نام بھی تھا۔ مجھے اسی نام سے دلچسپی تھی، لہذا اسی کے متعلق پوچھنا شروع کر دیا۔
میں نے پوچھا کہ شبو اُس کے گھر کتر آتی جاتی ہے؟ اُس نے بتایا کہ اسے وہ اتنا ہی جانتی ہے
کہ اس کا خاوند چمپک سے اندھا ہو گیا تھا اور شبو محنت مزدوری کر کے گزارہ کرتی ہے۔
شبو کو وہ غریب عورت سمجھتی تھی۔ خیر عورتوں کی یہی خوبی تھی کہ وہ غریب اور مظلوم بنی رہتی
تھیں۔ میرے سوال کے جواب میں دوسری بیوی کی ماں نے بتایا کہ شبو اُن کے گھر زیادہ نہیں
آتی جاتی۔ قتل کے روز آئی تھی اور اس سے ایک دو روز پہلے بھی آئی تھی۔

”اُس نے تمہاری بیٹی کے ساتھ الگ ہو کر کوئی بات کی تھی؟“ میں نے پوچھا۔
”وہ دراصل میری بیٹی کے پاس ہی بیٹھی رہی تھی۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”میں کسی
کام سے باہر نکل گئی تھی۔“

”تمہاری بیٹی جب شام کے بعد گھر سے نکل تو تمہیں کیا بتا کر گئی تھی؟“ میں نے کہا۔
”اس نے جو کچھ کہا تھا وہ مجھے بتا دو۔“

”اُس کے آنسو بہ نکلے۔ میں نے اُسے جذبات میں اُلجھا لیا۔ بہت دیر جذباتی باتیں کر کے میں اُسے نہایت آہستہ آہستہ اُس کے بیٹے اُسی کی طرف لایا۔

”اُس نے التجا کے لیے میں پوچھا۔ ”آپ اُسے قتل کے شک میں پکڑ تو نہیں لیں گے؟“
 ”اُس بے چارے کا قتل کے ساتھ کیا تعلق ہو سکتا ہے۔“ میں نے ایسے خلوص کے لیے میں کہا جس میں کوئی خلوص نہیں تھا۔ میں اُس وقت پولیس انسپکٹر تھا جس کے سامنے جذبات نہیں اپنا فرض تھا۔ میں نے کہا۔ ”میں نے اُسی کی بات صرف اس لیے جھوٹی ہے کہ پہلے خاوند سے تمہارا ایک بچہ پیدا ہوا۔ دوسرے خاوند سے تم بے اولاد رہیں اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مقتول کو خد انے یہ وصف دیا ہی نہیں تھا۔ اُس نے دوسری شادی کر کے غلطی کی تھی۔“

”یہ تو میں نے بھی اُسے کہا تھا۔ اُس نے کہا۔“ لیکن میں اُس کی خواہش رد نہ کر سکی۔ میں جانتی تھی کہ دوسری بیوی سے بھی اُس کی اولاد نہیں ہوگی۔ لڑکی والوں نے جانیہ ادا کے لالچ میں لڑکی دے دی تھی۔“

”اب تم تمہارہ گئی ہو۔ میں نے کہا۔“ اگر مجھے تمہارا بیٹا مل جائے تو میں اُسے سمجھا بھگا کر یا ڈرا دھمکا کر تمہارے قدموں میں بٹھا دوں۔“

”اُسے سمجھانے یا ڈرانے کی ضرورت نہیں۔“ اُس نے کہا۔ ”وہ مجھ سے نہیں بھاگا۔ اپنے سوتیلے باپ نے اُسے بھگایا تھا۔ اس معصوم کے ساتھ میرے دوسرے خاوند مقتول نے ایسا برا سوکھ کیا کہ آج بچہ مجھے نظر نہیں آتا۔“

مال بچے اور مقتول کی کہانی

اُس نے اپنے بچے (اُسی کی اخلاقی تباہی کی داستان یوں سنائی کہ اُسی اپنے

”اُس نے اپنی سہیلی کا نام لے کر کہا تھا کہ اُس کے گھر جا رہی ہوں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”میں نے اُسے کہا تھا کہ دن کے وقت جانا تھا۔ اُس کے گھر کا راستہ اندھیرا ہے۔ میری بیٹی۔ نہ کہ اُس نے کہ نہ ضروری بات کے لیے بلایا ہے۔ ثبوت اُسے کہا تھا کہ اس نے شام کے بعد بلایا ہے۔ وہ شاید پہنچنے کی کوئی بات کرنا چاہتی ہے۔ میں نے بیٹی سے کہا کہ جلدی آجانا۔ کو تو میں ساتھ پہنچتی ہوں لیکن بیٹی نے ذرا غصے سے کہا کہ میں بچی تو نہیں۔ رات میں ڈاکو تو نہیں بیٹھے ہوئے۔ وہ چلی گئی اور میں پچھتا رہی ہوں کہ میں اس کے ساتھ کیوں نہ چلی گئی۔“

مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ اس ذامے میں شبنم موجود ہے یا نہیں۔ وہ موجود تھی۔ اب یہ دیکھنا تھا کہ بڑی اپنی مرضی سے گئی یا اغوائی گئی ہے۔ اس کی سہیلی کے گھر تک کا راستہ تاریک اور پران تھا۔ میں نے فوری طور پر یہ کام کیا کہ بیٹہ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ دردی اُٹا کر اپنے بچے پہننے اور دوسری بیوی کی ماں کے ساتھ اُس کی سہیلی کے گھر جاکر معلوم کرے کہ اُس نے شبنم کی زبانی یہ پیغام سمجھا تھا کہ گمشدہ لڑکی شام کے بعد اس کے گھر آئے ہے۔

بیٹہ کانسٹیبل اس عورت کو ساتھ لے کر چلا گیا۔ میں نے مقتول کی پہلی بیوی کو بلایا۔ وہ تم نے مجھے بتایا نہیں کہ تمہارا ایک بیٹا بھی ہے۔ میں نے اُسے کہا۔

اس گھر بیوی عورت کے چہرے پر گھبراہٹ لگتی اور خاموش رہی۔ میں نے کہا۔ ”میں نے سنا ہے کہ وہ گھر تھاٹ کا نہیں رہا۔ اُس کے دل پر قبضہ کرنے کے لیے میں نے بھڑکی کے لیے میں کہا۔ ”نہ اُنے تمہاری قسمت میں دکھ ہی دکھ کھئے ہیں۔ پہلا خاوند مر گیا۔ خدا نے ایک بیٹا دیا وہ کسی کام کا نہ نکلا۔ دوسرے خاوند سے اولاد نہ ہوئی اور اُس نے بڑھاپے میں آکر یہ دکھ دیا کہ دوسری شادی کر لی۔ پھر وہ زندہ ہی رہا۔“

باپ کا پہلا بیٹہ تھا اس لیے باپ نے اسے بہت زیادہ پیار دیا۔ بچہ اس پیار کا عادی اور نشی ہو گیا۔ بدستوری یہ ہوئی کہ وہ ہر سال کا بوا تو باپ مر گیا۔ بیٹے کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ وہ اپنے باپ کو اور اس کے پیار کو بھول گیا۔ تھا۔ ماں نے باپ بننے کی کوشش کی جو بچے کا دل نہ ہلا کسی ڈیڑھ ایک سال بعد اس عمر تک کی شادی مقتول کے ساتھ کر دی گئی۔ بچہ ساتھ تھا۔ مقتول نے بچے کے سر پر ہاتھ رکھا مگر بچے کا مطالبہ بڑا سخت تھا۔ پہلے پہل مقتول نے بچے کی ماں کی نیت سماج پر پڑنے کو بیاہ دینے اور اس کی پرہیزگاری کرنے کی کوشش کی مگر بچہ سنبھل نہ سکا۔ مقتول آخر لایا باپ تھا۔ خون کا رشتہ تو نہیں تھا۔ وہ بچے سے ٹھیک لگتا۔ اس نے بچے کو مارنا پٹینا شروع کر دیا۔ ماں بچے کو سینے سے لگاتی تھی تو بھی کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ دو سال بعد بچے کو سکول داخل کرایا تو اس نے قیمت کھڑی کر دی۔ اس زمانے میں تعلیم تو اتنی ہی ہوتی تھی لیکن استاد بچوں کو ظالمانہ سزا دیتے تھے۔ بچہ سکول میں روتا یا دباں سے جھگڑتا تھا تو اسے استاد پٹیتا تھا۔ گھر باپ پٹیتا تھا۔ رات بچہ ماں کے ساتھ لگ کر سوتا تھا۔ بچہ گیارہ بارہ سال کا ہو گیا۔ مقتول کی کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اس نے اپنی بیوی کا علاج شروع کر دیا۔ اسی اب سیانا ہو گیا تھا اور پوری طرح آوارہ۔ مقتول کے ساتھ اس کی بول چال بند ہو چکی تھی۔ مقتول نے اسے دکان پر بٹھانے کی کوشش کی لیکن اسی اب اسے پریشان کر کے خوش ہوتا تھا۔ اسے ماموؤں نے بھی سنبھالنے کی کوشش کی اور اسے اپنے گھر رکھنا چاہا مگر وہ ماں سے الگ نہیں رہ سکتا تھا۔ مقتول کی توجہ اب اس پر لگی ہوئی تھی کہ اس کی اپنی اولاد ہو۔ اسی کو ماں نے اسے کہا کہ اسی کو بھی اپنا بچہ سمجھ لو۔ مقتول کو مینفلور نہ تھا۔ یہ وہ چودہ سال کی عمر میں بچہ راتوں کو بھی باہر رہنے لگا۔ دن کو تو اکثر غائب رہتا تھا۔ اس کی پڑھائی ختم ہو چکی تھی۔ مقتول اپنے کاروبار کے لیے نکل جاتا تو اسی اپنی ماں کے پاس

آتا اور چلا جاتا تھا۔ ایک روز مقتول گھر آیا تو اسی گھر میں تھا۔ اس نے اسی سے کہا کہ وہ یہاں سے نکل جائے اور آئندہ اس گھر میں نہ آئے۔ اسی نے اسے کہا کہ وہ اپنی ماں کے پاس آتا ہے اور اس گھر کے پانی کے گھونٹ کو بھی حرام سمجھتا ہے۔ اس کی ماں نے مقتول کی منت کی کہ وہ ایسا ظلم نہ کرے۔ مقتول نے اسے بتایا کہ اس لڑکے نے سارے خاندان کو بدنام کر دیا ہے۔ اسی عمر میں یہ لڑکے پر جاتا ہے، چرس پیاتے اور غنڈوں بد معاشوں کے ساتھ اس کا دوتاڑ ہے۔

ماں آخر ماں تھی۔ اس نے مقتول سے کہا کہ لڑکے کو اس حال تک اسی نے پہنچایا ہے۔ اس پر مایاں بیوی میں تو تومیں میں ہو گئی۔ اسی اب بد معاشی میں داخل ہو چکا تھا۔ اس نے مقتول سے کہا۔ ”تم میری ماں کے خاوند ہو میرے کچھ نہیں گنتے۔ اگر تم نے میری ماں کو ذرا سی بھی تکلیف پہنچائی تو تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اب ذرا ہوش سے بات کرنا۔“ اور وہ اس گھر سے ہمیشہ کے لیے ہلا گیا۔

ماں کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں گیا اور اب کہاں رہتا ہے۔ دوسرے تیسرے مہینے مقتول کی غیر حاضری میں ماں کے پاس آتا تھا۔ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھا اور پوچھتا تھا کہ اُسے خاوند کی طرف سے کوئی تکلیف تو نہیں۔ ایک روز وہ آیا تو ماں کے منہ سے اپنے خاوند کے خلاف کوئی شکایت نکل گئی۔ شام کو خاوند گھر آیا۔ اسی جا چکا تھا۔ خاوند نے اسی کی ماں کو بتایا کہ اسی دکان پر گیا تھا اور اُسے مقتول کو کہہ گیا تھا کہ میری ماں کو تنگ کرتے ہو۔ اگر باز نہ آئے تو پھٹاؤ گے۔ مقتول اس سے ڈر گیا تھا۔ اسی کی ماں نے خاوند سے معافی مانگی اور گھر میں سکون رکھنے کی خاطر خاوند سے کہا کہ وہ آئندہ اسی کو گھر میں نہیں آنے دے گی۔ مقتول اسی سے اتنا ڈر گیا تھا کہ اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ اُسے گھر میں داخل ہونے سے نہ روکنا۔

اس کے بعد مقتول نے اپنی بیوی کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہ کی۔ اسی دوسرے تیسرے

پر رے اٹھنے لگے

مجھے شک ہو کہ اس مقام پر اگر اس عورت نے جھوٹ بولنا شروع کر دیا ہے۔ مجھے تو یہ بھی یقین نہیں تھا کہ اس نے اپنے بیٹے کی جو کہانی سنائی ہے وہ سو فی صد سچ ہے۔ اُس نے کئی باتوں پر پردہ ڈالا ہو گا اور کچھ اصرانے بھی کیے ہوں گے۔ اُس نے سب سے پہلے مجھ سے پوچھا تھا۔ آپ اسے قتل کے شک میں پکڑ تو نہیں لیں گے؟

وہ آخر بڑی عمر کی عورت تھی۔ اس میں ماتا کے علاوہ اتنی قفل بھی تھی کہ اپنے بیٹے پر شک نہ ہونے دے۔ میرے دل میں شک پیدا ہو چکا تھا جو اس عورت نے پکا کرنا شروع کر دیا۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ اسی قتل سے ایک روز پہلے اور اس سے بھی پہلے شہر میں دیکھا گیا تھا۔ یہ ثبوت بھی مل چکا تھا کہ وہ شہر میں نہیں کہیں دوڑ رہا ہے۔ ماں کے ساتھ اس کا پیار بہت شدید تھا۔ میں نے ماں کا بیان بہت مختصر کر کے سنایا ہے۔ اگر تفصیل سے سُنا تا اور اُس نے جو واقعات سُنائے تھے، وہ بھی سُنا تو آپ حیران رہ جاتے کہ ایسا آوارہ آدمی ماں کی کس طرح موباکرنا تھا۔ میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ یہ آدمی اپنی ماں کی ذرا سی تکلیف پر کئی قتل کر سکتا تھا۔

میرے پیش نظر یہ بھی تھا کہ اس کے اندر ظلم اور اذیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی وہ نفسیاتی مریض تھا۔ عادی مجرم جن میں ڈاکو اور قاتل خاص طور پر قابل ذکر ہیں، انہی حالات کی پیداوار ہوتے ہیں جن میں اسی نے پرورش پائی تھی۔ وہ تخریب اور تباہ کاری کے سوا اور کچھ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ جرائم پیشہ گروہ کے ساتھ رہ کر جوان ہوا تھا اور وہ جس بھی ہمتا تھا جو سوچنے کی صلاحیت کو ختم کر دیتی ہے۔

سینے آتا رہا۔ دوبارہ عید سے ایک روز پہلے آیا اور ماں کے لیے کپڑے بھی لایا۔ ماں اُسے سینے سے لگا کر روتی اور پیار کرتی تھی اور اُسے کتنی تھی کہ وہ شہر میں کی طرح رہے تو اُسے اپنے ماموں اپنے ساتھ نکالیں گے۔ مگر اسی شہر میں کی زندگی سے دور نکل گیا تھا۔ مقتول بے اولاد رہا۔ اُس کی اور اسی کی ماں کی جوانی ڈھل گئی۔ اسی پوری طرح جوان ہو گیا۔ پھر وہ دن آیا کہ مقتول نے پچاس سال کی عمر میں دوسری شادی کر لی۔

نئی بیوی کو آٹے تین چار گز گزرے تھے کہ اسی آگیا۔ اب وہ چوبیس سال کی عمر کا جوان آدمی تھا۔ اُس نے ماں سے کہا کہ اُس کے خاوند نے اُسے (ماں کو) اس عمر میں بکر دیکھ دیا ہے جسے اسی برداشت نہیں کر سکتا۔ ماں نے اُسے بہت سمجھایا کہ مقتول نے اُس کی مرضی سے دوسری شادی کی ہے کیونکہ وہ اولاد چاہتا ہے۔

اسی ٹھنڈا نہ ہوا۔ اُس نے نئی بیوی سے کہا۔ ”تم اگر اپنے ماں باپ کے پاس چل جاؤ تو تمہارے لیے اچھا رہے گا۔ جب تک میری ماں زندہ ہے میں تمہیں یہاں نہیں دیکھ سکتا۔ اگر مجھے پہلے پتہ چل جاتا تو میں تمہارے ماں باپ کو روک دیتا۔ تم بے گناہ مارتی جاؤ گی۔“

نئی بیوی رو پڑی۔ اُس نے کہا کہ اس میں اُس کا کوئی قصور نہیں۔ اُس نے اپنے ماں باپ کا حکم مانا ہے۔ اسی چاہ گیا تو اُس کی ماں نے نئی بیوی کی منت سماجت کی کہ وہ خاوند کو دے دے کہ اسی آیا تھا اور یہ دھمکیاں دے گیا ہے۔ مگر اسی دکان پر چل گیا اور مقتول کو تہی دھمکیاں دے آیا۔ مقتول بہت پریشان تھا۔

”اس کے بعد میں نے اسی کو نہیں دیکھا۔ اس کی ماں نے جذبات کی روانی میں تیری داستان سنا کر کہا۔ اُسے پتہ چل جاتا کہ اس کی ماں اُجڑ گئی ہے تو وہ اڑ کر پہنچا۔“

میں نے اُس کی ماں سے نفی کش کے انداز سے پوچھ گچھ شروع کی تو میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ وہ غلط جواب دے رہی ہے۔ اُس کے بعض جواب گول مول تھے اور بعض اس طرح ادھر وہ کہہ کر ادھا جاسے۔ میں بڑبڑا کر غائب کر دیتی تھی۔

اُس کے اس رویے نے نیچے اتنا پریشان کر دیا کہ میں نے اُسے جھنجھلا کر کہا۔ ”اگر تمہیں اپنے بیٹے کا اتنا زیادہ خیال نہ تو پہنچے ہی کہ دیتیں کہ وہ لڑکپن میں گھر سے غائب ہوا اور پھر کبھی نظر نہیں آیا۔ اب جو میرے بچپان میں وہ صبح صبح بتا دو، ورنہ میں اُسے خود کچڑوں کا ورم ساری عمر بچھاتی رہوں گی۔“

یہ دراصل میری اُستادی کا ذخیرہ تھا کہ وہ میری جذباتی باتوں میں اگتی اور اپنے بیٹے کی کہانی سناتی تھی۔ اب اُسے شک ہو گیا تھا کہ میں اس کے بیٹے کو قتل کے جرم میں گرفتار کرنا چاہتا ہوں۔

”اگر وہ تمہیں پرسوں ترسوں ملا بھی تھا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ قتل اُسی نے کیا ہے۔ میں نے کہا۔“

”پھر آپ کیوں بار بار پوچھتے ہیں؟“ اُس نے کہا۔ ”میں جو کہتی ہوں کہ اُس نے قتل نہیں کیا۔ وہ گھر میں آیا ہی نہیں۔“

”میں کس طرح مان لوں۔“ میں نے کہا۔ ”میرے پاس گواہیاں ہیں جو بتاتی ہیں کہ قتل کے روز اور اس سے ایک روز پہلے وہ یہاں تھا اور وہ تمہیں ملا ہے۔“

اُس نے میرے منہ کی طرف دیکھا اور عجیب سی سکاہٹ سے بولی۔ ”ماں مولیٰ چڑھ جائے گی اپنے بچے کو بھگڑائیوں میں نہیں دیکھ سکے گی۔“

یہ الفاظ اُس نے جذباتی ہو کر کہے تھے لیکن میرے لیے بڑے قیمتی تھے۔ اس کے

بعد میں نے اس کے منہ سے کام کی کوئی ایک دو باتیں نکلوانے کے لیے سوالوں کی جو بوچھاڑ کی اس میں اُس نے میری یہ توقع تو پوری نہ کی کہ کوئی نشاندہی کر دیتی۔ البتہ اُس نے جس انداز سے جواب دیئے اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ وہ اپنے بیٹے کو بچانے کی کوشش کر رہی ہے۔ مجھے یہ شک بھی ہوا کہ اپنے خاوند کو اُس نے خود اپنے بیٹے کے ہاتھوں قتل کر لیا ہے۔ وہ کوئی جرائم پیشہ یا مخمر عورت نہیں تھی۔ میں نے اُس پر دہشت پیدا کرنے کے لیے اُسے کہا کہ وہ دو چار روز تھانے میں ہی رہے گی۔ اسے بھی میں گرفتار نہیں کر سکتا تھا اور چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ اُسے الگ بٹھا دیا۔ گھر کی عورت کے لیے تھانے میں بیٹھنا ہی بہت بڑی سزا ہے، مگر مجھے اب یہ ثبوت نہیں مل رہا تھا کہ یہ عورت واقعی شریف ہے۔

میں کمرے سے باہر نکلا۔ اس عورت کا دوسرا بھائی آیا ہوا تھا۔ ایک کو تو میں نے مشتبه بٹھا رکھا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل بھی آگیا تھا جو دوسری بیوی کی سہیلی سے پوچھنے گیا تھا کہ اُس نے اُسے کوئی پیغام بھیجا تھا یا نہیں۔

اس سہیلی نے بتایا کہ اُس نے ایسا کوئی پیغام نہیں بھیجا تھا کہ وہ (دوسری بیوی) شام کے بعد اُس کے گھر آئے اور کسی کمرہ تھنڈے لائے کیونکہ کوئی ضروری بات کرنی ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ بھوکو نام اور شکل سے جانسی پہچانتی ہے وہ اس کے گھر نہیں آتی تھی۔ اگر ضرورت ہوتی بھی تو وہ اس کی زبانی اپنی کسی بھی سہیلی کو پیغام نہ دیتی کیونکہ آبا جیوں نے گھروالوں سے کہہ رکھا ہے کہ بھوکو نام اور بدکار عورت ہے، اسے گھر میں نہ بیٹھنے دیا کرو۔

یہ بیان سن کر میں پہلی بیوی (آسی کی ماں) کے بھائی کی طرف متوجہ ہوا۔ اُس کے آنے کی وجہ صاف تھی۔ اس کا ایک بھائی پہلے ہی تھانے میں تھا۔ اب میں نے اس کی بہن کو بھی بلالیا تھا اور رات خاصی گزر گئی تھی۔ یہ بھائی مولوی قسم کا شریف انسان تھا، بہت ہی

پریشان تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ان دونوں کو قہر کے سلسلے میں روکا جواسے اور میں کہ نہیں سکتا کہ کب تک روکے کھول گا۔ اس سے میں نے پوچھا کہ اسی کو اس نے پسوں ت۔ یہاں دیکھا ہوگا۔ میں نے اُسے کہا۔ ”میں نے سنا ہے کہ اسی غنہ دہ بدعاشوں میں اٹھنا بیٹھا ہے۔ وہ اگر کوشش کرے تو قاتل کا اور دوسری بیوی کا سر کاٹ سکتا ہے۔“

میں نے کچھ اور باتیں بھی کیں جن سے یہ سیدھا سادا آدمی میرے حال میں اگیا۔

”ہم تو جی اسی سے منہ لگاتے بھی شرماتے ہیں۔“ اُس نے کہا۔ ”ہم میں سے کسی کو بھی علم نہیں کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ اس حادثے سے دو روز پہلے وہ مجھے ملا تھا۔ پریشان سا نظر آتا تھا۔ کتا تھا کہ ماں کی زندگی اس شخص (مقتول) نے تباہ کر دی ہے۔ اسی نے مجھے بھی بعض طعن کی تھی اور کہا تھا کہ تم اُس کے دو بھائی ہو اور ایک آدمی کو نہیں سنبھال کے۔ مجھے ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ماں سے مل آیا ہے اور اُس کے خاوند سے بھی ملا ہے۔ میں نے اُسے تسلی بخشی دے کر بھیج دیا اور اُس کے دوسرے بھائی کے پاس گیا جہے میں نے مشتبہ بھڑا رکھا تھا۔ اُس سے اسی کے متعلق پوچھا۔ اُس نے بھی وہی کہانی سنائی جو میں سن چکا تھا۔ اس شخص کا دماغ ٹھکانے آچکا تھا۔ وہ منت سماجت پر اتر آیا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اسی دو روز پہلے آیا تھا اور اُسے بھی ملا ہوگا۔

اُس نے فرما دیا کہ ملا تھا۔ اسے بھی اسی نے وہی باتیں کہی تھیں جو اُس نے اپنے دوسرے ماموں سے کہی تھیں۔ اس آدمی نے یقین سے کہا کہ اسی اپنی ماں کے پاس گیا تھا اور ٹھٹھے میں تھا۔ اُس نے یہ الفاظ کہے تھے۔ ”تم دونوں بھائی بزدل اور بے غیرت ہو۔ ایک

آدمی کا دماغ دُست نہیں کر سکتے۔“

”اب یہ مجھول جاؤ کہ اسی تمہارا کچھ لگتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے یہ تباؤ کہ اسی میں اتنی ہمت ہے کہ وہ کسی کو قتل کر دے؟“

”جناب یہ نہ بھیں کہ میں اپنی جان چھڑانے کے لیے کہ رہا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اسی کے اندر زہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اُسے قریب نہیں آنے دیتے۔ وہ ایک نہیں ایک درجہ آدمیوں کو قتل کر سکتا ہے، لیکن ایک شرط ہے کہ اسے یہ کہہ دو کہ ایک دُرجن آدمی تمہاری ماں کے دشمن ہیں۔ اپنی ماں کے خلاف ہمارے منہ سے بھی بات نہیں سُناتا۔ اُس نے کئی ایک واقعات سُنائے۔ میں صرف یہ سُننا چاہتا تھا کہ اسی قتل سے پہلے شہر میں آیا تھا۔ یہ میں نے سُن لیا اور شبو کو اپنے دفتر میں بلا لیا۔

پروے اٹھنے لگے تھے۔ اب شبو مجھے جکمر نہیں دے سکتی تھی۔

اندھے خاوند کی بیوی مان گئی

شبو نے میرے سامنے آتے ہی دوستانہ تہ تکلفی کی باتیں شروع کر دیں جیسے کچھ پڑا ہی نہیں۔ میں نے اُسے مایوس نہیں کیا۔ دوستانہ تہ تکلفی سے ہی میں نے اس سے پوچھا۔ ”کیا نام ہے اُس لڑکی کا جس کا پیغام لے کر تم مقتول کی دوسری بیوی کے پاس گئی تھیں؟“ اُس نے جواب تو نہ دیا۔ لاعلمی کے اظہار کے لیے چہرے پر حیرت کا تاثر پیدا کر کے میرے منہ کی طرف دیکھنے لگی۔

میں نے ہنس کر کہا۔ ”شبو! جانے دو۔ آؤ اب کام کی باتیں کریں۔ نائک کھیلنا چھو۔ دو۔ تم اکیلی کتنے آدمیوں کو جھٹلاؤ گی۔ اب میری تمہاری باتیں ہوں گی۔ کوہ سلطانی گواہ بنتی ہو؟“

”اُس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں ساری واردات میں شامل ہوں۔“ اُس نے کہا۔ ”میں نے اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں کیا کہ لڑکی کو گھر سے باہر نکالنے کی ترکیب کی اور اسے ایسے راستے پر ڈالا جہاں اسے اٹھا لے جائے۔“ اُسے موجود تھے۔ آپ مجھے گواہ نہیں بنا سکتے؟“ وہ مجھے اور پولیس کو جانتی تھی اور اُس نے دیکھ لیا تھا کہ اب اُس کا جھوٹ نکالنا ہو گیا ہے اور جیسا سچیتا کی گئی تھی نہیں رہی۔ وہ مجھ سے اب رحم اور رعایت چاہتی تھی جو میں دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

”آپ اچھی طرح جانتے ہیں؟“ راہنشاہ نے کہا۔ ”میں نے آپ کے لیے جھوٹ بولے ہیں اور آپ کا کام اُنسان کیا ہے۔ اب آپ میرے اندر سے خاوند پر رحم کریں اور مجھے اس پکڑ سے نکالیں۔“

اُس نے جو کچھ کہا تھا ٹھیک کہا تھا۔ اُس نے میرے لیے بہت جھوٹ بولے تھے۔ ”مجرب اور سراغ رسانی کے لیے ایکٹنگ بھی کرنی پڑتی ہے اور جھوٹ بھی بولنے پڑتے ہیں۔“ شبکو کا خاوند شادی کے چھ ساتویں سال جیکپ کا شکار ہو گیا۔ اُس کی جان تو بچ گئی، دونوں آنکھیں نشان بھونگی ستیں۔ اُس وقت اس کے دو بچے تھے۔ شبکو کا کمال تھا کہ اس نے بچوں کی روزی اپنے فتنے سے لی اور اسے جیسی کیسی محنت مزدوری ملی اس نے کرنی اور اپنی عزت کی بھی حفاظت کی۔ اب اس کے چار بچے تھے اور عمر تیس سال سے زیادہ ہو گئی تھی۔ چار ایک سال تھے اُس نے مجرب کی کام سنبھالا تھا۔ اس کام میں اُس نے مہارت حاصل کر لی۔ بدنامی قدرتی بات ہے۔ اس کی چرب زبانی اور ایکٹنگ نے اسے بدنام کر رکھا تھا لیکن اُس نے اپنے خاوند کو دھوکہ نہیں دیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے ایک واردات میں مجرم کو مدد دی اور مجھے پکڑ دینے کی کوشش کی تھی۔ اُس نے صاف بتا دیا کہ اُدھر سے

(مجرموں سے) اسے زیادہ رقم ملی تھی۔ کام صرف یہ تھا کہ لڑکی (مقتول کی بیوی) کو اس کی کسی ایسی سہیلی کا پیغام دینا تھا جس کے بلاوے کو وہ ٹال نہ سکے۔ شبکو نے یہ کمال کر دکھایا کہ پہلے یہ معلوم کیا کہ دوسری بیوی کی سب سے زیادہ عزیز سہیلی کون سی ہے۔ پھر اس نے پیغام ایسا دیا کہ لڑکی شام کے بعد گھر سے نکل گئی۔

لڑکی کو اٹھا لے جانے والے دو آدمی تھے۔ ایک اُسی اور ایک اس کا ساتھی شبکو اُسی کو جانتی تھی۔ یہ شبکو کی ڈیوٹی میں شامل تھا کہ زیادہ سے زیادہ جرائم پیشہ اور مشتبہ کردار کے افراد سے اس کی واقفیت ہو۔ اسی سلسلے میں اس کی ملاقات اُسی سے ہوئی تھی۔ شبکو کو معلوم تھا کہ اُسی کون ہے اور اب کیا کرتا ہے۔ شبکو نے مجھے اپنے اقبالی بیان میں بتایا کہ قتل سے دو تین روز پہلے اسے اُسی ملا تھا۔ اُس نے شبکو کو اعتماد میں لے کر کہا تھا کہ وہ اپنے سوتیلے باپ کی دوسری بیوی کو غائب کرنا چاہتا ہے۔ اس نے شبکو سے مدد مانگی اور خاصی رقم پیش کی تھی۔ شبکو نے اس کی مان کے مان جاکر معلوم کیا اور اُسی کو بتایا تھا کہ دوسری بیوی میکے گئی ہوئی ہے اور دو چار روز بعد واپس آئے گی۔ دوسرے دن اُسی اسے پھر بلا اور بتایا کہ آج شام کے بعد وہ دو وارداتیں کرے گا۔ اس نے دوسری واردات کے متعلق شبکو کو نہیں بتایا تھا کہ وہ کیا ہوگی۔

اُسی کے متعلق مجھے اپنے قصبے کے جرائم پیشہ افراد نے بتایا تھا کہ وہ ابھی بڑی واردات کرنے کے قابل نہیں ہو اور وہ استادوں کی مرث مدد کرتا ہے لیکن جس جاکد ستی اور لڑادی سے اُس نے بیک وقت دو وارداتیں کیں انہوں نے مجھے منوالیا کہ اُسی سچے کار استاد ہے۔ یہ انگ بات ہے کہ وہ تھانے کے ریکارڈ پر نہیں تھا اور ابھی تک وہ کسی واردات میں گرفتار نہیں ہوا تھا۔ اُس کا گروہ مضبوط تھا جو شاید اسے پہلی وارداتوں میں محفوظ رکھتا رہا ہو۔ اس

کی ان دو وارداتوں کی میں باریک تفصیلات سُنانے سے گریز کروں گا کیونکہ یہ بہت طویل ہیں اور طوالت کے علاوہ میں کسی کو وارداتیں کرنے کی ٹریننگ نہیں دینا چاہتا۔ اُس نے دونوں کے اوقات کی ایسی پابندی کی کہ بولوں میں کامیاب رہا۔

شبو نے بتایا کہ اسے یہی کہہ سکتا تھا کہ اُس کے ساتھ ایک آدمی اور بھی تھا۔ اُس نے اسے نہیں دیکھا۔ اُس نے لڑائی کی سہیلی کا جھوٹا پیغام دیا جو اس قسم کا تھا کہ وہ کوئی ذوقی بات کرنا چاہتی ہے اور کبھی نہ کہہ سکتی تھی۔ وہ گہری اور ہمارے سہیلیاں تھیں شیو نے ایسے انداز سے اسے حال میں یہ سنا تھا کہ لڑکی اندھیرے راستے پر چلی گئی اور واپس نہ آ سکی دوسرے دن شبو کو پتہ چلا کہ اس لڑکی کا پچاس سالہ خاوند بھی قتل ہو چکا ہے۔ یہ یاد آیا کہ اُسے اسے کہا تھا کہ وہ دو وارداتیں کرے گا۔ اُسے یقین تھا کہ قتل بھی اُسی نے کیا ہے۔ میں نے شبو کو جرح اور سوال در سوال کی چمکی میں پسینا شروع کیا۔ بہت زیادہ وقت صرف کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ قتل کی واردات میں ملوث ہونے سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی مگر جو کچھ بتا چکی تھی اس سے زیادہ میں اس سے نہ اٹھوا سکا۔ مقدمہ قائم کرنے کے لیے مجھے جن باتوں کی ضرورت تھی وہ معلوم کر لیں۔

اب میرے سامنے یہ سوال تھا کہ ان دونوں وارداتوں میں اُس کی ماں کا بھی ہاتھ ہے یا نہیں۔ یہ سب بھی تھا کہ اُس کے اس ماموں کا ہاتھ بھی ہو سکتا ہے جسے میں نے مشتبہ ٹھہرا تھا۔ مجھے اُس کی کوئی ڈھونڈنا تھا۔ یاد نہیں کہ قتل اور اغوا کے بعد کا چوتھا دن تھا یا زیادہ دن گزر گئے تھے۔ میرے پاس مہتر پوسٹ مارٹم رپورٹ آگئی۔ ماہرین نے لکھ دیا تھا کہ موت حرکت قلب بند ہونے سے نہیں سانس رکھنے سے واقع ہوئی ہے اور قتل کھانے کے ڈیڑھ یا دو گھنٹے بعد ہوا ہے۔

میں نے اُس کی ماں کو اُس مخصوص کمرے میں بٹھالیا جہاں پتھر بھی بول پڑتے تھے۔ میں نے اُسے کہا کہ اب اسے دل کے بھید باہر لانے ہی پڑیں گے۔ وہ کہہ چکی تھی کہ قتل سے ایک دو روز پہلے اُس کے پاس نہیں آیا تھا اور اُسے دیکھتے بہت عرصہ گزر گیا ہے۔ وہ ابھی تک اسی بیان پر قائم تھی۔ میں نے اپنے اسے۔ ایس۔ آئی سے کہہ دیا کہ وہ ضرورت کے مطابق پارٹی لے جائے اور اُس کو تلاش کرے۔ اُس کے گروہ کے ٹھکانے کا کچھ اتنا معلوم ہو گیا تھا۔ دورا ہٹاؤں کا انتظار تھا۔ وہ ابھی نہیں آئے تھے۔ انہیں ایک گاؤں سے آنا تھا۔ میں نے آدھی رات کے کچھ دیر بعد تک مقول کی پہلی بیوی سے پوچھ گچھ جاری رکھی۔ اُس کی حالت بہت ہی بُری ہو چکی تھی۔ میں نے اس پر کوئی تشدد نہیں کیا۔ یہی اذیت اس کے لیے ناقابل برداشت تھی جس میں وہ مبتلا تھی۔ میں حیران تھا کہ وہ برداشت کر رہی تھی۔ اُس کی قوت تھی۔ اگر اُسے اس کا بیٹا نہ ہوتا تو وہ فوراً اقبال جرم کر لیتی۔ آخر اس نے یہ کہنا شروع کر دیا۔ ”میرے بیٹے کو موت ڈھونڈو۔ مجھے سولی پر لٹکا دو۔“ اُس پر غشی کی کیفیت بھی طاری ہو رہی تھی۔ اس حالت میں بھی وہ میرے مطلب کی بات منہ سے نہیں نکال رہی تھی میری اپنی حالت بگڑ رہی تھی۔ ممکن نے جسم اور دماغ کو بیکار کر دیا تھا میں نے اسے اسی کمرے میں سونے کو کہا اور ایک کانشیل کو پہرے پر کھڑا کر دیا۔ ابھی میں اسے حوالات میں بند نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں گھر جا کر سو گیا۔

ماں کی محبت اُسے لے آئی

اگلے روز دفتر میں پہنچا۔ اے۔ ایس۔ آئی اپنی پارٹی کے ساتھ روانہ ہونے والا تھا۔ دونوں رہنمات کو یہی آگئے تھے۔ میں اس پارٹی کو ہدایات دے رہا تھا کہ ایک جوان آدمی

برآمدے میں داخل ہوا۔ جسم بھرا ہوا تھا اور چہرہ بتاتا تھا کہ وہ کوئی شریف آدمی نہیں۔ وہ
 محبت کا مطلب نہ کہ بکرا بلکہ ”میری ماں کو چھوڑ دو اور مجھے گرفتار کر لو۔ تم نے مجھے گرفتار کرنے
 کا بڑا اچھا طریقہ اختیار کیا ہے۔ اگر تم میری ماں کو تھکانے نہ بلاتے تو تم سب میری گردن کو بھی نہ
 دیکھ سکتے۔“

”تم آسی ہو تو؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں میں آسی ہوں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”اپنے سوتیلے باپ کو میں نے قتل
 کیا ہے۔ اور اُس کی بیوی کی لاش۔“ جال کر رکھ دیا ہوں۔ میری ماں کو میرے سامنے رکھا
 دو۔ ورنہ تمہارے ہاتھوں مر جانوں گا۔ بتاؤں گا کچھ سچی باتیں۔“

میں اسے اپنے دفتر میں لے گیا۔ بٹھایا اور اسے کہا کہ میں نے اس کی ماں کو شک
 میں روکا ہوا ہے۔ اس نے کہا کہ میں تمہارے تمام شکوک رفع کر دوں گا۔ میری ماں کو چھوڑ دو۔
 میں نے اس کی ماں کو بلوایا۔ وہ آئی تو اپنے بیٹے کے ساتھ لپٹ گئی۔ آسی نے کہا۔
 ”تم کو مجھ ذاتی باتیں تمہیں چھڑانے آیا ہوں۔“

میں نے دھل انداز میں نہ کی۔ ماں بھاگ کر کہاں جا سکتی تھی۔ وہ وہاں سے جا بھی
 نہیں رہی تھی۔ کہتی تھی کہ بیٹے کے ساتھ جاؤں گی۔ میں نے اسی بھانے اسے دوسرے کمرے
 میں بٹھا دیا۔

آسی نے مجھے کہا۔ ”تم نے میرے ایک ماموں کو بھی بٹھا رکھا ہے۔ اسے بھی چھوڑ
 دو۔ وہ تیرے غیرت اور بزدل آدمی ہے۔ وہ کسی کو کیا قتل کرے گا۔ اسے بھی بلاؤ۔“

”سُنو آسی!“ میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”پولیس کپتان
 بلانے کی کوشش نہ کرو۔ مجھ پر حکم چلانے آئے ہو۔ میری ماں کو چھوڑ دو۔ میرے ماموں کو چھوڑ

دو۔ تم تھکانے میں بیٹھے ہو۔ کہاں کے استاد ہو؟ میں تمہاری ماں کو حالات میں بند کروں گا۔
 شب تو پہلے ہی میرے پاس ہے۔ تمہارے خلاف شہادت مکمل ہے۔ یہ دونوں وارواہیں تمہاری
 ماں نے تم سے کوئی ہیں۔ تم مجھے کچھ بھی نہ بتاؤ۔ تم اس وقت نہ آتے تو کل اس وقت بھنگڑیوں
 میں بندھے ہوئے میرے پاس آ جاتے۔ تمہاری ماں کو میں عمر قید دلاؤں گا۔“ میں دانستہ
 اس کی ماں پر زور دے رہا تھا۔ میں جان گیا تھا کہ یہ شخص اپنی ماں کو چھڑانے کے لیے خود ہی
 اقبال جرم کرنے لگیا ہے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ اپنی ماں کی پوجا کرتا ہے۔ اپنی ماں کی خاطر وہ
 اپنے آپ کو مہاسنی چڑھانے کے لیے لگ گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اُس نے اقبالی بیان کھونا شروع کر دیا۔ اُس نے اپنے بچپن کے
 وہی حالات سناتے جو میں آپ کو سنا چکا ہوں۔ سوتیلے باپ نے اُس پر جو ظلم کیے وہ بھی
 آپ کو سنا چکا ہوں۔ اس شخص کے خلاف آسی کے دل میں اتنی نفرت پیدا ہو گئی تھی کہ
 اسے وہ قتل کرنا چاہتا تھا۔ اسی کے مظالم نے اسے گھر سے بھگایا تھا۔ وہ پہلے آوارہ لڑکوں کے
 ساتھ اُٹھتا بیٹھتا رہا۔ پھر وہ جواروں کی منڈلی میں گیا اور وہاں سے وہ رہزنیوں اور ڈکیتوں کے
 ایک گروہ میں جاشامل ہوا۔ شہر میں وہ کبھی کبھار آکر رہتا تھا۔ وہ صرف ماں سے ملنے آتا تھا۔
 اس دوران سوتیلے باپ کے ساتھ اس کی جھڑپ بھی ہوئی۔ اُس نے کہا۔ ”دنیا میں صرف
 ماں ہے جسے میں خدا اور رسول کے بعد کا درجہ دیتا ہوں۔ سوتیلے باپ وہ انسان تھا جسے
 میں تحارت کی نظر سے دیکھتا تھا اور دنیا کا کوئی انسان مجھے بُرا نہیں لگتا۔“

اس نے اپنی کسی واردات کا ذکر نہیں کیا۔ اپنے گروہ کی نشاندہی نہ کی۔ اس کی
 سرگردمیاں بھی نہ بتائیں۔ اس نے کہا کہ وہ ڈیڑھ دو مہینے گزرے ماں سے ملنے آیا تو ماں نے
 اسے بتایا کہ اس کا سوتیلے باپ دوسری شادی کر رہا ہے۔ آسی کو بہت غصہ آیا۔ وہ سوتیلے

رقم بعد میں دینے کا وعدہ کیا۔

اُس نے انتقام لے لیا

شبوت نے یہ کمال کر دکھایا اسی نے اُسے بتایا تھا کہ آج رات اُس کی ماں شادی کی کسی رسم پر جا رہی ہے اور اُس کا سوتیلا باپ صحن میں اکیلا سویا ہوا ہوگا۔ اُسی نے اپنے گروہ کے ایک ہوشیار دوست کو ساتھ لیا اور اسے یہ سکیم بتائی۔ اس کا دوست تیار ہو گیا۔ اسے اُسی نے لڑکی کے انوار کا کام دیا اور اسے بتایا کہ اسے کہاں گھات لگانی ہے۔ قصبے کا معاملہ تھا۔ لوگ جلدی سو جاتے تھے۔ آبادی کی یہ بھر مار نہیں تھی جو آج ہے۔ شبوت نے اُسے بتایا کہ وہ دوسری بیوی کو پیغام دے آئی ہے۔

شام کے بعد اُسی نے ایک جگہ چھپ کر دیکھا۔ اُسے اپنی ماں شادی والے گھر جاتی نظر آئی۔ محتوڑی دیر بعد اُس نے گھر کے باہر والے دروازے پر ہاتھ رکھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ باہر والی دیوار کی طرف گیا۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ اُس وقت وہ چرس والا گریٹ پی رہا تھا۔ گلیاں سنسن پڑی تھیں۔ وہ گھوم کر دوسری طرف گیا مگر گریٹ دیوار کے ساتھ بچھا کر چھپ گیا۔ جوتے اتارے اور دیوار پر پاؤں جھکا کر چڑھ گیا۔ سر اوپر کر کے اُس نے صحن میں دیکھا۔ اُس کا سوتیلا باپ سویا ہوا تھا۔ اُسی دیوار سے کودا نہیں تاکہ آواز پیدا نہ ہو۔ وہ پاؤں جھکا کر دیوار سے اُترا۔

سوئے ہوئے سوتیلے باپ کے سر ہانے کی طرف جاکر اُس نے ساتھ والی چار پائی سے نکلیہ اٹھایا اور سوتیلے باپ کے منہ پر رکھ کر اوپر اس طرح بیٹھ گیا کہ دونوں گھٹے تکیے کے اوپر رکھے اور ہاتھ اپنے منہ کے سینے پر رکھ کر جسم کا پورا وزن ڈال دیا۔ مقبول بہت

باپ سے ملا اور اُسے شادی سے روکا۔ پھر اُسے دھکی بھی دی۔ آخر سوتیلے باپ نے دوسری شادی کر لی۔ اُسی شادی کے بعد ماں کو دیکھنے آیا تو ماں رو پڑی۔ یہ اُسی کی برداشت سے باہر تھا۔ اُس نے ننھی بیوی کو بھی دھکا دیا۔ ماں نے اسے کہا تھا کہ اس کے سوتیلے باپ نے اس کی مرضی سے شادی کی ہے۔ اور ماں کو کوئی شکایت نہیں لیکن اُسی کے دل میں ماں کے آنسو بیٹھ گئے تھے۔

اُس نے قتل کی سکیم اُسی وقت بنائی شروع کر دی تھی۔ اُس نے کئی طریقے سوچے مگر کامیاب ہو نہ سکا۔ اُن کی نظر نہیں آتا تھا۔ کسی کی معرفت اس کی ملاقات شبوت سے ہو گئی۔ شبوت بھی جہرام پیشہ لوگوں کی پُراسرار دنیا سے تعلق رکھتی تھی۔ شبوت کے متعلق اسے بتایا گیا کہ اپنے اندر سے خاوند اور بچوں کے لیے پاڑ بیل رہی ہے۔ اُسی کو شہوا چھی لگی۔

قتل سے دو تین روز پہلے اُسی پھر شہر آیا۔ ماں کے پاس گیا۔ باتوں باتوں میں ماں نے اسے بتایا کہ فلاں رات وہ فلاں گھر شادی پر جا رہی ہے۔ دوسری بیوی کے متعلق اُسے پتہ چلا کہ اپنے منیکے گئی ہوئی ہے۔ اُسی کو اتنی خوشی ہوئی جیسے وہ اسی رات کے انتظار میں تھا۔ وہ اپنے استاد کے پاس گیا اور اُسے بتایا کہ یہ حالات ہیں اور وہ اپنے سوتیلے باپ کو قتل کرنا چاہتا ہے۔

استاد نے اس کی ساری کہانی سُن کر ایک تو اسے قتل کا طریقہ بتایا اور یہ مشورہ بھی دیا کہ دوسری بیوی کو اگر نائب کر سکو تو کوٹ اور پولیس یہ یقین کر لے گی کہ دوسری بیوی اپنے بڑے خاوند کو قتل کر کے یا کر کے اپنے کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ اُسی کو یہ مشورہ بہت پسند آیا۔ وہ اگلے روز شہر میں آیا۔ شبوت سے ملا۔ اُس کے ساتھ یہ سکیم بنائی کہ وہ ننھی بیوی کو شام کے بعد گھر سے باہر لے آئے۔ اُس نے شبوت کو کچھ رقم نقد دی اور باقی

تڑپا۔ وہ جب بے حس ہو گیا تو اسی نے اس کی نبض اور دل کی حرکت دیکھی۔ یہ یقین کر کے کہ وہ مر گیا ہے اُس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ گھوم کر وہ پھر دیوار کی طرف گیا۔ جوتے پہنے اور بہت تیز چلتا برساتا نا۔ کچھ پار دوسری سوئی کی آبادی میں گیا۔ اس لڑکی کی قسمت بہت ہی بُری تھی۔ وہ شام بہت ہی گھرتے نکلنے کی بجائے ویر سے نکلی، اتفاق دیکھیں کہ وہ اُس وقت اُس جگہ پہنچی، یہاں اسے اغوا ہونا تھا جب اسی بھی پہنچ چکا تھا۔ اسی نے لڑکی پر پکھیس بھینکا، پھر اُس نے منہ پر ماتھہ رکھا اور اپنے ساتھی کے ساتھ مل کر انہوں نے لڑکی کو اُٹھایا۔

آبادی سے دور جا کر انہوں نے لڑکی کو چلنے پر مجبور کیا۔ صبح تک وہ لڑکی کو اپنے خفیہ ٹھکانے تک پہنچا چکے تھے۔ اسی کو اپنی ماں کے متعلق فکر تھا۔ وہ گلی شام شہر میں آیا اور پولیس کی سرگرمی دیکھتا رہا۔ اُس نے کب مجرب کو بھی استعمال کیا تھا۔ پھر اسے پتہ چلا کہ اس کی ماں کو تھانے بلا گیا ہے۔ اُس نے تھانے پر نظر رکھی۔ میرے کسی تجربے سے اُسے بتایا تھا کہ اس کی ماں کو تنگ میں حراست میں لے لیا گیا ہے۔ اور تھانہ دار کہتا ہے کہ خاندان کو اس عورت نے قتل کیا ہے۔ اس نے کسی کی معرفت میرے کسی کانسٹیبل سے ماں کے متعلق پتہ کر لیا کہ کانسٹیبل نے اُسے بتایا کہ اس کی ماں اب پہنچ نہیں سکتی۔ وہ تفتیش کے کام میں ہے اور بہت بُری حالت میں ہے۔ اسی نے رات کے وقت لڑکی کا گلا گھونٹ کر اُسے مار دیا اور ایک کموہ میں لاش رکھ کر اگے خمار دار جھاڑیاں اور درختوں کی ٹہنیاں رکھ دیں۔ صبح وہ میرے پاس پہنچ گیا۔

میں نے اسے گرفتار کر لیا۔ اس کے ساتھ جنگل میں جا کر لڑکی کی لاش برآمد کی اور اسی کو جو بٹریٹ کر کے اُسے اقبالی بیان مینے کے لیے تیار کیا۔ اُس نے مقدمہ تیار کرنے میں

میری پوری مدد کی اور یہ بھی ثابت کر دیا کہ ان دونوں وارداتوں کا اس کی ماں کو یا کسی ماموں کو علم نہیں تھا۔

میں نے اس کی ماں کو چھوڑ دیا۔ ماموں کو بھی چھوڑ دیا، اور میں نے اسی سے کہا کہ میں شبکو کو بھی چھوڑنا چاہتا ہوں۔ وہ جس خلوص سے اپنے اندھے خاندان کی خدمت کر رہی تھی اور جس طرح بچوں کو پال رہی تھی میں اس کا اسے صلہ دینا چاہتا تھا۔ اسی بہت خوش ہوا۔ اُس نے کہا کہ وہ اپنے بیان میں یہ بتائے گا ہی نہیں کہ شبکو کو لڑکی کے اغوا میں استعمال کیا گیا تھا، بلکہ کہنے کا کہ لڑکی کو گھر سے اُٹھانا تھا لیکن اتفاق سے وہ راتے میں مل گئی۔ اُس نے مجھ سے یہ شرط منوائی کہ اس کے ساتھی کو قدمے میں شامل نہ کیا جائے۔

اُس نے عدالت میں جا کر بھی مجھے پریشان نہ کیا۔ سیشن کورٹ نے اسے سزائے موت سنائی جو اپیل میں بھی برقرار رہی اور ایک صبح اسی کو پھانسی چڑھا دیا گیا۔

ماتا کے سپوت

ایک ایک چاقو دونوں کے
پاس تھا۔ وہ ریلوے اسٹیشن
چلے گئے۔ انہیں بہن اُس وقت
نظر آئی جب گاڑی چل پڑی۔

کہانی ان سے مختلف ہے۔ انہی لوگوں کی سرانجامی اور گرفتاری کے لیے ایک توسیعی ڈی کا محکمہ تھا۔ دوسرا سول انٹیلی جنس کا اور تیسرا ملٹری انٹیلی جنس کا، اور اسی کے اندر انگریزوں نے ایک اور شعبہ بنادیا تھا جس میں زیادہ تعداد انگریز پولیس افسروں کی تھی۔ بعد میں اس میں ایسے دیسی افسر بھی لے لیے گئے تھے جو فرض کے پکے تھے اور جن پر بھروسہ کیا جاسکتا تھا۔ انگریزوں کو شک ہو گیا تھا کہ ہندوستانی پولیس بھی دہشت پسندوں کی مدد کرتی ہے۔ یہ شک اس لیے پیدا ہوا تھا کہ تین چار دہشت پسند جادو گروں کی طرح پولیس کی حراست سے فرار ہو گئے تھے۔ اس کے ذمہ دار پولیس افسروں اور دیگر عملے کو دس سال سزائے قید دی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک اور خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ ۱۹۳۹ء کے آغاز میں ہی یقین ہو گیا تھا کہ جرمنی نے جنگی تیاریاں مکمل کر لی ہیں۔ ہٹلر کے بیان دیکھی آئیز ہو گئے تھے، اس لیے جنگ ناگزیر ہو گئی تھی۔ انگریزوں کو معلوم تھا کہ ہٹلر نے جرمنی کو بہت بڑی جنگی طاقت بنا دیا ہے اور وہ ہندوستان پر حملہ کرنے کی بھی ہمت رکھتا ہے۔ جرمنی کے متعلق یہ بھی انگریزوں کو معلوم تھا کہ اُس نے یورپ کے ممالک میں برطانیہ اور افریقہ میں اور ہندوستان میں بھی جاسوس بھیج رکھے ہیں۔ خطرہ یہ تھا کہ جرمنی کا محکمہ جاسوسی ہندوستان کی دہشت پسند تحریکوں کو اپنے زیر اثر کرے کہ انہیں ٹریننگ اسلحہ اور مالی مدد دے گا یا دے رہا ہوگا۔ اس کی روک تھام کے لیے بھی اس شعبے کی ضرورت تھی جس میں مجھے عارضی طور پر بھیجا گیا تھا۔ میرے لیے یہ ایک اعزاز تھا جو مجھے اس صلیب دیا گیا تھا کہ میں نے مختلف تحائف میں رہ کر تین ایسی وارداتوں کے مجرم پکڑ لیے تھے جنہیں انگریز نا ممکن قرار دے چکا تھا۔

اس شعبہ کا ہیڈ کوارٹر دہلی میں تھا۔ دہلی سے چالیس بیالیس میل دور کمرنگ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ میں اس علاقے کے تحائف میں ایک قسم کے دورے پر تھا۔ ہر ایک تحائف کے لیے اپنا

یہ واردات دوسری جگہ۔ غلیم سے چند ماہ پہلے کی ہے۔ میں عارضی طور پر سی آئی ڈی کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ یہ عام قسم کی سی آئی ڈی نہیں تھی بلکہ اس محکمے کے اندر ایک اور شعبہ بنایا گیا تھا جس کا رابطہ ملٹری انٹیلی جنس کے ساتھ بھی تھا۔ آپ شاید سن کر حیران ہوں گے کہ عام پولیس بھی اس شعبے سے ناواقف تھی۔ یہ تو آپ کو معلوم ہو گا کہ بہت عرصے سے ہندوستان میں غازیہ تحریکیں چل رہی تھیں جنہیں دہشت پسند کہا جاتا تھا۔ ان میں ہندو بھی تھے۔ مسلمان اور سکھ بھی۔ ان تحریکوں کا مقصد یہ تھا کہ انگریزوں کو دہشت زدہ کر کے ہندوستان سے نکال دیا جائے۔ ابتدا میں ان میں بنگالی زیادہ تھے۔ بعد میں ہندوستان کے کئی اور صوبوں کے لوگ ان میں شامل ہو گئے تھے۔ پنجابی جو شیعہ جوائوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ ان کی غازیہ تحریک قابل تعریف تھیں۔ انہوں نے دہشت گردانہ کارنامے کرنے کے لیے اُس کی ریل گاڑی کے نیچے بم رکھے تھے۔ کئی اور ایسے جگہوں پر بم رکھے اور انگریزوں کو نقصان پہنچایا تھا۔ ان میں سے جو کچھ جاتا تھا وہ سیدھا پنجابی کے تختے پر جاتا تھا لیکن انہیں پکڑنا آسان نہیں تھا۔ ان کا طریقہ کار نہایت خفیہ تھا۔ ان کا آپس میں پشاور سے کلکتہ تک رابطہ تھا۔

میں آپ کو دہشت پسند تحریکوں کے بے شمار حیران کن واقعات سنا سکتا ہوں لیکن میری

سے کچھ باتیں پوچھنی اور کچھ بتانی تھیں۔ میں وردی کے بغیر تھا کیونکہ اس شعبے میں وردی نہیں پہنی جاتی تھی۔ ایک رات مجھے کبیر گھر لکنا پڑا۔ صبح روانہ ہونا تھا۔ میں حسب معمول بہت سویرے جاگا۔ تھنہ میں میری مگر می۔ ایس۔ ایچ۔ او۔ وہاں نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ قبضے سے کوئی ایک میل دور ریلوے لائن کے قریب ایک لاش پڑی ہے۔ ایس۔ ایچ۔ او وہاں چلا گیا تھا۔ میں روانگی کی تیاری کرنے لگا۔ بیڈ کا ٹیبل آیا۔ اس نے مجھے کہا کہ سہائے صاحب مجھے جاتے واردات بتاتے ہیں اور کہہ رہی ہیں کہ میری مدد کے لیے تھوڑی سی دیر کے لیے آجائیں۔ رام سہائے اسسٹنٹ سب انسپکٹر رہا۔ اس میں جاتا تھا۔ تفتیش میں انا ڈی تھا۔ میری جو شامت آئی تو میں جاتے واردات پر چا پہنچا۔ اگر میں نہ جاتا تو رام سہائے ضروری کا غدی کا کوئی کر کے کوئی ایسا دو آئیل جاتا کہ لاش کو وارث قرار دے کر دفن کرا دیتا۔ اسے غالباً میرا ڈر تھا کہ میں پولیس سپڈ لوئر کا افسر ہوں اس لیے نظر رکھوں گا کہ وہ اس واردات کی کیا کارروائی کرتا ہے۔ میں دراصل تفتیش کا جنوی تھا۔ یہی جنون مجھے وہاں لے گیا اور میں چھینس گیا۔

لاش ریلوے لائن سے تقریباً بارہ گز دور پڑی تھی کپڑوں پر زمین کی رگڑ کے نشان اور خراثیں وغیرہ بتاتی تھیں کہ اسے ریل گاڑی سے زندہ پھینکا گیا ہے۔ صبح کی روشنی صاف ہوگئی تھی۔ میں نے لاش کا نظام معائنہ کیا۔ گردن پر صاف نشان تھے جو بتاتے تھے کہ اس کا گلوہا باکر مارا گیا ہے۔ اس کی عمر تیس سال کی خاصی کم تھی۔ پچیس اور تیس کے درمیان ہوگی۔ خوب رو جوان تھا۔ علاقہ پنجابی تھا۔ ایک ٹائٹل کی پنڈت کی گیارہ لڑکیاں تھیں۔ اگر چھوٹے آجائے تو لاش کی صرف بڑیاں رہ جاتیں۔ میں نے اس کے کوٹ کی جیبوں کی تلاشی لی۔ سیکنڈ کلاس کے دو ٹکٹ برآمد ہوئے۔ ایک تو کرائے کا ٹکٹ تھا جس پر رام ترسہ ناگھنہ لکھا ہوا تھا۔ یعنی وہ امر ترسہ سوار ہوا اور نکلے جا رہا تھا۔ دوسرا ٹکٹ سیٹ ریزرویشن کا تھا۔ اس پر بولگی نمبر اور سیکنڈ کلاس کی سیٹ کا نمبر لکھا ہوا تھا

کپڑوں سے وہ کوئی امیر کبر آدمی نہیں لگتا تھا لیکن سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ بتاتا تھا کہ یہ کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ سیکنڈ کلاس وہی کلاس ہے جسے آج کل پاکستان میں فٹ کلاس کہتے ہیں۔ اس زمانے میں سیکنڈ کلاس میں اتنا لمبا سفر وہی کرتا تھا جو سرکاری افسر اور سرکاری خرچ پر سفر کرے یا کوئی بہت ہی امیر آدمی یہ عیاشی کرتا تھا۔ امیر آدمی بھی انٹر کلاس میں سفر کیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں ریل گاڑیوں میں رش بالکل نہیں ہوتا تھا۔ انٹر کلاس کو باغرت کلاس سمجھا جاتا تھا۔ فٹ کلاس میں انگریز سفر کیا کرتے تھے سیکنڈ کلاس عموماً خالی رہتی تھی۔ ریزرویشن کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔

رات کو یہاں سے ایک بچہ گاڑی گزرا کرتی تھی لیکن وہ امر ترسہ کلمتہ تک نہیں جاتی تھی۔ اس کے بعد بوڑھا ایکسپریس گزرتی تھی جو لاہور سے کلمتہ تک جاتی تھی بہت تیز رفتار گاڑی تھی۔ قصبوں کے ٹیشنوں پر نہیں رکتی تھی۔ کبیر گھر سے بھی رن نہ ہوتی تھی۔ اسے اسی گاڑی سے گرایا گیا تھا۔ رام سہائے کے اطلاع کے مطابق وہاں سے بوڑھا ایکسپریس رات ڈیڑھ بجے کے قریب گزرتی تھی۔ میں اسے قتل کی ایک ایسی واردات کہہ سکتا تھا جو چلتی گاڑی میں ہوئی۔ قاتل گاڑی میں فرار ہو گئے اور قاتل کی لاش یہاں پھینک گئے۔ یہ واردات ان ریزروں اور ڈاکوؤں کی بھی ہو سکتی تھی جو چلتی ریل گاڑیوں میں مسافروں کو کوٹ کر اس ریلوے سٹیشن کے قریب اتر جاتے تھے جہاں گاڑی رکنے کے لیے آہستہ ہوتی تھی اور یہ واردات عداوت کا نتیجہ بھی ہو سکتی تھی۔ بہر حال یہ قتل کی معمولی واردات تھی جو رام سہائے کی سروردی تھی مگر لاش کی جیب سے دو ایسی چیزیں ملیں جنہوں نے مجھے شک میں ڈال دیا۔ ایک تو ایک ڈسک تھا۔ یہ تیرہ مہ کی گولیوں کی طرح گول تھا کڑی کا بنا ہوا تھا۔ روپے کے سکتے جتنا تھا۔ اس کے کنارے کے ساتھ سوراخ تھا جس میں دو چابیاں ایک مضبوط دھاگے سے پروئی ہوئی تھیں۔ اس ڈسک کے درمیان میں کیل یا تیز دھار آسے کی نوک سے لفظ "ما" لکھا ہوا تھا۔ یہ ایسا چیز تھی جس پر کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی لفظ شروع نہیں تھا۔

ماتانے پونکا دیا

اس کی حبيب سے ایک پڑا لنگی، چھوٹے سے کاغذ میں لاپنجی کے آٹھ دس دانے پٹے ہوئے تھے۔ میں نے کاغذ کھرا کر دیکھا کہ پٹیل سے کاغذ پر ایک تحریر تھی جہاں تک مجھے یاد ہے الفاظ کچھ اس قسم کے تھے۔ ”بچوں کا دنیا بڑھنا۔ اور تیر میں منڈی تیر ہے۔ مال جلدی بھیج دو۔ اس کے نیچے بھی لفظ ”ماتا“ لکھا ہوا تھا۔ سہ ماہی کے مرنے کی وجہ خواہ کچھ ہی ہو دستور میرے شیشے کا ملبم ہے۔ وہ کسی دہشت پسند تحریک کا آدمی تھا۔ تقریباً ہر دہشت پسند تحریک کا ایک غمخیز نشان تھا جس سے اس کے ہر ایک دوسرے کو پابنت تھے۔ مثلاً ایک تحریک کا نشان ریشمی رومال تھا، اور ایک تحریک ”جو بگ فائز“ لکھاتی تھی اس کا نشان چوٹا سا ایک پتھر تھا جس میں لکھا ہوتا MOTHER رومال اور پتھر کا استعمال یہ تھا کہ کسی ممبر سے کہا جاتا کہ فلاں شہر میں فلاں جگہ فلاں وقت پہنچو ہمیں وہاں ایک آدمی ملے گا۔ یہ ممبر اس جگہ جا کر ریشمی رومال ہاتھ میں لے لیتا یا پگ فائز کا ممبر مخصوص چوٹا سا پتھر ہاتھ میں اچھالتے لکھتا تھا۔ اس کے گروہ کا آدمی جو وہاں انتظار میں موجود ہوتا تھا اس کے قریب آجاتا اور خفیہ الفاظ بول کر وہ ایک دوسرے سے واقف اور اپنے مشن پر روانہ ہو جاتے۔ یہی آئی ڈی نے متعدد دہشت پسند ریشمی رومال اور پتھر کا دھوکہ دے کر کپڑے سے تھکین وہ لوگ، اتنے ہوشیار تھے کہ انہیں کپڑا بہت ہی مشکل تھا۔

لفظ ”ماتا“ میرے لیے نیا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ میرے لیے نیا ہو سکتا ہے میرے ممکنہ کے لیے مانوس ہو گا۔ چنانچہ میں نے لاش کو اپنی تحریل میں لے لیا۔ مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ مقتول کون تھا اور کہاں کا رہنے والا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ہر ممبر کے پاس اپنا ایڈریس ضرور ہوتا ہے لیکن وہ سامنے نہیں ہوتا، نہایت غریبی سے چھپایا ہوا ہوتا ہے۔ میں نے پہلے تو جانتے واردات کے ارگرد ذہلو

لائن کے ساتھ ایک فرلانگ سے کچھ زیادہ پیچھے جا کر دیکھا۔ کام کی کوئی چیز نہ ملی۔ لاش تھانے لے گئے۔ میں نے اس کا کوٹ اتار کر اس کی سلاسیاں دیکھیں۔ کوٹ پر ہاتھ پھیرا۔ اوپر سے ٹوٹا لاکار کے نیچے پچھے ہوئے تھے میں کچھ شک ہوا۔ سلائی ادھیڑی تو اندر سے ایک اپنچ لمبا اور ادھا پونا اپنچ چوڑا کاغذ کا ٹکڑا نکلا۔ اس پر لکھا تھا۔ ”گھنٹا شام۔ پہاڑ گنج دتی“ اس پر مکان نمبر اور گھر نمبر بھی لکھا ہوا تھا جو مجھے یاد نہیں رہا۔ تحریر نہایت باریک تھی۔ اس سے کوئی شک شبہ نہ رہا کہ مقتول کسی دہشت پسند تحریک کا ممبر تھا۔ انگریز بادشاہ کو ایک دہشت پسند کے قتل سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ بلکہ خوشی ہوتی لیکن اس کے قتل کی تفتیش سے بڑے کام کے انکشاف ہو سکتے تھے۔ ہو سکتا ہے اس نے اپنے گروہ کے ساتھ خنداری کی جہوس کی پاداش میں اسے قتل کر دیا گیا ہو گا۔ اس صورت میں قاتل اس کے ہم سفر ہوں گے۔

اس دراجتہ قصبے میں پوسٹ مارٹم کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ یہ سہولت تیسر تھی کہ تھانے میں ٹیلیفون موجود تھا۔ میں نے دتی اپنے بیڈ کو آرڈر کو فون کیا اور انسپکٹر راجرز سے بات ہوئی۔ راجرز بے حد ذہین اور کام کی خاطر کئی کئی راتوں کی نیند حرام کرنے والا انگریز تھا۔ وہ تفتیش میں بہت ہی ہوشیار اور غیر معمولی طور پر قابل تھا لیکن تھوڑا ڈگری (اذیت رسانی) میں بے حد نظام تھا۔ اس کے ہاتھ میں کس آجاتا تو بڑے افسروں کے لیے جی یہ گورانسپیکٹر مصیبت بن جاتا تھا انگریز کے مشہور سر اغرساں پولیس کے ادارے کاٹ لینڈ یا رڈ کا مانا ہوا سر اغرساں تھا۔ کچھ عرصہ افریقہ میں بھی رہ آیا تھا۔ اس نے یہ اصول میرے دماغ میں ڈالا تھا کہ پہلے شرافت اور محنت سے تفتیش کرو۔ اگر یقین ہو جائے کہ مجرم یہی ہے جسے پکڑا ہے اور وہ اقبال جرم نہیں کرتا تو اسے تھوڑا ڈگری میں ڈال دو۔ اس کی بوٹیاں نوچ لیکن اس سے پہلے تمہیں یقین کر لینا چاہیے کہ تم بے گناہ کو ظلم و تشدد اور اذیت کا نشانہ نہیں بنارہے۔

میں نے ٹیلیفون پر اسے بتایا کہ لاش ملی ہے۔ میں نے جو مشاہدات کیے تھے وہ بھی بتائے اور جو اشیاء برآمد کی تھیں وہ بھی بتائیں۔ اس نے چند ایک سوال پوچھے۔ میں نے جواب دیئے۔ اس نے کہا: ”لاش اور برآمد شدہ اشیاء کے پہلی گاڑی سے دتی پہنچو۔ یہ ہمارا کیس معلوم ہوتا ہے۔“ میں نے منقولہ کے کوٹہ، ای مسٹریوں میں سے نکالے ہوئے کاغذ پر جو ایڈریس پڑھا تھا وہ بھی اسے نوٹ کر دیا۔ وہ زمانہ بن گاڑیوں کا تھا۔ بسیں اور کاریں بہت ہی کم تھیں۔ اگر ہوائی جہاز اور سبیلی کا پٹر ہوئے تو سو پٹر ٹیکہ پٹر میں ہی روک لیا جاتا۔ میں نے انپکٹر راجہ کوکٹ نمبر ریڈ نمبر اور بگنی کا نمبر بھی اس کے پوچھنے پر نوٹ کر دیا تھا۔ رام سہلے نے بتایا کہ ایک پینجر ٹرین چروٹی تک جاتی ہے۔ آنے والی ہے یا آچکی ہوگی۔ اسے کپڑا مشکل تھا۔ میں نے ریلوے سٹیشن فریڈ کیا تو پتہ چلا کہ گاڑی آ رہی ہے۔ گنگل ڈاؤن ہو چکا ہے۔ میں نے اپنا تعارف کرا کے سٹیشن ماسٹر سے کہا کہ گاڑی کو سٹیشن پر روک رکھے خواہ کتنی ہی لیٹ ہو جائے اور انٹر، ہورڈ سینڈ کا کوئی کپہٹ ہنٹ بالکل خالی کرالے کیونکہ ایک لاش دلی لے جاتی جا رہی ہے۔

میں جب لاش چار پائی پر ڈلو کر ریلوے سے سٹیشن پہنچی تو گاڑی کو وہاں رکے بیس منٹ گزر چکے تھے۔ میں نے رام سہلے سے احتیاطاً تین مسلح کانسٹیبل ساتھ لے لیے تھے کیونکہ لاش دہشت پسند کی تھی۔ خطہ تھا کہ اس کے ساتھی یا قاتل راتے میں گڑبڑ کریں گے۔ انٹر کلاس کا ایک کپار ٹمٹ خالی تھا۔ لاش اس کے فرش پر رکھوائی۔ میں نے انجن کے ڈرائیور کو بلا کر کہا کہ وہ دلی اپنے صحیح وقت پہنچے، جتنا وقت یہاں منانے بوا ہے وہ تیز رفتاری سے پور کرے۔ رام سہلے نے مجھے ہنس مٹھی فرشتہ کیا۔ اسے خوش بھی ہونا چاہیے تھا کیونکہ میں اس کے ساتھ نے ایک واردات اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ میں پرائیویٹ کپڑوں میں تھا۔ ریلواریوں کی جیب میں تھا جس میں چھ گولیاں تھیں۔ اٹھارہ گولیاں چھوٹے سے سوٹ کیس میں تھیں

جو میرے ساتھ تھا۔ میں نے کانسٹیبلوں کو کھڑکیوں کے ساتھ بیٹھا کر کہا کہ باہر نظر رکھیں۔ دوسرے ڈبلے سے کوئی ادھر آنے کی کوشش نہ کرے۔ میں لاش کو غور سے دیکھنے لگا۔ نئی چیز یہ دیکھی کہ اس کے پاؤں میں جوتے نہیں تھے۔ میں نے ایک اور چیز نوٹ کی جو میں نے جانے واردات پر بھی محسوس کی تھی اور جب اس کے کوٹ کو تھانے میں اتار کر ٹوٹا تو زیادہ محسوس ہوئی تھی۔ یہ کسی تیز عطر کی خوشبو تھی۔ میں نے گاڑی میں کوٹ کا پھر منوگھا۔ خوشبو کوٹ کے سینے والے حصے میں تھی۔ پولیس آفیسر کے کان اور ناک تیز ہوں یعنی زیادہ حساس ہوں تو کوئی کام کا سراغ مل جاتا ہے۔

میں اس سوچ میں کہ ہو گیا کہ ایک دہشت پسند آدمی اتنے تیز عطر کا شوقین ہو سکتا ہے؟ مجھے یقین نہیں آتا تھا، کیونکہ دہشت پسندی اور اپنی جان کو خطرے میں ڈالے رکھنے کا ذہنی رجحان اور ہوں سے تباہی چمانے کے عراکم کسی نفاست پسند اور شائستہ ذوق والے انسان کے نہیں ہو سکتے۔ میں اس واردات کے نفسیاتی پہلو پر غور کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ شخص دہشت پسند نہیں ہو سکتا اور اگر دہشت پسند ہے تو اس کے ساتھ کوئی عورت تھی جس نے تیز عطر لگا رکھا تھا۔ وہ اس کے ساتھ لگ کر بیٹھی رہی ہے۔ میں نے اس کے کوٹ کو ایک بار پھر غور سے دیکھا۔ اس کی قمیض کو بھی دیکھا۔ ساری لاش کو دیکھا۔ مجھے کسی عورت کی کوئی نشانی نہ ملی۔ ایک ادھ بال مل جاتا۔ کہیں پ شک کی سُرخی نظر آ جاتی۔ کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے خوشبو اپنے آپ میں محفوظ کر لی۔ راستے میں لاش کو کسی بار منوگھا اور خوشبو کو یاد کرنا رہا۔ لاش کی بدبو اپنی جگہ تھی لیکن میری منوگھنے کی جس نے خوشبو کو الگ کر لیا تھا.... لاش کے پاؤں میں جوتے نہیں تھے جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ جب اس کا گلا گھونٹا گیا اور گاڑی سے چھینا گیا تو وہ سویا ہوا تھا۔

لاش کے ہمسفر اور وارث

لاش دلی سٹیڈ کوارٹر میں پہنچی تو چار گھنٹے گزر چکے تھے۔ ان چار گھنٹوں میں راجہ ز

فون معلومات حاصل کر لی تھیں۔ ہواٹا ایکہ پریس لاہور سے چلاتی تھی۔ وہاں سے یہ معلومات ملی تھیں کہ لاہور سے اس بوگی کے سکنڈ کلاس کپارٹنٹ میں تین سیٹیں بک ہوئی تھیں۔ ایک مسلمان تھا وہ ہندو چوتھی سیٹ امرتسر سے بک ہوئی تھی۔ یہ بھی مسلمان تھا۔ مجھے باقی مسافروں کے نام یاد نہیں ہے۔ مقتول کا نام آج تک یاد ہے کہ اس کی کارکنری ڈیڑھ گھنٹہ پہلے بنگ میں اپنا نام احمد علی خان لکھوایا تھا۔ لاہور کے تین مسافروں کی بنگ دہلی تک تھی۔ امرتسر کے مسافر کی بنگ گلندہ تک تھی۔ یہ مقتول ہو سکتا تھا کیا کپارٹنٹ کی چوتھیں تھیں تین نیچے تین اوپر۔ دلی سٹیشن سے پتہ چلا کہ وہاں سے کوئی بنگ نہیں ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دلی سے لگے مقتول اکیلے تھا۔ غالباً اس کے قاتل اسی انتظار میں تھے کہ وہ اکیلے رہ جائے تو اسے ختم کیا جائے۔ یہ پیچیدگی بھی پیدا ہو گئی کہ مقتول ہندو تھا لیکن اُس نے بنگ اسلامی نام سے کرائی تھی۔ وہ اپنی شناخت کو چھپانا چاہتا تھا۔ امرتسر کے سٹیشن ماسٹر نے ٹکٹ نمبر اور بوگی نمبر کی تصدیق کی تھی۔ نام کی تبدیلی سے معاملہ قدرے پُر اسرار ہو گیا لیکن یہ یقین ہو گیا کہ مقتول کسی دہشت پسند گروہ کا فرد تھا جس کا نشان ”ماتا“ تھا۔

[illegible]

سفر کیا۔ کپاٹنٹ میں چھ سیٹیں تھیں جن میں دو خالی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ ان میں سے دو نہیں بلکہ صرف ایک خالی تھی اس سیٹ پر عورت تھی۔

”پھر وہ عورت کہاں گئی؟“ — انسپٹر راجہ رنے پوچھا۔

”یہ شخص اس عورت کی خاطر نہیں ہوا ہے“ — میں نے سوچ کے گھوٹے دوڑاتے ہوئے جواب دیا۔ ”اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس عورت کو قاتلوں نے مقتول کو بچانے کے لیے استعمال کیا ہو۔ وہ ان کی ساتھی ہو گئی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی خوبصورت لڑکی ہو جسے اڑا لے جانے کے لیے ڈکویا بروہہ فروش گاڑی میں سوار ہو گئے ہوں۔ انہوں نے مقتول کو مزاحمت کی یہ سزا دی کہ اسے مار کر گاڑی سے باہر پھینک دیا اور لڑکی کو لے لیا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مقتول نے اس لڑکی پر دست درازی کی ہو اور لڑکی جس کسی کے ساتھ تھی اس نے مقتول کو قتل کر دیا ہو۔“

”سب سے پہلے یہ یقین کرنا ہے کہ اس کپاٹنٹ میں کسی کے ساتھ یا مقتول کے ساتھ کوئی لڑکی تھی۔“ انسپٹر راجہ رنے کہا۔ ”مطلوبہ ہو گئی آج رات کسی بھی وقت دہلی پہنچ جائیگی کپاٹنٹ کو۔ لیڈر لڑکی کی موجودگی یا غیر موجودگی ثابت ہو جائے گی۔ فوری طور پر کرنے والا کام یہ ہے کہ لاش کا پوسٹ مارٹم کر لیا جائے۔ مقتول کے گھر کی تلاشی لی جائے اور اس کے لواحقین سے تفتیش کی جائے۔“

میری پہلی اطلاع سے لے کر لاش انسپٹر راجہ رنے کے پاس پہنچنے تک کے درمیانی چار گھنٹوں میں اس نے پانچ گنئی میں مقتول کے گھر کے تمام افراد کو باہر نکال کر مکان میں رکھ کر لیا تھا۔ میں نے اسے کیڑی نگہ سے فون پر مقتول کا ایڈریس نوٹ کر دیا تھا جو اس کے کوٹ کے اندر سلاخوں پر لٹا تھا۔ اس نے ایک اور انگریز انسپٹر کو پولیس کی کارروائی کے لیے اس ایڈریس پر بھیجا۔ پتہ چلا کہ گھنٹام (مقتول) کا یہی گھر ہے تو اس نے گھر کے چپے سے بڑے تھکے کو کسی آئی۔ ڈی بیڈ کو لڑکھچ کر مکان کو مقفل اور سرسبز کر دیا اور وہاں پولیس کا چہرہ کوڑا کر دیا تھا۔ اب اس کے گھر کے افراد باہر بیٹھے تھے۔ ان میں جو بڑی عمر کے افراد

تھے۔ مثلاً باپ اور چھوٹا بھائی اور چھوٹے بھائی کی بیوی، انہیں لاش دیکھنے کے لیے بلایا گیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ جو ان بیٹے کی لاش دیکھ کر ماں اور باپ کا کیا حال ہوا ہوگا۔ چھوٹے بھائی کا رینگل معمولی سا تھا اور اس کی بیوی پر کچھ بھی اثر نہیں تھا۔ چھوٹے بھائی کی عمر بائیس تیس سال ہو گئی اور اس کی بیوی اس سے دو تین سال چھوٹی معلوم ہوتی تھی۔ لاش کی شناخت ہو گئی۔ اس کا نام گھنٹام ہی تھا۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی گئی۔

”ماتا کا مطلب بھارت ماتا سے اسلام کا خاتمہ“

ہندوستان میں فوج اور پولیس کے انگریز افسروں نے اُردو بولنے اور سمجھنے تھے۔ انہوں کو بولنے میں ذرا دقت ہوتی تھی۔ انسپٹر راجہ رنے انہی میں سے تھا جو بہت کم اُردو بولتا اور سمجھتا تھا۔ کوشش پوری کرتا تھا۔ ہندوستان میں آئے اسے ابھی ایک سال پورا نہیں ہوا تھا۔ ترجمان کے بغیر تفتیش نہیں کر سکتا تھا۔ اس کیس میں اس نے مجھے ہی اپنے ساتھ لے گیا۔ ہم تفتیش کے کمرے میں گئے تو اس نے مجھے کہا کہ میں اس کے سوالوں کے علاوہ اپنی طرف سے بھی سوال کروں۔ مجھے بھی اپنی اجازت کی ضرورت تھی۔ میں صرف ترجمانی کے فرائض کا پابند نہیں رہنا چاہتا تھا۔ سب سے پہلے مقتول کے باپ کو بلایا گیا۔ اس کے تو ہوش اڑے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے طریقہ کار کے مطابق اسے تسلی دلا سہ دیا اور کہا کہ اس کا بیٹا مارا جا چکا ہے اگر وہ زندہ پکڑا جاتا تو پچاسی کے تھپے پر مارا جاتا۔ تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ تم اپنے مرے ہوئے بیٹے کے متعلق جو کچھ جانتے ہو بتا دو۔ وہ کیا کرتا تھا، کہاں آتا جاتا تھا، اسے ملنے والے کون لوگ تھے وغیرہ۔ میں نے یہ ساری بات انگریزی میں انسپٹر راجہ رنے کو بتائی۔

باپ نے مقتول کے متعلق بہت سی باتیں بتائیں جو مختصر یوں ہیں کہ وہ اس کا پہلا بچہ تھا

اس لیے ضرورت سے زیادہ پیار میں پلا۔ بچپن میں ہی اسے فضول خرچی کی عادت ہو گئی تھی جو باپ نے اپنے ہاتھوں ڈالی تھی۔ اس کے بعد اس کی ایک بہن پیدا ہوئی۔ پھر اس کا یہ بھائی پیدا ہوا جو یہاں موجود تھا۔ اس کی بہن اپنے سرال میں تھی۔ اس کے بعد ایک اور بھائی پیدا ہوا جس کی عمر اس وقت چودہ سال کی ہے۔ یہ ان بھائی پیدا ہوئے تو گھنٹا کی طرف ماں باپ کی توجہ کم ہو گئی۔ باپ کا کاروبار اچھا تھا۔ روپیہ بچے کی کوئی تنگی نہیں تھی۔ باپ اسے پیسے ملنے کے راضی کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس سے بڑا اور زیادہ بڑا گیا۔ باپ اسے تعلیم دلا کر اپنے کاروبار کو بھیلنے کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا مگر بیٹا نے تمہارا جوار تھا۔ وہ سکول میں پڑھتا تھا لیکن پڑھنے میں اسے دلچسپی نہیں تھی۔ تاہم آٹھویں جماعت تک پہنچ گیا اور اس عمر میں اس نے چھوٹے بہن بھائیوں کی پٹائی شروع کر دی۔ وہ گھر میں وہی حیثیت حاصل کرنا چاہتا تھا جو اسے اُس وقت حاصل تھی جب وہ گھر میں اکیلا تھا۔ وہ جوں جوں بڑا ہوتا گیا گھروالوں کے لیے غمناک بنا گیا۔ میٹرک کے امتحان میں دوبارہ فیل ہوا اور اس نے تعلیم ترک کر دی۔ یہاں سے وہ آوارگی میں داخل ہو گیا۔

اُس کے باپ نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”مہاراج! آپ غمناک نہ ہوں تو ایک بات پوچھوں؟ آپ کا مذہب کیا ہے؟ ہندو، مسلمان یا عیسائی؟“ میں نے جھوٹ بولا کہ میں ہندو ہوں۔ میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ بھی سنا چاہتا ہے۔ میرا جواب سن کر اس کے چہرے پر طمان پیدا ہو گیا۔ کہنے لگا۔ ”پھر میں آزادی سے بات کروں؟ صاحب بہادر تو ناراض نہیں ہو گا؟“

میں نے انکسٹر راج کو بتایا کہ اس آدمی نے کیا کہا ہے۔ یہ ہندو انگریزی نہیں جانتا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں نے اسے کہا ہے کہ میں ہندو ہوں۔ انکسٹر راج نے مسکرا کر مجھ

سے پوچھا۔ ”آپ کو معلوم ہے کہ مقتول کی جیب سے جو ڈسک برآمد ہوئی ہے اس پر کھدے ہوئے لفظ ”ماتا“ کا کیا مطلب ہے؟“ مجھے معلوم نہیں تھا۔ اُس نے کہا۔ ”باقی دہشت پسند تحریکیں میری دشمن ہیں یعنی انگریزی راج کی دشمن مگر ”ماتا“ نام کی تحریک تمہاری دشمن ہے۔ یہ تحریک یوپی سے اُٹھی ہے اور پنجاب میں پرورش پا رہی ہے۔ اس تحریک کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹایا جائے۔ اس میں صرف ہندو اور سکھ ہیں۔ یہ قیاس ہے کہ موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، بھارت کا پہلا وزیر اعظم، سردار پٹیل اور اس طرح کے ہندو لیڈروں نے یہ تحریک شروع کرائی ہے۔ ظاہری طور پر وہ ہندو مسلم بھائی بھائی کا پروپیگنڈہ کرتے ہیں لیکن وہ درپردہ مسلمانوں کو ہندو مذہب میں جذب کر لینا چاہتے ہیں۔ ”ماتا“ سے ان کی مراد تجارت ”ماتا“ ہے جسے وہ صرف ہندوؤں کا ملک سمجھتے ہیں۔ ان کی یہ دہشت پسند تحریک مسلمانوں کے مذہبی اور سیاسی لیڈروں کو خفیہ طریقوں سے قتل کرے گی۔ تبلیغ کے ذریعے ہندو مذہب پھیلانے کی اور کٹر مسلمانوں کو پراسرار طریقوں سے دہشت زدہ کرے گی۔ یوپی میں اس تحریک نے دہشت پسندی کی کچھ وارداتیں کی بھی ہیں“۔ انکسٹر راجز بہت ہی ذہین آدمی تھا۔ اُس نے پوری معلومات حاصل کر رکھی تھیں۔ اُس نے کہا۔ ”ہمارے خفیہ ذرائع نے ہمیں بتایا ہے کہ ”ماتا“ تحریک کا مرکز مل و سیکر کے اسے حکومت کے خلاف بھی استعمال کیا جائے گا۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ بڑے بڑے دہشت پسند و تاجر اس تحریک کو مالی امداد دے رہے ہیں۔۔۔ آپ نے اچھا کیا ہے کہ اسے یہ بتایا ہے کہ آپ ہندو ہیں۔ اسے ڈراؤ بھی اور مسلمانوں کے خلاف گرواؤ بھی۔ یہ کارآمد باتیں بتا سکتا ہے۔“

”صاحب بہادر رکھتے ہیں کہ انگریز بھی مسلمانوں کے دشمن ہیں“۔ میں نے مقتول کے باپ سے کہا۔ ”تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو بے خوف ہو کر کہو۔“

”میری کسی کے ساتھ دشمنی نہیں لالہ جی مہاراج!“۔ اُس نے روتے ہوئے کہا۔

”جس کا اپنا بیٹا دشمن ہو جائے وہ باپ کسی سے کیا دشمنی کرے گا۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ وہ
 جہاں بنوا تو مسلمانوں کا دشمن ہو گیا۔ وہ اپنے جیسے دوستوں کو گھروں سے لے کر بہت دیر تک وہ کمرے
 میں بیٹھ بیٹھ کرتے رہتے کہ مسلمانوں کو کھانے کے لیے کون سے طریقے اختیار کیے جائیں۔ میں
 ڈرتا تھا کہ یہ چیزیں مسلمانوں کے ہتھے پہنچ گئیں تو وہ ان کی لاشیں بھی گم کر دیں گے۔ مسلمانوں
 کو آپ جانتے ہیں ہمارے ہاں گوشت کھانے کی قوم ہے۔ اس ملک پر حکومت بھی کر چکی ہے کسی کو
 قتل کر دینا ان کے نزدیک کچھ بھی نہیں۔ آپ نے مجھے بتایا نہیں کہ میرے بیٹے کو کس نے قتل کیا ہے۔
 منجھ سولہ آٹھ لاکھ تین تھیں۔ یہ کہ اسے مسلمانوں نے قتل کیا ہے۔ میں اسے منع کیا کرتا تھا کہ مسلمانوں اور
 سکھوں سے دشمنی مول نہ لینا۔ آپ کو معلوم ہے کہ دہلی میں چٹان اور پنجابی مسلمان ہیں۔ ان سے
 سب سے دشمنی مول لے سکتے ہیں“

باپ نے بتایا کہ دو گھر سے کئی کئی دن غائب رہنے لگا۔ آتا تھا تو گھر سے پیسے لے لیتا تھا۔
 چار پانچ سال کے عرصے میں وہ ہاتھ سے بالکل نکل گیا۔ باپ نے اُسے سمجھانے بھجانے کی کوشش
 کی تو یک روز دہلی کے پنڈت قسم کے چار آدمی اس کے گھر آئے۔ انہوں نے باپ کو سمجھانے کے لیے
 لکچر دیا کہ اس کا بیٹا جو کام کر رہا ہے وہ دھرم میں ہے یعنی مذہبی جنگ ہے جسے ہم ہمد کھتے ہیں۔
 انہوں نے باپ کو قائل کرنے کی بہت کوشش کی کہ ہندوستان میں اسلام کو بند و بند میں جذب
 کر لینا ضروری ہے۔ انہوں نے یہ دلیل بھی دی کہ مسلمان پیدا نشی سپاہی ہیں۔ انہیں جب کبھی موقع
 ملے انگریزوں کے خلاف لڑنے کھڑے ہوں گے۔ اگر انہوں نے انگریزوں سے مک لے لیا تو وہ ایک
 بار پھر ہندوستان کے بادشاہ بن جائیں گے۔ انہوں نے جس طرح اپنے دور حکومت میں لاکھوں
 ہندوؤں کو مسلمان بنالیا تھا اسی طرح وہ ہندوستان کے تمام ہندوؤں کو مسلمان بنالیں گے۔ ان
 چاروں لیڈروں نے اسے بتایا کہ ہندوستان بھارت آتا ہے جس پر مسلمان لیچھویں کی حکومت قائم

ہو گئی تو بھارت مانا کا ہتیا چار تو ہیں، ہو جائے گا۔ اس لیے اپنے نوجوان بیٹوں کو اس تحریک
 دمانا، میں شامل ہونے سے نہ روکو۔ اگر روکے تو پانی پھلاؤ گے۔

باپ نے انہیں کہا کہ سب بڑا پانی تو اس کا بیٹا ہے جس کی آنکھ میں ماں کی عزت ہے نہ
 باپ کی۔ بے لگام کھوٹے کی طرح وہ معلوم نہیں کہاں کہاں بھاگتا پھر رہا ہے۔ باپ نے ہاتھ جوڑ کر
 ان سے درخواست کی کہ اس کے بیٹے کی کھوپڑی میں کچھ عقل اور آنکھوں میں شرم ڈالیں۔ وہ اس
 کے کاروبار میں بھی اس کی کچھ مدد کرے۔ اس کے جواب میں لیڈروں نے اسے کہا کہ وہ اب ہمارا
 نہیں بھارت مانا کا بیٹا ہے۔ وہ اشوک اور شیواجی بن کر ابھرے گا۔۔۔ باپ سخت پریشان ہوا لیڈروں
 نے اسے تسلی دلا دینے اور یہ تاکید بھی کی کہ اگر کوئی گھبرا کر اس کے بیٹے کے متعلق پوچھے تو اسے کچھ نہ
 بتائے۔ ہو سکتا ہے وہ سی آئی ڈی کا آدمی ہو۔ اگر وہ بتائے گا تو اس کا بیٹا گرفتار ہو جائیگا۔ لیڈروں
 نے اُسے نہایت اچھے الفاظ میں کچھ دھمکیاں بھی دیں اور چلے گئے۔

”ان لیڈروں کو تم جانتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔
 ”صرف ایک کو“۔ اُس نے جواب دیا اور التجا کی — ”مہاراج جی! اسے پتہ چل گیا
 کہ میں نے اس کا نام لکھوا دیا ہے تو وہ میرے ساتھ بہت بُرا سلوک کرے گا۔“

”تمہاری حفاظت ہماری ذمہ داری ہے“۔ میں نے اسے کہا۔ ”اس کا نام پتہ بتاؤ۔“
 اُس نے ایک ساتھی ہندو کا نام بتایا اور پتہ بھی بتا دیا۔ وہ اس کے گھر دو سال پہلے آیا تھا۔
 میں نے انکسپٹر راجر کو اس کا بیان انگریزی میں سنایا اور اس ساتھی پنڈت کا نام پتہ بھی لکھ کر اس
 کے حوالے کر دیا۔ امید تھی کہ یہ پنڈت پڑا گیا تو اس تحریک کی پشت پناہی کرنے والے دوسرے لیڈر بھی
 پکڑے جائیں گے۔ میں نے مقتول کے باپ سے پوچھا کہ مقتول کے تعلقات کسی لڑکی کے ساتھ تھے؟
 اُس نے جواب دیا کہ اُسے اس کی باہر کی زندگی کے متعلق کوئی زیادہ واقفیت نہیں۔ اُس نے شادی

مقتول کی دلیری اور بد چلتی

میں سمجھا کہ اُس کے دل میں بھائی کے خلاف یہی سبکدوشی ہوگی جو اُس کا باپ تفصیل سے بیان کر گیا تھا۔ میں نے اسے کہا — تمہارے دل میں جو کچھ ہے وہ کھل کر بیان کر دو۔ میں ہندوؤں کو ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیا تم انگریزی بول سکتے ہو؟

”میرٹک پاس ہوں“ — اس نے جواب دیا — ”لیکن انگریزی بولنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ باپ کے ساتھ کاروبار کرتا ہوں جہاں اُردو اور پنجابی چلتی ہے۔“

میں نے اس کے ساتھ جو باتیں کیں اور اس نے جو کچھ کہا تھا وہ انگریزی میں انپیکٹر راجرز کو سنایا۔ اس نے پوچھا — ”کیا تم اس کی باہر کی سرگرمیوں کے متعلق کچھ بتا سکتے ہو؟“

”میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ وہ ایک خفیہ تحریک کا ممبر تھا“ — اُس نے جواب دیا —

”مجھے بھی اس میں شامل ہونے کے لیے کہا رہتا تھا لیکن میں نے اس کی یہ بات نہیں مانی تھی۔“

”تحریک کیا ہے؟“ — انپیکٹر راجرز نے پوچھا — ”اس نے ہمیں ضرور بتایا ہوگا کہ تحریک کے ممبر کیا کرتے ہیں۔“

”ماں اس نے بتایا تھا“ — اس نوجوان ہندو نے بتایا — ”پچھلے وہ کسی ایسے گروہ میں شامل ہوا تھا جو انگریزوں کے خلاف خفیہ طور پر کام کر رہا تھا۔ پھر اس نے مجھے ایک اور گروہ کے متعلق سنا شروع کر دیا۔ کہا کرتا تھا کہ ہمارا پہلا دشمن مسلمان ہے اس لیے مسلمانوں کو ختم کرنا ضروری ہے۔ وہ مجھے مسلمانوں کے خلاف بھڑکاتا رہتا تھا۔ کہتا تھا کہ تم اس گروہ میں شامل ہو جاؤ تو سارے ہندوستان کی سیر کرو گے۔ کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ مسلمانوں کو تباہ کرنا بہت بڑی نیکی ہے۔“

”لیکن وہ مسلمانوں کو کس طریقے سے ختم کرنا چاہتا تھا؟“ — میں نے پوچھا — ”اُس کے

سے انکار کر دیا تھا۔ گذشتہ تین سالوں سے وہ پورا پورا امینڈ گھر سے غیر حاضر رہتا تھا۔ تین چار دنوں کے لیے گھر آکر اصراف ہو جاتا تھا۔ ماں نے بھی باپ نے بھی اور بڑی بہن نے بھی اسے نہ لیغانہ زندگی بسر کرنے کو کہا۔ رورور اس کی فٹیں کیں لیکن وہ سیدھے راستے پر نہ آیا۔ اس دوران اس کے چہرے پر بانی کی شادی ہو گئی۔ مقتول اپنے بھائی کی شادی پر بھی گھر نہیں آیا تھا۔ وہ غنڈہ بن چکا تھا۔ گھر کے تمام فرد اس سے ڈرنے لگے تھے۔ باہر سے انہیں پتہ چلا تھا کہ وہ شراب پیتا ہے اور ٹیڈیوں کے پاس بھی جاتا ہے۔

انپیکٹر راجرز نے اُس پر بہت زبردستی کی۔ میں نے بھی اس پر سینکڑوں سوال کر ڈالے لیکن اس سے کام کی کوئی بات نہ اگلائی جا سکی۔ اس سوال کے جواب میں کہ اب کے وہ گھر سے کب سے غیر حاضر تھا باپ نے بتایا کہ اُسے گھر سے نکالے بیس روز ہو گئے ہیں۔ انپیکٹر راجرز نے اسے باہر بھیج دیا اور مجھے کہا — ”معلوم نہیں اس بڑھے کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ اس نے سچ بولا ہے اور اس کے علاوہ وہ اور کچھ نہیں جانتا۔ یہ میرا مشاہدہ ہے کہ ہندوستان کے لوگ بلاوجہ بھی جھوٹ بولتے ہیں لیکن فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں کیونکہ ان کے پہرے کا تاثر اور آنکھوں کی حرکت بدل جاتی ہے۔ میرے ملک کے مجرم جب جھوٹ بولتے ہیں تو دلیر ہو کر بولتے ہیں۔ پہرے پر کوئی تبدیلی نہیں آنے دیتے۔ اس بڑھے نے جھوٹ نہیں بولا۔“

اب ہمارے سامنے مقتول کا چھٹا بھائی بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے پہلی بات یہ پوچھی کہ اپنے بڑے بھائی کی لاش دیکھ کر وہ اپنے ماں باپ کی طرح رویا کیوں نہیں تھا؟ اس نے بے پروائی سے جواب دیا — ”مجھے اس کے مرنے کی خوشی ہے۔“ یہ کہہ کر اس کا چہرہ سرن ہو گیا۔ اس نے کہا — ”اور مجھے اس پر اور زیادہ خوشی ہے کہ وہ مرا نہیں مارا گیا ہے۔“

ساتھ اور کون لوگ تھے؟

”میں نے یہی سوال اس سے کہی مرتبہ پوچھا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”لیکن اس نے کبھی نہیں بتایا تھا۔ کتنا تھا کہ اس گروہ کے لوگ ایسی باتیں زبان پر لایا ہی نہیں کرتے ممبر ملک دوسرے کو جانتے ہی نہیں۔ اس نے مجھے لکڑی کا ایک گول ٹکڑا دکھایا تھا جس پر مٹا، ٹکھا، ٹھوکتھا۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ جب تک کہ زیادہ دنوں کے لیے غیر حاضر ہوتا ہے تو امرتسر اور لاہور چلا جاتا ہے جہاں اس کے گروہ کے چند ایک آدمی اس کی خوب آؤ بھگت کرتے اور شہزادوں کی طرح کھتے پرتے۔“

”کیا تو ہمارے دل میں مسلمانوں کے خلاف نفرت نہیں؟“ میں نے پوچھا اور کہا۔

”پوری آزادی سے بات کرو۔“ جی ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنا دشمن سمجھتا ہوں۔“

”ہاں جی آ۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ہر ہندو کو مسلمانوں سے نفرت کرنی چاہیے۔“

”سبھی مسلمانوں کو ناپاک سمجھتا ہوں۔ میں چونکہ تجارت پیشہ ہوں اس لیے یہ میرا فرض ہے کہ کسی مسلمان کو تجارت میں کامیاب نہ ہونے دیا جائے۔ لیکن میں کسی ایسی پارٹی میں شامل نہیں ہونا چاہتا۔“

”کی نہ گزریاں خدیہ ہوں اور جس کے ممبر چوروں کی طرح چھپتے پھریں۔“

”کیا تو تم کہتے ہو کہ اس کا کوئی دشمن تھا؟“ انسپکٹر راجرنے پوچھا۔ ”اسے کس قتل کیا ہوگا؟“

”میں کسی کا نام نہیں بتا سکتا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اس کے دشمن کئی ہوں گے؛“

”راے یہ ہے کہ کسی مسلمان کو پتہ چل گیا ہوگا کہ گھنٹاؤں کے خلاف خدیہ کارروائیاں کر رہا ہے۔“

”اس نے اسے قتل کر دیا ہوگا۔“ میرا دوسرا ٹھیک ہے کہ اس کا چال چلن ٹھیک نہیں تھا۔ اس کسی کی بیوی یا بہن پر ہاتھ ڈالا ہوگا اور قتل ہو گیا۔“

اس کے اس جواب پر میں نے اور انسپکٹر راجرنے اس پر اس قدر سوال کیے اور اتنی کہ یہ نو جوان بندوبست حال ہو گیا۔ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا اور اس کے ہونٹ خشک ہو گئے۔

اس سے یہ کہہ رہے تھے کہ وہ علی مثال دے کر دفاع کرے کہ اس کا چال چلن ٹھیک نہیں تھا۔ آخر اس نے پریشان ہو کر بتایا۔ ”اُس نے میری بیوی کو خراب کیا ہے۔“ اُس نے بتایا کہ وہ دو روز کے لیے کاروبار کے سلسلے میں باہر گیا ہوا تھا۔ گھنٹاؤں آ یا اور رات کو اس کی بیوی کے کمرے میں چلا گیا۔ لڑکی کمرے میں ایک تھی۔ ماں باپ دوسرے کمروں میں تھے۔ لڑکی کو چاقو دکھا کر اور قتل کی دھمکی دے کر اس نے لڑکی کو خراب کیا۔ یہ واقعہ اس کے قتل سے ایک سال پہلے کا ہے۔ اس لیے یہ شک ہے بنایا تھا کہ جھوٹے بھائی نے اسے قتل کیا ہوگا۔ بیوی نے اپنے خاندان کو بتایا۔ خاندان نے اپنے باپ کو بتایا اور بات گول ہو گئی۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ مقتول بد چلن بھی تھا اور دیہ بھی اور اس میں دہشت پسندی کے اوصاف موجود تھے۔

دن بھر کی جھگ جھگ سے کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ سوائے اس کے کہ مقتول مسلمانوں کو ختم کرنے والے دہشت پسند گروہ کا ممبر تھا اور بد چلن تھا اور اس گروہ کی پشت پناہی چند ایک مذہبی لیڈر کر رہے تھے۔ مقتول کے کنبے سے ناراض ہوتے تو پوسٹ مارٹم رپورٹ آگئی۔ انسپکٹر راجرنے ایک کارروائی کی کہ مقتول کے باپ نے جس ساتھی پنڈت کا نام پتہ بتایا تھا، اس کے پیچھے سی آئی ڈی اور مجرمانہ گانے کا انتظام کر دیا۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ یہ افراد مسلمان ہونے چاہئیں کیونکہ ہندو دھوکا دے جائیں گے۔ اس نے تین مسلمان بلوائے۔ ان میں ایک ہندو کاٹھیل تھا اور دوسری تھیں یعنی وہ پولیس کے صرف ملازم تھے کاٹھیل نہیں تھے۔ میں نے انہیں مسلم کش تحریک کے متعلق تفصیل سے بتایا اور انہیں بہت سی ہدایات دیں۔ اس ہندو کو کاٹھیل نہیں تھا، اس کی حرکات اور سرگرمیاں کوئی تحقیق تاکہ کچھ اور لوگ بھی سامنے آجائیں۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ میں لکھا تھا کہ مقتول گلا ہاتھوں سے دبانے سے واقع ہوئی ہے۔ جسم پر خراشیں اور زخم ریل گاڑی سے گرنے کے تھے۔ موت کا جو وقت بتایا گیا تھا وہ تقریباً وہی تھا جو ہو چکا

ایک پریس کا وہاں سے گزرنے کا تھا۔ اس رپورٹ میں انکشاف والی کوئی بات نہیں تھی... مقتول کے خاندان کے افراد کا تھکے کر ہم اُس کے گھر گئے اور گھر کا کونہ کونہ چھان مارا۔ ہر ایک ٹرنک منوٹ کی گزیر اور ہر ایک برتن بھی دیکھا۔ کچھ بھی نہ ملا۔ انیسٹر راجہ زرنے لاش اور گھر مقتول کے لواحقین کے حوالے کر دیا۔ ہم نے انیسٹر انجینیئر سے بتایا کہ اگر آپس میں سے کوئی دھمکی ملے یا ان کے ہاں کوئی اجنبی آدمی آئے تو فوراً اطلاع دیں۔ انہیں یہ سچ بتایا گیا کہ کسی سے ڈر نہ کریں کہ ہم نے ان سے کچھ پوچھا ہے۔ ہم نے وہاں سے پریس کا پہرہ بنادیا۔ لیکن بغیر ردی افراد کا پہرہ لگا دیا جنہیں نظر رکھنی تھی کہ گھر پر کون آتا ہے۔ دس بغیر ردی آدمیوں کو ہر گھر پر قمر کیا کہ جب مقتول کو ملانے کے لیے دھمکی ملے جائیں تو سمجھنا کہ وہاں لوگوں میں شامل دیگر ہر ایک آدمی کی باتیں نہیں اور ان سے باتیں کریں۔ اگر کوئی آدمی مشکوک ہو تو اس کا پیچھا کریں۔

خوشبو والی لڑکی کون تھی؟

ادھر تو نارنگ جوتے تورات کے گیارہ بج رہے تھے۔ ریلوے سٹیشن سے پوچھا کہ بوگی آئی ہے یا نہیں۔ ابھی نہیں آئی تھی۔ سٹیشن ماسٹر نے بتایا کہ اُس سٹیشن پر فالتوا انجن نہیں تھا جہاں سے بوگی لانی تھی۔ ایک، جنکشن سے انجن کا انتظام کرتے وقت ٹک گیا تھا۔ اس کے اندازے کے مطابق بوگی آنے میں ابھی تین گھنٹے باقی تھے۔ انیسٹر راجہ زرنے مجھے کہا کہ میں کھانا کھا کر آرام کروں اور رات دو بجے اس کے پاس آ جاؤں.... جنکشن اور بھوک نے بُرا حال کر دیا تھا۔ میں باکرہ بنایا اور کھانا کھا یا مگر نیند نہ آئی۔ یہی ایک خیال انکار سے کی طرح ذہن میں دھک رہا تھا کہ ہندو اسلام کا نام و نشان مٹانے کے لیے خفیہ طور پر کیا کچھ کر رہے ہیں۔ یہ تو یقین جانتا تھا کہ ہندو ہمارا بدترین دشمن ہیں اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ہندو لیڈروں کے عزائم یہ ہیں کہ وہ انگریزوں

سے ہندوستان کو آزاد کرانے کے حاکم بن جائیں۔ میں پولیس میں رہا ہوں اور پولیس کے ایسے خفیہ شعبوں میں بھی رہا ہوں جہاں سیاسی لیڈروں کے سینوں کے راز پہنچ جایا کرتے تھے۔ ان سے پتہ چلتا تھا کہ ہندوؤں کی سوچیں اور ارادے کیا ہیں۔ اس میں ذرہ بھر شک نہیں کہ ہندو کے من میں رام رام اور بھل میں چھری ہوتی ہے۔ ہندو ہمارا کبھی دوست نہیں رہا نہ کبھی ہرگا کیونکہ مسلمانوں سے نفرت کرنا اور مسلمانوں کو ہر شے میں نقصان پہنچانا ہندو کا مذہبی فریضہ ہے۔ اگر پاکستان نہ بنتا تو مسلمان تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ہندو ان کا کیا حال کرتے۔ یہ صرف میں بتا سکتا ہوں یا پولیس کے وہ افسر بتا سکتے ہیں جنہوں نے ہندو کے سینے کے راز معلوم کیے تھے۔

اُس وقت (۱۹۳۹ء میں)، پاکستان کا تو نام بھی سامنے نہیں آیا تھا اور مسلمانوں کے سامنے کوئی واضح منزل نہیں تھی۔ ہماری لیڈر شپ بھی ابھی کھل کر سامنے نہیں آئی تھی اس لیے میں اُس رات بہت پریشان تھا کہ مسلمانوں کا مستقبل کیا ہوگا۔ میں یہی کچھ کر سکتا تھا کہ ہندو کی اس مُسکلم کش تحریک کے زیادہ سے زیادہ افراد اور ان کے لیڈروں کو گرفتار کروں اور انہیں نفیشت کے بھانے ایسی اذیت میں ڈالوں کہ ان کی آنے والی نسلیں بھی اسلام دشمنی سے توبہ کر لیں... میں یہی کچھ سوچتا رہا اور بے چین رہا۔ انہی سوچوں میں ڈیڑھ بج گیا۔ میں نے کپڑے بدلے، ریلو اور جیب میں ڈالا اور انیسٹر راجہ زرنے کے دفتر میں چلا گیا۔ دس منٹ بعد وہ آگیا اور ہم دونوں ریلوے سٹیشن چلے گئے۔ اُس زمانے میں ہر سرکاری محکمے میں ہر فرد ڈیوٹی پر مستعد رہتا تھا۔ اگر آج پاکستان میں ایسی کارروائی کی ضرورت محسوس ہو کہ سینکڑوں میل دُور سے ایک بوگی لانی جاتے تو کارروائی سُر خفیہ کی نذر ہو جاتے اور محض ٹالنے کی غلط و فزی جگر شروع ہو جاتیں۔ اُس وقت یہ عالم تھا کہ رات دو بجے اتنے بڑے سٹیشن کا سٹیشن ماسٹر اپنے تمام تر محلے کے ساتھ موجود تھا۔ بوگی کو وصول کرنے کے لیے اس

نے نہایت موزوں جگہ خالی کر رکھی تھی اور ریلوے پولیس کی کاررواستمکھڑی تھی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ پچھلے سیشن سے لوگی رن تھرو ہوئی ہے اور پٹنچنے والی ہے۔ گنسل ڈاؤن ہو چکا تھا۔

لوگی آگئی۔ انکپٹر راجہ رننے لگا۔ سڑک کی سہولت دے دی کہ وہ پورا پلیٹ فارم نہ رن سکے جہاں اسے سہولت ہو وہاں لوگی کو سنا، سنے تاکہ آنے جانے والی گاڑیوں کو رکاوٹ نہ ہو۔ اس کے مطابق لوگی کو ایک اور جگہ لے گئے۔ اس کے ساتھ پولیس کی کاررواستھی۔ سیکنڈ کلاس کے دروازے کی مہ توڑ کر میں اور انکپٹر راجہ رن کر گئے۔ روشنی کا انتظام کر لیا۔ اس سیکنڈ کلاس کپارٹمنٹ کی چھ سیٹیں تھیں۔ تین بیچہ تین اوپر۔ نیچے والی ایک سیٹ پر بستر بچھا ہوا تھا۔ ساتھ والی سیٹ پر بڑا چھانکھا پڑا تھا۔ اس سیٹ کے نیچے شور کا ایک جڑا تھا۔ بستر والی سیٹ کے نیچے زمانہ سینڈل کا ایک جڑا پڑا تھا۔ میں نے پہلا کام یہ کیا کہ اس بستر کے سربانے کو سونگھا۔ وہاں وہی خوشبو تھی جو میں نے مقتول کے کوٹ سے سونگھی تھی۔ میں خوشبودوسری سیٹ پر پڑے ہوئے کبل میں تھی۔ انکپٹر راجہ رننے بھی خوشبو سونگھی اور اس نے میری تائید کی کہ خوشبودو ہی ہے جو لاش کے کوٹ کے ساتھ تھی۔ بستر والی سیٹ کے نیچے ایک سوٹ میں رکھا تھا۔ فرش پر ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے کٹرے کھڑے ہوئے تھے جو میں نے اٹھا لیے۔ بستر پر لہینا لڑکی تھی۔ میں نے اور انکپٹر راجہ رن نے بیئرکوارٹ پلٹ کر دیکھا تو اس کے سربانے کی طرف نیچے سے ایک پرس نکلا۔ سارے کپارٹمنٹ کو ہم نے نگہ نہی غفروں سے دیکھا۔ پولیس جاتے واردات پر بے شمار چیزیں دیکھا کرتی ہے۔ ضروری نہیں کہ آپ سے ان سب کا ذکر کیا جائے۔ میں آپ کو موٹی موٹی اشیاء بتاتا ہوں تاکہ آپ کو کافی سمجھنے میں آسانی ہو۔ آپ نے میری گفتگو میں دیکھا ہو گا کہ ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کا کئی کامیوں میں ذکر آیا ہے۔ چوڑیاں اور عورت کا ایک آدھ بال دوا ایسی چیز ہیں جس پر ایسے واقعہ واردات پر مشور ملتی ہیں جہاں عورت پر زیادتی ہوئی ہو اور اگر زیادتی یا گتھاپائی زیادہ ہوئی ہو تو ٹوٹی ہوئی چوڑیاں

کے ساتھ دو چار بال بھی مل جاتے ہیں۔ مجرم اتنی جلدی میں ہوتے ہیں کہ موقعہ واردات سے ان اشیاء کو غائب نہیں کر سکتے۔ مجرم کے دوران انہیں ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کا ہوش ہوتا ہے۔ اس واردات کے مقام سے بھی ہمیں چوڑیوں کے کٹرے مل جہم نے اٹھا لیے۔

دوسری کام کی چیز پرس تھا پرس میں کم و بیش سات سو روپیہ نقدی تھی۔ ایک ریشمی دھال تھا اور سیکنڈ کلاس کا ایک ٹکٹ لیکن ریزرویشن ٹکٹ ساتھ نہیں تھا۔ انکپٹر راجہ رننے مجھے کہا۔ ”یہ ہے تمہارا پانچواں پیسہ جو ریزرویشن کے بغیر سفر کر رہا تھا۔ ٹکٹ امرتسر سے کلکتہ تک کا تھا۔ لڑکی کے سینڈل اور پرس اور مقتول کے کوٹ کے ساتھ اس کی خوشبو باقی تھی کہ لڑکی مقتول کی ہمسفر تھی مقتول کے کوٹ کے ساتھ لڑکی کی خوشبو یہ بھی باقی تھی کہ وہ دونوں جب اس کپارٹمنٹ میں اکیلے رہ گئے تو لڑکی مقتول کے اتنے قریب بیٹھی رہی کہ اس کی خوشبو مقتول کے کوٹ میں بھی چل گئی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کی بے لگلی تھی۔ انکپٹر راجہ رن کہتا تھا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مقتول نے لڑکی کے ساتھ زبردستی کی ہو اور چھپے پیسے رننے سے جان سے مار کر گاڑی سے نیچے چھینک دیا ہو۔ یہ ممکن تھا کہ انکپٹر میں چھپنا پیسے بھی ہو جو ریزرویشن کے بغیر سفر کر رہا ہو۔ مقتول کے چھوٹے بھائی کے بیان کے مطابق مقتول نے اس کی بیوی پر مجرمانہ حملہ کیا تھا اور اس کی رائے کے مطابق مقتول اس جرم کا عادی تھا۔ خیال کیا جا سکتا تھا کہ اُس نے چلتی گاڑی میں بھی یہی حرکت کی ہوگی لیکن میرا توقع یہ تھا کہ جس جگہ سے مقتول کی لاش ملی اس سے اگلے سیشن دسٹاپ، پریکپارٹمنٹ خالی تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ لڑکی اور اس کے ساتھ اگر کوئی اور تھا تو وہ کلکتہ تک نہیں گئے، راستے میں ہی اڑ گئے۔

ہم نے سوٹ کیس کھولا تو اس میں سے لڑکی کے دو جوڑے کپڑے اور ان کے ساتھ دوپٹے اور ضرورت کی چند اشیاء برآمد ہوئیں اور زیورات کا ایک ڈبہ نکلا۔ کھول کر دیکھا تو اس میں ایک ہار، مُندوں کی ایک جڑی، دو انگوٹھیاں، دو وزنی چوڑیاں اور دو تین اور زیورات پڑے ہوئے تھے،

سب سونے کے تھے۔ آپ نے زیورات کے ڈبے دیکھے ہیں۔ ہر ڈبہ صرف ایک چیز کے لیے ہوتا ہے۔ ڈبے میں ایک گتہ بچھا ہوا ہوتا ہے جس پر مغل چڑھا ہوتا ہے۔ سوٹ کیس میں سے جو ڈبہ نکلا وہ غالباً بار کا تھا۔ اس میں سے مغل واسا گتہ والا حصہ نکلا ہوا تھا۔ غالباً تمام زیورات کے لیے جگہ بنانے کے لیے ڈبے کی یہ جگہ نکال لیا گیا تھا۔ ڈبے کے ڈھکنے کے اندر اترس کے ایک صرف کا نام پرنٹ کیا ہوا تھا۔ مجھے یہ نام یاد نہیں رہا۔ بری ام پیارے محل کی طرح کوئی نام تھا اور دکان کا ایڈریس بھی پرنٹ کیا ہوا تھا۔۔۔۔۔ ان زیورات سے۔۔۔۔۔ انکشاف ہوئے۔ ایک یہ کہ لڑکی اترس کی رہنے والی ہے اور دوسرا یہ کہ یہ راجپوتی، انڈا کے کی واردار۔ انہیں اگر ایسا ہوتا تو زیورات اور پرس کی نقدی غائب ہوتی۔ متول کی حبیب سے بھی تقریباً دوسرے۔۔۔۔۔ پیر رقم برآمد ہوئی تھی۔

لڑکی حیوان تھی

ہم نے کپارٹمنٹ کو پھر سیل کر دیا۔ بونگی کے ساتھ آئی بھوتی کارو کی واپسی کا انتظام کیا اور بونگی پر پوچھ کر کے تمام اشیاء اپنے ہیڈ کوارٹر میں لے گئے۔ انیکٹر راجہ نے مجھے ذرا آرام کے لیے چٹھی دے دی۔ آرام کیا کرتا تھا۔ رات تقریباً گزرتی تھی۔ ساڑھے آٹھ بجے واپس ہیڈ کوارٹر پہنچا تھا۔ میں جاکے سو گیا۔ اردلی نے وقت پر جگا دیا۔ تیار ہو کر انیکٹر راجہ کے دفتر میں گیا تو دیکھا کہ وہ اس حالت میں دفتر میں موجود تھا کہ کرسی پر بیٹھا ہوا اور ٹانگیں میز پر رکھے ہوئے گہری نیند سویا ہوا تھا۔ اس نے رات والے کپڑے نہیں بدلے تھے۔ میں اسے جگانا نہیں چاہتا تھا لیکن اُس کا خانا ماں اُس کے لیے تیار تھا۔ لے کر گیا اور وہ جاگ اُٹھا۔ معلوم ہوا کہ مجھے آرام کے لیے بھیج کر وہ دفتر میں بیٹھا تھا۔ لیکن اُس کے محنت راستوں اور پہلوؤں پر غور کرتا رہا اور کرسی پر ہی سو گیا۔ اُس نے رات کو ہی اپنے خانا سے کوالا راج بھیج دی تھی کہ اس کا ناشتہ دفتر میں ہی لے آئے۔ یہ لوگ فرض کی ادائیگی کے بڑے

ہی پکڑے تھے۔ اس انگریز نے تہیہ کر لیا تھا کہ تفتیش مکمل کر کے آرام کرے گا۔ میں نے اس میں یہ وصف نوٹ کیا کہ وہ کوئی غیر معمولی طور پر ذہین اور قابل سرانگساں نہیں تھا۔ میں نے اس کے سوالات اور اس کی جرح غور سے سنی تھی۔ اس میں مجھے کوئی خصوصیت نظر نہیں آئی تھی۔ خصوصیت صرف یہ تھی کہ کام میں دیانتدار تھا اور کام کی خاطر آرام قربان کر دیتا تھا۔ اس کے ہاں — اچھا یہ کام کل کر لیں گے — والی خامی نہیں تھی۔ یہی اس کی قابلیت تھی۔ اس نے چند گھنٹوں میں لاہور سے کلکتہ تک کے علاقے کو اپنی تفتیش کی پلیٹ میں لے لیا تھا۔ انگریزوں کے انہی اوصاف دیانتداری، محنت اور فرض شناسی کا جنون نے انہیں اُدھی دنیا کا بادشاہ بنا دیا تھا۔

اس نے گھڑی دیکھی اور سکا کر بولا — ”میں نے بہت سولیا ہے۔ پورے پچیس منٹ اب میں تازہ دم ہو گیا ہوں“ — اس کے چہرے پر شب بیداری اور تھکن کے گہرے اثرات تھے۔ ناشتہ کے دوران اس نے نہایت سنگفہ لہجے میں کہا — ”ہندوستانی لوگ جرم سے پہلے پلان نہیں بناتے۔ خدا کے مجبور سے جو دماغ میں آئے مگر گزرتے ہیں۔ ذرا غور کرو کہ وہ کپارٹمنٹ میں کتنا سراسر جھوٹ گئے ہیں۔ انہیں کپڑا پہن بھی آسان نہیں۔ ہندوستان بہت بڑا ملک ہے۔ انہیں کہاں ڈھونڈو گے؟ پھر بھی مجھے یقین ہے کہ ہم اُس ٹھکانے تک پہنچ جائیں گے جہاں سے ملزم چلے گئے“ — اس نے کہا — ”انیکٹر خان! میں آپ کی تعریف کروں گا کہ تفتیش اور سرانگسانی کے فن میں آپ نے مہارت حاصل کر لی ہے لیکن آپ کی مہارت ابھی تکمیل ہے۔ آپ کو لوگوں کے انتخاب سے اور عکس انتخاب سے ملزم کی نفیات معلوم کرنے کا فن نہیں آتا۔ آپ نے یہ کمال نوکر دکھایا ہے کہ بدلو دار لاش میں سے خوشبو کو گھ لی تھی اور اس سے سو فیصد صحیح قیاس آرائی کی کہ متول کے ساتھ لڑکی تھی۔ آپ کی نظر بہت گہری گئی۔ آپ نے چوڑیوں کے ٹکڑے اٹھائے اور سوٹ کیس میں پڑے ہوئے لڑکی کے کپڑے دیکھ لیے لیکن آپ نہیں بتا سکتے کہ لڑکی مزاج اور طبیعت کی کیسی ہے۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں لڑکی کو دیکھنے بغیر نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ کیسی ہے۔ انیکٹر راجز نے کہا۔ ”اگر لڑکی کو یہ عطا پسند تھا جو کہ خوشبو وہ اپنے پیچھے بھرتی ہے اور اگر اُسے چوڑیوں کا یہ رنگ پسند تھا اور اگر اُسے کپڑوں کے دو رنگ پسند تھے جو آپ نے اُس کے سوٹ کیس میں دیکھے ہیں تو لڑکی پاک ذہن کی نہیں ہو سکتی۔ اس پر حیوانی جذبہ غالب ہے۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ وہ مقتول کے ساتھ گھٹ بھاگ رہی تھی۔ اسی لیے زیورات اور اتنی زیادہ نقدی اپنے ساتھ لے جا رہی تھی۔ یہ اس کے حیوانی جذبے کی نشانی کی دلیل ہے کہ اُس نے مقتول جیسے دہشت پسند و مجرمانہ ملو پر پیرا آدمی کو پسند کیا۔ ہندوستانی لوگ اس طرح اور تیر رنگ پسند کرتے ہیں۔ یہ ان کی انتہا پسندی کا ثبوت ہے۔ جوش میں اگر انتہائی خطرناک جرم یا کارروائی کر گزرتے ہیں اور پھر تھکتا ہے بڑھتے ہیں۔ وہ جرم اور پھبتاؤں کے درمیانی راستے کو قبول ہی نہیں کرتے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ لڑکی جذبات سے مغلوب ہو کر مقتول کے ساتھ جا رہی تھی یا وہ سبھی ماما کی دہشت پسند میر تقی میری دشمن پر جا رہی تھی۔ بہر حال یہ پیش نظر رکھیں کہ لڑکی مقتول کی طرح بے لگام ہے۔ وہ نارمل ذہن کی لڑکی نہیں۔“

”اگر یہ واردات قتل کی عام سی واردات نکلی تو مجھے مایوسی ہوگی۔ میں نے کہا۔“ میں اس گروہ کے زیادہ سے زیادہ افراد کو کپڑے اور انہیں کالا پانی دیا۔ انڈیمان، بھجوانے کو بے تاب ہو کر آپ مجھے جذباتی نہ کریں۔ میں آپ کا ملازم ہوں۔ میری وفاداری میں آپ کو شک نہیں ہوگا لیکن میں یہ نہیں بھول سکتا کہ میں مسلمان ہوں۔ یہ لوگ میری قوم اور میرے مذہب کے دشمن ہیں۔ آپ بے شک اپنا فیشن ادا کر رہے ہیں مگر میں سمجھتا ہوں جیسے آپ میرے دشمنوں کو کپڑے میں میری مدد کر رہے ہیں۔ میں آپ کے سامنے اعتراف کرتا ہوں کہ یہ کیس میرے ذاتی وقار کا مسئلہ ہے۔“

”میرے اپنے جذبات آپ سے ملتے جلتے ہیں۔“ اُس نے کہا۔ ”میں سلطنتِ برطانیہ

کا محافظ ہوں۔ میں جب ہندوستان آنے کے لیے تیار ہو رہا تھا تو مجھے یہاں کی مختلف قوموں کے متعلق تفصیل سے بتایا گیا تھا۔ ہندوؤں کے متعلق بتایا گیا تھا کہ مکار، عیار اور موقع پرست قوم ہے۔ اس کی انہی خصلتوں کو اُجھار اور انہیں اپنے مقصد کے لیے استعمال کرو۔ مسلمانوں کے متعلق بتایا گیا تھا کہ یہ سپاہیوں کی قوم ہے۔ زبان سے کم اور باتوں سے زیادہ بڑبڑتی ہے۔ یہ قوم ہندوستان کی فوجی قوت ہے۔ عقل اور فہم و فراست بھی رکھتی ہے۔ اس کے یہی اوصاف اپنے مقصد کے لیے استعمال کرو۔ میں نے گزشتہ ایک سال میں یہ رائے قائم کی ہے کہ مسلمان قابلِ قدر قوم ہے اور قابلِ اعتماد بھی۔ اس لیے میری دلچسپیاں مسلمانوں کے ساتھ ہیں۔ آج کسی ہندو پولیس افسر نے میرے سامنے ذاتی وقار کا نام نہیں لیا۔ آپ چوتھے مسلمان افسر ہیں جنہوں نے مجھ پر ظاہر کیا ہے کہ ان کا ذاتی وقار بھی کوئی اہمیت رکھتا ہے۔ آپ لوگوں کا یہ وصف مجھے بہت پسند آیا ہے۔“ اُس نے اس قسم کی کچھ اور باتیں کیں اور گھڑی دیکھ کر کہنے لگا۔ ”ہم دونوں جذباتی ہو گئے ہیں۔ آپ فوراً اپنا بیڑا اور ٹیچر وغیرہ لے آئیں۔ ڈی۔ ایس۔ پی سے ایک کانفرنس کرنی ہے اور اُس کے فوراً بعد ہمیں امرتسر کے لیے روانہ ہونا ہے۔ اب ہماری تفتیش اتر اور لاہور میں ہوگی۔“

میں تیاری کے لیے اپنے کوارٹر میں گیا۔ ضروری سامان اٹھوا کر واپس گیا تو انیکٹر راجز تیار تھا۔ اس نے دفتر میں ہی شنبو بنائی۔ وہیں نہایا اور اس کا سامان بھی لگایا۔ ایک انگریز ڈی ایس پی اور ایک انگریز انیکٹر، انیکٹر راجز کے کمرے میں آگئے۔ ہماری چاروں کی کانفرنس شروع ہوئی۔ انیکٹر راجز نے واردات اور تفتیش کی تفصیل سنائی۔ براہِ مشورہ اشیاء سب کو دکھائیں اور تفتیش کا اگلا مرحلہ واضح کیا جس پر ہم روانہ ہو رہے تھے۔ ڈی۔ ایس۔ پی بوڑھا انگریز تھا۔ اُس نے ہمیں بتایا کہ یہ گروہ جو ماما کہلاتا ہے ابھی پوری طرح سامنے نہیں آیا۔ یہ ابھی ابتدائی مرحلوں میں ہے۔ اس کے علاوہ ہر دہشت پسند تحریک کی طرح خطرناک ہیں۔ اُن کی زیر زمین کارروائیوں کا زیادہ تر نشانہ

مسلمان میں لیکن یہ حکومت کو بھی پریشان کریں گے۔ انہیں ختم کرنا اس لیے زیادہ ضروری ہے کہ کوئی نہ کوئی دہشت پسند تحریک انہیں اپنے ساتھ ملا لے گی اور یہ خطرہ تو موجود ہی ہے کہ جرمنی کے تباہ کار جاسوس انہیں استعمال کریں گے۔ اس انکار کو نظر انداز نہ کریں کہ جرمن جاسوس نہ گرم ہو گئے ہیں۔ سوال اور برطانیہ اسٹیل جنس بہتر منصفہ ہے۔ آپ لوگ اس واردات کو صرف قتل کی واردات نہ سمجھیں۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے ہمیں ہمت دی۔ بدایات دیں۔ دوسرے انگریز اسپیکر نے بھی کچھ شوشے دیتے۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے بتایا کہ وہ امرتسر لاہور کے پٹی کشنوں کو اور فوج کے اعلیٰ افسروں کو بذریعہ فون ہمارے متعلق بتا دے گا۔

ان اسپیکر راج نے گھڑی دیکھ کر کہا کہ ڈی کا وقت ہو گیا ہے۔ اُس نے صبح سویرے ریلوے اسٹیشن والوں سے فون پر کہہ کر فٹ کلاس کی دوسٹیں بک کر لی تھیں۔ ہم نے اپنا سامان اور بارشیدہ اشیاں میں سے جن کی ضرورت سمجھی ساتھ لے لیں اور ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ ان اسپیکر راج نے مجھے بھی فٹ کلاس کے سفر کی عیاشی کرائی۔

لو کی حلیتی گاڑی پر سوار ہوئی

اتر کر پٹی کشن نے بیٹے اسٹیشن پر ہمارے استقبال کے لیے اپنا نمائندہ اور ایک انگریز پولیس اسپیکر بھیج دیا تھا۔ ہمارے ڈی۔ ایس۔ پی کی ہدایت کے مطابق وہاں ہماری رہائش کا خفیہ انتظام کر دیا گیا تھا۔ جم وروی میں نہیں تھے نہ ہمیں دروی پہنچی تھی۔ یہ انتظام بھی کرا لیا کہ ہم جہاں بھی جائیں ریلوے میں سے مسلح لیکن بیز وروی پولیس کے ہوشیار اور ذہین افراد ہمارے ارد گرد موجود رہیں۔ خطرہ یہ تھا کہ دہشت پسند کہیں ہم پر وار کریں گے۔ اُن کا وار خفیہ ہوتا تھا۔ ہم نے ممکن حد تک اس کی پیش بندی کر لی تھی۔۔۔۔۔ ہم نے تفصیل کا آغاز ریلوے اسٹیشن سے کیا۔ اسٹیشن ماسٹر کو کارڈ

دن اور وقت بتا کر کہا کہ ہمیں معلوم کرنا ہے کہ یہاں سے ایک عورت سیکنڈ کلاس میں سوار ہوئی تھی۔ کیا اُس نے سیٹ ریزرو کرائی تھی یا نہیں اور وہ کون تھی۔ اسٹیشن ماسٹر نے بگنگ کلر کو بلایا۔ اس کے سامنے یہ مسئلہ رکھا۔ اُس نے اپنا ریکارڈ دیکھا۔ ذہین پر زور دیا اور بتایا کہ حامد علی خان نام کے ایک آدمی نے دو روز پہلے سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ خرید لیا اور اس کے لیے سیٹ ریزرو کرائی گئی تھی۔ جب تاریخ کی اُس کی سیٹ ریزرو ہوئی تھی اُس روز ایک لڑکی نے پورٹ ایکسپریس کے آنے سے دو اڑھائی گھنٹے پہلے سیکنڈ کلاس کا ایک ٹکٹ خرید لیا۔ یہ دونوں ٹکٹ امرتسر سے کلکتہ تک تھے۔ میں نے لڑکی کے پرس سے برآمد کیا پورٹ بگنگ کلر کے ریکارڈ سے ملایا۔ اُسے یہی ٹکٹ دیا گیا تھا۔

بگنگ کلر کو یہ لڑکی اس لیے اچھی طرح یاد تھی کہ اسی تین چار روز پہلے گزرے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اُن دنوں سیکنڈ کلاس کا مسافر کوئی کوئی ہوتا تھا۔ تیسری وجہ یہ کہ وہ لڑکی تھی جو اُس کے کہنے کے مطابق جوان، خوبصورت اور شوخ تھی اور چوتھی وجہ یہ تھی کہ بگنگ کلر نے لڑکی سے کہا تھا کہ اتنے لمبے سفر کے لیے وہ سیٹ بک کر لے تاکہ راستے میں اُسے تکلیف نہ ہو لیکن لڑکی نے کہا تھا کہ ریزرویشن میں وقت گئے گا اور اُسے اسی گاڑی سے جانا ہے۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اُس زمانے میں گاڑیوں میں ریش نہیں ہوتا تھا۔ ایکسپریس اور میل گاڑیاں بڑے سیشنوں پر رکتی تھیں تو اسٹیشن کا عملہ پلیٹ فارم پر موجود رہتا تھا اور سیکنڈ کلاس کے مسافروں پر زیادہ توجہ دیتا تھا کیونکہ اُن دنوں انگریز افسر سفر کرتے تھے جن کے متعلق خیال رکھنا تھا تھا کہ انہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔ اس لڑکی کو ریلوے سٹاف کے دو آدمیوں نے اس طرح گاڑی میں سوار ہوتے دیکھا تھا کہ انجن نے وصل دی تو وہ گیٹ پر نمودار ہوئی۔ دوسری دَسل پر وہ انجن کی طرف چلی اور گاڑی چل پڑی تو وہ دوڑ پڑی اور سیکنڈ کلاس کے ایک کمپارٹمنٹ میں سوار ہو گئی۔ بگنگ کلر کی طرف سے تیسری تھی۔

ہم نے اُس شام کی ڈیوٹی والے ریلوے سٹاف کو بلوایا تھا۔ وہ نہایت کلاکد باتیں بتا رہے تھے۔ ایک نے بتایا کہ اُس نے سارے علی غان نام کے مسافر کو ساتھ سبک کر اُس کی سیٹ والا کپارٹمنٹ دکھایا تھا۔ اُس وقت اس کے پاؤں میں تین اور مسافر تھے۔ ہمارے پوچھنے پر ہمیں بتایا گیا کہ بائیں فارم بہت تھوڑے لوگ تھے۔ گاڑی شام اندھیری ہونے کے بعد امرتسر پہنچی تھی مجھے یقین وقت یاد نہیں رہا، سٹاف کے کہنے آدمی نے بتایا کہ اُس نے لڑکی کو دوڑ کر سینڈ کلاس کپارٹمنٹ میں سوار ہوتے دیکھا اور اس نے یہ بھی دیکھا کہ دو سکھ اس کے قریب ہی کھڑے تھے۔ ایک نے کہا۔۔۔ وہ جا رہی ہے۔۔۔ وہ دوڑے لیکن گاڑی تیز ہو چکی تھی اس لیے وہ چھٹی یا ساتویں بونگی کے تھوڑے کلاس کپارٹمنٹ میں سوار ہو گئے۔ یہ آدمی اُن دونوں سکھوں کو نہیں پہچان سکا۔ اس نے اپنے ایک ساتھی کو بتایا تھا کہ اس نے یہ مشاہدہ دیکھا ہے اور وہ اپنے ساتھی کے ساتھ اس پر تبادلہ خیالات کرتا رہا تھا کہ یہ کیا معاملہ ہو سکتا ہے۔ سٹاف کے چند اور آدمیوں نے بھی لڑکی کو دیکھا تھا لیکن اُسے جانتا پہچانتا کوئی بھی نہیں تھا۔

ہم نے ریلوے سٹاف سے کہا کہ وہ قلیوں اور دیگر افراد سے پوچھتے رہیں کہ ان میں کوئی اس لڑکی کو پہچانتا ہے؟ اور تھر پولیس کے خیر بھی ہمارے بلانے پر آئے ہوتے تھے۔ اُن کے سپرد بھی ہم نے یہ کام کیا کہ معلوم کریں کہ وہ لڑکی کون تھی۔۔۔ میں اور انسپٹر راجندر صرف کی دکان پر چلے گئے۔ زیورات کے ڈبے کے اندر اس کا نام پرنٹ کیا ہوا تھا۔ ہم نے اپنا تعارف کرایا اور اُسے بتایا کہ وہ لڑکی دینتہ ادری سے بہانہ می مدد کرے اور کوئی بات چھپانے کی کوشش نہ کرے ورنہ اُسے نتیجہ بگھٹنا پڑے گا۔ میں نے ڈبے کھول کر اُس کے آگے رکھ دیا اور کہا کہ یہ زیورات اُس کی دکان کے بنے ہوئے ہیں۔ ان کا خریدار کون تھا؟ اُس نے زیورات کو ایک نظر دیکھ کر کہہ دیا کہ یہ اُسی کی دکان کا مال ہے لیکن اُسے گاہک یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس نے اپنا رجسٹر اور کفالت دیکھے اور یاد کرنے کی بھی کوشش کی۔ آخر اُس نے کہا کہ

یہ کم و بیش ایک سال پہلے کی فروخت ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ بالکل اسی ڈیزائن اور وزن کے چار بار اور بالکل ایسی ہی چوڑیاں (جو دراصل کڑے تھے) اُس نے چار گاہکوں کے ہاتھ فروخت کی ہیں۔ ان میں ایک جوان لڑکی تھی جو اپنی ماں کے ساتھ آئی تھی۔ باقی تین مرد تھے۔ اُسے کسی کا بھی ایڈریس معلوم نہیں تھا۔ اس نے سامنے والے دکاندار کو بلایا۔ وہ بھی صراف تھا۔ اُس نے اس سے پوچھا کہ ایک ماں بیٹی اس کی دکان میں دو تین بار آئی تھی۔ پہلی بار انہوں نے زیورات خریدے تھے پھر کچھ ٹھیک کرانے آئی تھیں۔

دونوں دکانداروں نے یاد کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ پھر ایک اور دکاندار کو بلایا گیا۔ لڑکی کا محلہ بتایا گیا۔ پھر ایک اور دکاندار کو بلایا گیا۔ اس چوتھے دکاندار نے کہا۔۔۔ ”اگر تم اُس لڑکی کی بات کر رہے ہو جو یہاں سے اکثر گزرا کرتی ہے تو وہ سردار سرجیت سنگھ کی بیٹی ہے۔“ اس نے یہ بھی کہا کہ یہاں سے ہندوؤں اور سکھوں کی لڑکیاں تو گزرتی ہی رہتی ہیں۔ اس کے متعلق اُسے اس لیے خیال آیا تھا کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ پہلے اُس کی دکان میں گئی تھی لیکن اُسے کوئی ڈیزائن پسند نہیں آیا تھا۔ وہ بتاتا تھا کہ لڑکی بہت شوخ اور منہ پھٹ سی تھی۔ اُس نے سردار سرجیت سنگھ کے گھر کا پتہ بھی بتا دیا لیکن معاملہ شک میں تھا۔ میں نے ان سب سے کہا کہ وہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے رہیں کہ لڑکی کون تھی لیکن یہ احتیاط کریں کہ کسی سے ذکر نہ کریں کہ تفتیش ہو رہی ہے ورنہ مارے جاؤ گے۔

ہم اپنی رہائش گاہ میں چلے گئے۔ انسپٹر راجندر نے کہا کہ یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ لڑکی کھلتے سے بہت پہلے کسی سٹیشن پر اُتر گئی یا اتار دی گئی ہے وہ کہاں اُترتی ہے۔ ذرا سا آرام کر کے وہ ٹیلیفون پر بیٹھ گیا۔ ہمارے لیے ٹیلی فون کا خاص طور پر انتظام کیا گیا تھا۔ انسپٹر راجندر نے ٹیلی فون ایکس چینج سے کہا کہ وہ کسی اور کو کوئی لائن نہ دیں، اور وہ جو نمبر بانگتا ہے فوراً ملاتے چلے جائیں۔ ہم نے ریلوے ٹائم ٹیبل اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ راجندر نے یہ کھول کر دیکھا اور مجھ سے پوچھا کہ جائے واردات یعنی

جہاں سے لاش ملی تھی کوئی ہے۔ میں نے اُسے بتائی تو اس نے ہوٹل ایکسپریس کا اس سے ٹکرا سٹاپ دیکھا اور آپریٹر سے کہا کہ وہاں فوراً ملو دے۔۔۔ اُسے سٹیشن مارشل گیا۔ اُس نے اپنا تعارف کر کے پوچھا کہ فلاں رات ۱۰ ایکسپریس سے ایک لڑکی اُترتی ہوگی۔ اگر وہاں دیکھی گئی ہے تو اُسے امرتسر کے فلاں نمبر پر بتا جائے۔ اس کے بعد اُس نے اگلے شاپ کا نمبر ملایا اور وہاں پہنچی یہی کہا۔ میں حیران تھا کہ یہ شخص کتنے سٹیشنوں سے بات کرے گا۔ کھلے تک بے شمار سٹیشن تھے جہاں ہوٹل ایکسپریس رکتی تھی۔ یہ نگرین پاگلوں کی طرح نگاہوں ہوا تھا۔ اور اکیس پینچ کے لیے مصیبت بن گیا تھا۔ دو گھنٹوں بعد وہ اٹیشن پر پہنچا جہاں لوگی گاڑی سے الگ کر کے دلی بھی گئی تھی۔ اُسے کہیں سے بھی تسلی بخش جواب نہ ملا۔

ہم لڑکی کے متعلق یہی باتیں کر رہے تھے کہ ایک ہندو سب انسپٹر ایک جُڑ کو ساتھ لایا جُڑ نے بتایا کہ وہ لڑکی سردار سرجیت سنگھ کی بیٹی تھی۔ اُسے ایک ریلوے گارڈ کے بیٹے نے دیکھا تھا۔ وہ لڑکی کو بچا تھا۔ میں نے سب انسپٹر سے کہا کہ لڑکے کو بھی ساتھ لانا تھا۔ اُس نے اُس وقت اُٹھ کر بھاگ دیا۔ انسپٹر راجرنے اُسے ڈانٹ کر کہا کہ شہادت تو ساتھ لاتے۔۔۔ لڑکا آگیا۔ وہ سولہ سو سال کی عمر کا لڑکا تھا۔ ہانہ کرتے جھجکتا اور رٹا تھا۔ یہی حوصلہ افزائی پر اُس نے بتایا کہ وہ لڑکی کو اچھی طرح جانتا ہے۔ مختصر یہ کہ لڑکیوں میں دلچسپی لینے والے فوجیوں میں سے تھا۔ یہ لڑکی سوشل سروس کی تھی۔ ایف۔ اے کر کے اُس نے تعلیم چھوڑ دی تھی۔ سیاست میں دلچسپی لیتی تھی اور ایس جی سرگرمیوں کی بدولت مشہور ہو گئی تھی۔ اس لڑکے نے یہ بھی بتایا کہ اس نے اس لڑکی کو رات دس بجے گھر بلاتے بھی دیکھا ہے۔ اُس کا نام دلچیت، کور تھا اور کوئی کملائی تھی۔ اس لڑکے نے اُسے ہوٹل ایکسپریس پر سوار ہوتے دیکھا تھا۔ وہ چکر لڑیلو سے کوارٹروں میں رہتا تھا جو ریلوے سٹیشن کے ساتھ ہی تھے اس لیے تعویذ بلیک کے لیے بل گڑیاں دیکھ کر کبھی کبھی پلیٹ فارم پر چلا جاتا تھا۔

اس نے لڑکی کو ریلوے سٹیشن کی حدود میں داخل ہوتے دیکھا تو اُس کے پیچھے چل پڑا۔ اس نے لڑکی کو بالکل اسی طرح گھاڑی میں سوار ہوتے دیکھا جس طرح ریلوے سٹاف کے افراد نے بتایا تھا۔ لڑکی کے چال چلن کے متعلق وہ کوئی ایسی راستہ نہ دے سکا جسے قابلِ اعتماد کہا جاسکتا۔ اُس نے کہا کہ کالج کے بعض لڑکوں کے ساتھ اُس کا دوستانہ تھا۔ مشہور یہی تھا کہ لڑکی اچھے چلن کی نہیں۔

اس لڑکے نے بھی اُس کے باپ کا نام سردار سرجیت سنگھ بتایا جو امرتسر کا ایک مالدار تاجر تھا۔ لڑکی کے دو بھائی تھے۔ ایک بڑا اور ایک چھوٹا۔ لڑکے نے گھر کا پتہ بتا دیا اور ہمارے کئے پر ساتھ چلنے کی بھی پیش کش کی۔ ہم نے لڑکے کو یہ کہہ کر چھٹی دے دی کہ وہ گھر سے غیر حاضر نہ رہے کیونکہ کسی بھی وقت اُس کی ضرورت محسوس ہو سکتی ہے۔ انسپٹر راجرنے ہنسی مذاق کا بھی عادی تھا۔ اُس نے لڑکے کے ساتھ لڑکی کے متعلق مذاق کے لیے میں دو تین باتیں کیں تو لڑکے کے دل سے ہمارا ڈور نکل گیا۔۔۔ وہ چلا گیا۔

لڑکی امرتسر میں

ہم دونوں اس مسئلے پر بحث کرنے لگے کہ لڑکی کے گھر چھاپہ مارا جاتے یا کچھ اور انتظار کیا جائے۔ انسپٹر راجرنے کا خیال تھا کہ ہمیں لڑکی برآمد کرنی ہے۔ لڑکی راستے میں کہیں اُتر گئی تھی یا اسے زبردستی اتار لیا گیا تھا۔ ممکن نظر نہیں آتا کہ وہ یہاں اپنے گھر میں ہو۔ اگر ہمارا چھاپہ ناکام رہا تو اس واردات سے متعلقہ افراد چوکے ہو جائیں گے۔ اگر لڑکی بھی اس جُرم میں شامل ہے تو رپوش ہو جائے گی۔ میں اُس سے متفق تھا اور میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ وہ دو سیکھ کون تھے جو لڑکی کے تعاقب میں دوڑے اور گاڑی کی کسی پچھلی بوگی میں سوار ہو گئے تھے؟ میں نے انسپٹر راجرنے سے اس رائے کا اظہار کیا کہ لڑکی جس انداز سے گاڑی میں سوار ہوئی اس سے

دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ گاڑی چلنے کے انتظار میں کھڑی رہی۔ گاڑی چلی تو وہ دوڑ کر اُس کپارٹمنٹ میں سوار ہوئی جس میں مقتول موجود تھا۔ اس سے دوسری بات یہ سامنے آتی ہے کہ وہ مقتول کے ساتھ گھر سے گئی رہی تھی۔ اس کے تعاقب میں جانے والے اس کے بھائی ہوں گے جنہیں کچھ دیر پہلے شک ہو گیا ہوگا کہ اُن کی بہن بھاگ رہی ہے۔ وہ گھر میں اُس کے تعاقب میں چلے ہوں گے۔ انہوں نے، جن راستے میں مقتول کو قتل کیا، گاڑی سے نیچے پھینکا اور لڑکی اُس کے جاکر کہیں گاڑی سے اتار لیا۔ اب یہ معلوم کرنا تھا کہ لڑکی کو وہ واپس لے آئے ہیں یا قتل کر کے کہیں پھینک آئے ہیں۔

”یہ ضروری نہیں کہ وہ اُس کے بھائی ہوں“ — انسپٹر راجہ نے کہا — ”وہ دونوں یا اس میں سے ایک مقتول کا رقیب ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کسی دوسرے دہشت پسند گروہ کے آدمی ہوں اور اُن کی رقابت سیاسی ہو۔ اس صورت میں لڑکی کی تلاش بے سود ہوگی۔ اُسے قتل کیا جا چکا ہوگا۔ ایک آدھ دن انتظار کر لیا جائے۔“

اب ہم تفتیش کے اُس غامض داخل ہو گئے تھے جہاں سیاہ کالی تاریکی اور راستوں کی بے مانی جھلیاں تھیں۔ صرف ایک کارروائی سمجھ میں آتی تھی۔ سردار سُر جیت سنگھ کے گھر پر چھاپہ۔ گڑبھاگ چوٹ ہونے کا ڈر تھا۔ ہمیں مجبوروں سے کام لینا تھا۔ فوری طور پر میں نے یہ کام کیا کہ دو سہ ماہی مچھلیاں انہیں سُر جیت سنگھ کے گھر کا پتہ بتایا اور اس گھر پر نظر رکھنے کو کہا۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ اُس محلے میں ایک مسلمان عورت بھی مجبوری کا کام کرتی ہے، وہ مدد دے گی۔ میں نے انسپٹر راجہ سے بات کر کے، اُسے اس عورت کو استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ اُن دونوں نے وہیں ملے کر لیا کہ ایک آدمی غبارے سے بچنے کے بہانے جانے لگا اور دوسرا چارپائیاں بننے والے کا ہروپ دھارے لگا۔ میں نے انہیں ضروری ہدایات دے کر نہایت

کر دیا۔ مجبوروں کا ایک خاص انداز ہوتا ہے جو میں بیان نہیں کروں گا کیونکہ پاکستان میں بھی مجرما استعمال ہوتے ہیں۔ میں پولیس کا راز فاش نہیں کرنا چاہتا۔

اس بحث اور کارروائی میں بہت وقت گزر گیا۔ دن کے پچھلے پہر ہمارے پاس ایک ریلوے گاڑی آگیا۔ یہ اُس لڑکے کا باپ تھا جس نے ہمیں لڑکی کے متعلق بتایا تھا۔ گاڑی کو ہم نے اندر بلا لیا۔ اتفاق سے مسلمان تھا اور پنجابی۔ میں نے پنجابی میں ہی اُس سے باتیں کیں۔ اُس نے یہ بیان دیا کہ وہ ابھی ابھی ڈیوٹی سے آیا ہے اور اُسے اس کے بیٹے نے بتایا ہے کہ آپ نے اُسے بلایا تھا۔ گاڑی نے وہ تمام باتیں بتائیں جو ہم نے لڑکے سے پوچھی تھیں۔ اُس نے بتایا کہ وہ کل رات گاڑی کے ساتھ رہا تھا۔ اُس کی ڈیوٹی لاہور تک تھی۔ گاڑی کلکتہ کی طرف سے آرہی تھی۔ امرتسر سے کوئی تیس میل دور کسی ٹیشن پر گاڑی رکی، تو انٹر کلاس میں اُسے دو سکھ سافرنکٹ انسپٹر کے ساتھ جھگڑتے نظر آئے۔ وہ رگ گیا۔ ان دو سکھوں کے ساتھ ایک لڑکی تھی۔ جھگڑا یہ تھا کہ یہ لوگ بلا ٹکٹ سفر کر رہے تھے۔ وہ پیسے تو دے رہے تھے لیکن ٹکٹ انسپٹر کا مطالبہ زیادہ تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ وہ ریلوے قانون کے مطابق چارج کر رہا ہے۔ لڑکی خاموش بیٹھی تھی ایسے لگتا تھا جیسے وہ ان سکھوں کے ساتھ نہیں ہے لیکن وہ اُن کے ساتھ تھی۔ گاڑی نے اُن کا جھگڑا طے کر لیا۔ وہ امرتسر تک آ رہے تھے۔ گاڑی امرتسر آئی تو گاڑی نے دیکھا کہ وہ سکھ لڑکی کو ہٹکے ہٹکے دھکے دے کر لے جا رہے تھے۔ اُس نے یہ بھی دیکھا کہ لڑکی شکل و صورت اور کپڑوں سے شہری اور امیر لگتی تھی لیکن اس کے پاؤں میں جوتی نہیں تھی۔ گاڑی نے کوئی ٹیک نہ کیا اور اسے کوئی گھوڑی جھگڑا سمجھا۔

گاڑی لاہور تک گاڑی لے جا کر واپس امرتسر آیا تو اُس نے ریلوے سٹاف کے دو تین آدمیوں کے ساتھ گپ شپ کے انداز میں اس لڑکی کے متعلق بات کی۔ اُسے بتایا گیا کہ یہ وہی لڑکی

بیٹوں جو چلتی گاڑی پر سوار ہوئی اور اس کے پیچھے دو سیکھ دوڑے تھے۔ وہ لڑکی تک تو نہ پہنچ سکے، پچھلی بوگی میں سوار ہو گئے۔ سقے گاڑ کو یہ بھی بتایا گیا کہ اس لڑکی کا سراغ لگانے کے لیے ایک انگریز اور ایک ویسی پولیس آفیسر بلائے آئے تھے۔ بہر حال ان لوگوں نے اس واقعہ کو اتنی سی اہمیت دی کہ اس کے متعلق مذاق کے انداز سے باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد گاڑ کو اس کے بیٹے نے بتایا کہ ہم نے اسے بلایا تھا۔ گاڑ نے نفوری سمجھا کہ وہ ہمیں ملے۔ اُس نے ایک اچھے شہری کا فرض ادا کیا تھا جس سے ہمیں بڑی "دسی" ہم اس لائن پر سوچنے لگے کہ لڑکی کو واپس لے آئے ہیں۔ ہمیں یہ محسوس نہ تھا تھا کہ لڑکی "دسی" ہے یا قتل کر دی گئی ہے۔ میں نے انسپکٹر راجر کو بتایا کہ پنجاب کے مسلمان اور سکھ گھر سے جانے والی لڑکی کو ہنسا نہیں کرتے۔ قتل کر دیتے ہیں انسپکٹر راجر نے سوچ میں پڑ گیا۔ اُس نے گاڑ کو اسٹوری ادا کر کے اُسے بھیج دیا۔ سوچ سوچ کر اُس نے مجھے کہا: "آج رات دس بجے کے بعد چھاپ ماریں گے۔ جن آدمیوں کی ضرورت ہے انہیں بلاؤ۔"

وہ انگریزی سمجھتا تھا۔ ایک طرف بٹ کر مری ہوئی آواز میں بولا — ”آجائیں“ —
 ڈیڑھ گھنٹے کے ساتھ ہی بیٹھ کا مکہ رہا۔ ہمیں وہاں لے جا کر بیٹھا۔ اُس پر ایسی خاموشی طاری تھی
 جس میں اُس کی بے بسی تھی۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ جس باپ کی بیٹی بے لگام ہو جائے وہ
 تو جیتے جی مر جاتا ہے۔ کچھ ایسی ہی حالت اُس کی ہو رہی تھی۔ میں نے اُسے کہا — ”آپ کے
 لیے بڑی تکلیف دہ صورت پیدا ہو گئی ہے لیکن ہماری مجبوری دیکھیں۔ میں آپ کی مدد کرنے کی
 پوری کوشش کروں گا، بشرطیکہ آپ نے تعاون کیا دلچسپ کور آپ کی بیٹی ہے؟“
 ”جی ہاں۔ اُس نے آہ بھرنے کے انداز سے کہا۔

”اُسے باہر لے آؤ۔“ انسپکٹر اجرنے کہا۔ ”ہمارے سامنے لاؤ۔“ وہ اُٹھا اور سر جھکاتے ہوئے اندر چلا گیا۔ انسپکٹر اجرنے مجھ سے پوچھا ”کیا میں اس پر اعتماد کرنا چاہیئے؟ وہ لڑکی کو پچھلے دروازے سے بھاگ دے گا۔“

”میں نے مکان کے ہر طرف آدمی پوسٹ کر رکھے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”انہیں پوری ہدایات دے دی ہیں۔ اس گھر سے کوئی نہیں بھاگ سکتا۔“

”مہمان کے مکان ملے ہوئے ہیں۔“ انسپکٹر اجرنے کہا۔ ”جھتوں کے اوپر سے

بہن کو بھائی کنوئیں میں پھینکنے لگے

شام کے بعد ایک مُخبر آیا۔ اُس کے ساتھ دو عورت تھیں جن کا اُس نے ذکر کیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ لڑکی گھر میں تھیں اور اُسے قیدی میں رکھا ہوا ہے۔ اُسے غالباً مارا پیٹا بھی جا رہا تھا۔ انسپکٹر راج نے اُسے لکھا کہ ابھی چھاپہ مارا جاتا ہے۔ ہم دونوں اُسٹے۔ ریولور میجر میں ڈالے۔ بغیر روپی پولیس کے نہ آدمی ہم نے اپنے ساتھ رکھے ہوئے تھے انہیں ساتھ لیا۔ مُجر کو گیارہ بیٹیاں اور بہن چل پڑے۔ راستہ گدی پہ چوکی تھی۔ گھر یا دو دُور نہیں تھا..... خاصا امیر لڑکھڑکتا تھا۔ ہم نے اپنے آدمیوں کو مونڈوں بٹوں پر کھڑکھڑا کر دیا اور دو واڑے پر دھنک دی۔ سردار سرجیت سنگھ خود ہی باہر گیا۔ میں نے اپنا اور انسپکٹر راج کا تعارف کرایا۔ وہ پڑھا لکھا آدمی تھا۔ سوسائٹی میں اُسے لیڈروں جیسا مقام حاصل

کونکے کی صرف ایک پڑی تھی۔ سیکنڈ کلاس کپارٹمنٹ میں اسی کی چوڑیوں کے ٹکڑے تھے۔ میں نے اس کے سر کو ٹوٹا دیا۔ وہی خوشبو تھی جو ہتھول کے کوٹ کے ساتھ تھی۔ میں نے اس کا بازو چھوڑا نہیں، اسے باہر لے گیا اور بیٹھنے والے کمرے میں، اپنے آدمیوں کے حوالے کر کے بٹھا دیا۔ اس کا باپ اور بھائی بھی وہیں تھے۔ یہ سارے چھ آدمی ابالریہ ان کے پاس کھڑے تھے۔ انپکٹر راجرز نے فوری طور پر مکان کی تلاشی لینے کو کہا۔ اُس وقت نہایت سنگھ اچانک بیدار ہو گیا۔ پھر وہ داروں کے روکنے کے باوجود وہ ڈیوڑھی میں میرے پاس آگیا۔ باپ میں مجھ سے التجا کے لیے کہا کہ تم میرے ہندوستانی بھائی ہو۔ میری عزت اور میرے نام پر تم میں مظلوم باپ ہو۔ اس لڑکی نے میری داڑھی میں پتلا پکڑ دیا۔ میرے سر کی تلاشی نہ تو ان لوگوں کو کیا کہ نہیں ملے گا سوائے اس لڑکی کے۔ مجھ سے جو پوچھو گے بالکل سچ بتاؤں گا، باہر لوگ اکٹھے ہو رہے ہیں۔ مجھے بے عزتی سے بچاؤ۔

انپکٹر راجرز یہ سننے کے لیے بیاب ہو رہا تھا کہ سرجیت میرے ساتھ کیا بات کر رہا ہے۔ میں نے اُسے بتا دیا۔ اس نے سرجیت کو گھسے کہا۔ ”تم عزت دار انسان ہو، میں نے تمہیں کہا کہ بیٹی کو باہر لے آؤ اور تم نے اندر جا کر بیٹوں سے کہا کہ اسے کنوئیں میں پھینک دو۔“ سرجیت سنگھ اپنی صفائی میں ہونے لگا تو انپکٹر راجرز نے اسے شٹ اپ کہہ کر کمرے میں بھیج دیا۔ ہم نے گھر کی تلاشی لی۔ کم دہشت میں گھسے صرف بتوئے۔ کوئی قابل اعتراض چیز کاغذ یا ہتھیار ملا۔ لڑکی کے ذاتی کمرے اور شوٹ کیسوں میں سے بھی کچھ نہ ملا۔ خط کی وہ شیشی مل گئی جو وہ استعمال کرتی تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ انہیں دتی ہے یا جاتا ہے یا امرتسر میں ہی پوچھ گچھ کر جاتا ہے۔ انپکٹر راجرز نے کہا کہ دتی ہے جانا بہتر ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ کام اپنے ہیڈ کوارٹر کے مخصوص کمرے میں آسانی سے ہو سکتا ہے۔ اگر انہوں نے اقبال جرم کر لیا تو نشاندہیوں اور شہادت کی فراہمی کے لیے امرتسر آیا جاسکتا ہے۔ رات کے وقت کوئی موزوں ریل گاڑی دلی نہیں

جاتی تھی۔ ان سب کورات کے لیے حوالات میں بند کیا اور ہم اپنی جگہ چلے گئے۔ علی الصبح گاڑی جاتی تھی۔ ہم نے سب ملزموں کو حوالات سے نکلوا کر گاڑی میں بٹھایا اور دلی لے گئے۔

چلتی گاڑی میں قتل

آپ کو بتا چکا ہوں کہ ہمارا شعبہ سی آئی ڈی کے اندر ایک خفیہ سی آئی ڈی تھی یہاں یہ بھی مزدوری نہیں سمجھا جاتا تھا کہ تلاشی، برآمدگی اور نشاندہی کے وقت شہر ساتھ رکھے جائیں اور ملزموں کو گرفتار کر کے کسی مجسٹریٹ سے ریمانڈ لیا جائے یا قانون شہادت کے تقاضے پورے کیے جائیں۔ اس شعبے کے تفتیشی کمرے دہلی کے خانے میں جو مشتبہ آتما تھا وہ صرف اس صدمہ میں صبح اور سلامت رہتا تھا کہ آتے ہی اقبال جرم کر لے یا قابل قبول ثبوت پیش کر کے ثابت کر دے کہ اُس کا اس واردات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں یا وہ مقام واردات یا واردات کے علاقے سے غیر حاضر ALIBI ثابت کر دے، مگر ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کیونکہ وہاں اُسی کو لے جایا جاتا تھا جس کے خلاف شک پختہ ہوتا تھا اور اُس کے خلاف خاصی شہادت ہوتی تھی۔ دراصل قصہ یہ تھا کہ انگریز ۱۸۵۷ء کے تجربے سے بہت خائف تھا۔ اس کے بعد وہ کوئی ذرا سا خطرہ مول لینے کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔ آپ نے حکایت ”میں پڑھ لیا ہوں گا کہ ۱۸۵۷ء میں مسلمان مجاہدین کس طرح اچانک اُٹھے اور انگریزوں سے دلی جیسا شہر جیت لیا تھا۔ انگریز کے لیے یہ حادثہ“ غیر متوقع تھا۔ اُس نے امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں اور لاہور میں مسجد شہید گنج کے سلسلے میں مظاہرین پر جو ظلم وقتہ زور ان کے ساتھ جو دہشتانہ سلوک کیا تھا وہ بھی ۱۸۵۷ء کے زخم سے گہرا کر لیا تھا۔ وہ ہندوستان پر گرفت بے حد مضبوط کرنا چاہتا تھا اس لیے وہ چھاپا کبھی میڈیکل کپڑی نہ رہا تھا۔

اسی مقصد اور پرانے خطروں کے پیش نظر انگریز نے دلی میں یہ محکمہ قائم کیا تھا اور اس کے

تفتیشی کمرے کو مذبح خانہ بنا رکھا تھا۔ میں نے وہاں ملازموں اور شبہ افرا کے ساتھ جو سلوک ہوتا دیکھا ہے وہ آپ تصور میں بھی نہیں لاسکتے۔ میں ایسے تشدد کا قائل نہیں تھا لیکن میں انگریزوں کو روک نہیں سکتا تھا۔ وہ ہندوستانیوں کو اس ملک کے قابل سمجھتے تھے، مگر میں "تانا" نام کی اسلام دشمن دہشت پسند تحریک کے کسی ممبر کو بخشے پر آمادہ نہیں تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اس لڑکی سے اس تحریک کے ممبروں کی نشان دہی کراؤں گا اور آپ کو اپنے تفتیشی کمرے کی چکی میں پیسوں گا۔ انگریز اپنی سلطنت کے تحفظ و استحکام کے لیے ورنہ ہندوستان میں اپنی قوم اور اپنے مذہب کے تحفظ کے لیے ورنہ ہندوستان پر تیار ہو گیا۔ ہم نے جاکر سردار سر جیت سنگھ، اس کے دونوں بیٹوں اور اس کی بیٹی کے لیے نہایت اچھے کھانے کا انتظام کیا اور انیس الگ الگ کمرے میں بند کر دیا۔ میں نے چار دن سے کہہ دیا کہ پنج بوگ تو آرام میں رہو گے۔ میرا پیہری کرو گے تو بڑی بڑی موت ہو گے۔

رات بارہ بجے کے بعد ہم نے لڑکی کو نکالیا اور اسے خصوصی کمرے میں لے گئے۔ وہ بائیس سال کی ناصبی غاصبوت لڑکی تھی۔ اس کا رنگ صاف ستھرا تھا مگر ڈاڑھ ہوا تھا۔ میں نے اسے کہا۔ "میں تمیں خبردار کر چکا ہوں کہ یہاں میری پیہری کرو گی تو تمہارا انجام بھیسا ملک ہوگا۔ اب تمیں کوئی اور پسند و نفیست نہیں کی جائے گی۔ ہمارے پاس تمہارے خلاف بہت سی شہادت موجود ہیں۔ میں نے اس کے سینڈل پر سر، زلیورات کا ڈبہ اور اس کی چوڑیوں کے ٹکڑے اس کے سامنے رکھ دیئے تھے۔ میں نے کہا۔ "گھنٹھام کے ساتھ تم کلمتہ جاری بھی تھی۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟"

"ہاں۔۔۔ اس نے غم زدہ آواز میں جواب دیا۔ "میں اُس کے ساتھ امرتسر سے سوار ہوئی تھی۔" میرے اگلے سوال سے پہلے ہی اس نے کہا۔ "میں کچھ بھی نہیں چھپاؤں گی۔ میری ایک بات مان لیں، میرے باپ کو چھوڑ دیں۔ ان کا اس کیس کے ساتھ کوئی تعلق

نہیں۔ میں نے پہلے ہی انہیں بہت پریشان کیا ہے۔ انہیں میرے جرم کی سزا دیں۔" اور تمہارے بھائی؟
"دونوں کو میرے سامنے پھانسی چڑھا دیں۔" اس نے کہا۔
"کیوں؟"

"دونوں قاتل ہیں۔" اس نے کہا۔ "انہوں نے گھنٹھام قتل کیا ہے۔" وہ رونے لگی اور آگے بول نہ سکی۔

میں نے انکسٹراجر کو اس کا بیان سنایا۔ اس نے کہا کہ اسے کہوں کہ یہ تمام واقعہ غور ہی سنا دے۔ اس کے بعد ہم جرح کریں گے۔ میرے کہنے پر اس نے مختصر سا بیان دیا جو اس طرح ہے کہ گھنٹھام کے ساتھ اس کی دوستی تھی۔ وہ اسے ملنے دیتی تھی اور تسرا کرتا تھا۔ اس نے گھنٹھام کے ساتھ گھر سے بھاگنے کا پروگرام بنایا۔ دن طے ہو گیا۔ گھنٹھام دو روز چھپے امرتسر گیا۔ اس نے سینڈ کلاس میں ایک سیٹ بک کرالی۔ لڑکی نے سیٹ اس لیے بک کر لی کہ اس کا فرانسیسی ریکارڈ میں نہ آئے۔ گھنٹھام نے اسے کہا تھا کہ سینڈ کلاس میں بک مل جائے گی۔ اس کلاس کی بک زیادہ نہیں ہوتی۔ اگر کوئی سیٹ نہ ملی تو وہ مسافروں سے یہ بکے گا کہ میری بیوی ہے۔ اسے سیٹ نہیں ملی۔ اس صورت میں گھنٹھام فرش پر بستر ڈال لے گا۔ لڑکی نے گاڑی کے وقت سے بہت پہلے سینڈ کلاس کا ٹکٹ خرید لیا۔ گھنٹھام اپنے ایک دوست کے گھر ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ وقت پر شین آگیا۔ لڑکی نے گھر سے زیورات اور نقدی چرائی اور شین پر چل گئی۔ وہ پلیٹ فام پر اس وقت گئی جب گاڑی چل پڑی تھی۔ اس نے دانستہ تانیر کی تھی۔ وہ دوڑ کر گھنٹھام کے کپارٹمنٹ تک پہنچی۔ وہاں دو شین خالی تھیں۔ گھنٹھام نے دوسرے مسافروں کو بتایا کہ وہ اس کی بیوی ہے۔

دونوں غرض تھے کہ فرار کا میاب ہے۔ گاڑی دلی پہنچی تو ان کے دلوں سے پکڑے جانے کا

ڈھانچا لیا۔ دوسرے مسافر آتی آتے گئے اور کپار ٹنٹ میں ان دونوں کے سوا کوئی نہ رہا۔ وہ اور زیادہ خوش ہوئے۔ اسی خوشی کا اثر تھا کہ وہ کپار ٹنٹ کا دروازہ اندر سے بند کرنا بھول گئے۔ دلی سے کچھ تاشی فکلی تو وہ دونوں ایک ہی سیٹ پر کھائے ہوئے تھے اور دنیا کو اور دنیا کے خطروں کو بھول گئے۔ اسے یاد نہیں کہ کتنا وقت گزرا تھا۔ یہ ایک بے خبر کھانسی تھی جس کے شاپ بہت دور دور تھے۔ گاڑی پوری رفتار سے جا رہی تھی کہ اچانک دروازہ کھلا۔ دو آدمی اندر آ گئے۔ انہوں نے دروازہ بند نہیں کیا۔ کپار ٹنٹ میں نہ فٹ ایک بقیہ جل رہی تھی۔ گشتنام نے دوسری بقیہ بھی جلا دی۔ اندر آنے والے آدمی لوہی کے بھائی تھے۔ اُس وقت لڑکا گشتنام کے ساتھ لگی بیٹھی تھی۔ بھائیوں کو دیکھ کر کوکوڑی ٹٹی۔ اُسے بھائی نے اُس وقت گشتنام کی گردن دونوں ہاتھوں میں جکڑ لی جب وہ سیٹ سے اٹھ رہا تھا۔ لڑکی نے اُسے چھوڑنے کے لیے بھائی کے ہاتھ پکڑے۔ چھوٹے بھائی نے بہن کی کلائی پکڑ کر لڑکی کو اس کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔ بھائی نے اُسے بازو مروڑ کر بے بس کر لیا اور اسے پٹیا بھی۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ گشتنام زندہ ہے یا مر گیا ہے۔ بڑے بھائی نے اسے گھسیٹا اور دھڑکنے لگا۔ سب سے گیا۔ چھوڑا تو وہ گر پڑا۔ دونوں بھائیوں نے اُسے دھکیل کر گاڑی سے باہر پھینک دیا۔ لڑکی بہت تھکی۔ بھائیوں نے اسے گھونٹوں سے پٹیا اور چاقو اس کی گردن پر رکھ کر کہا کہ وہ چپ نہ ہوئی تو اس کی گردن کاٹ کر لاش باہر پھینک دیں گے۔ باہر اندھیر تھا۔ لڑکی نے بتایا کہ اچانک اس نے محسوس کیا جیسے اس کے حلق میں کوئی چیز پھنس گئی ہے اس کے بعد وہ بول نہ سکی۔ کبھی سمجھتی جیسے یہ خواب ہے۔ اور جب اسے خیال آیا کہ یہ حقیقت ہے تو اس کے حلق میں مہینسی ہوئی چیز اور زیادہ محسوس ہوئی۔ اس کا جسم جھنجھکا گیا اور دماغ بھی جواب دے گیا۔ گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی۔ ایک بھائی نے باہر دیکھا اور کہا۔ ”اگے سٹیشن ہے۔ گاڑی روکے گی۔“ اُس نے لڑکی سے کہا۔ ”اگر تم نے گاڑی سے اتر کر کوئی ایسی سیڑھی حرکت کیا بات کی تو ہم تمہیں سب کے سامنے قتل کر دیں گے۔ اگر

خاموش رہو گی تو ہماری بھی عزت رہ جائے گی اور تمہاری بھی۔ ہم تمہیں واپس گھر جبارے ہیں۔ یہ سب تمہاری عزت کے لیے ہے۔“

گاڑی اتنی آہستہ ہو گئی کہ بھائیوں نے لڑکی کو چلتی گاڑی سے اتار لیا۔ ایک بھائی نے اتارنے سے پہلے کپار ٹنٹ کی تکیاں بھجادی تھیں اور اترتے وقت دروازہ بند کر دیا تھا۔ پلیٹ فارم ابھی بگے تھا۔ بھائی اسے باہر لے گئے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ یہ کون سا سٹیشن ہے۔ شہر میں گئے اور نہایت معمولی ہوٹل میں ٹھہرے۔ وہاں بھائیوں نے اس سے پوچھا کہ زیورات اور نقدی کہاں ہے؟ اس نے کہا کہ سب کچھ گاڑی میں رہ گیا ہے۔ وہ بہت پریشان ہوئے۔ گاڑی سے اترنے کی جلدی میں انہیں نقدی اور زیورات کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ لڑکی کے سینڈل بھی گاڑی میں رہ گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد صبح ہو گئی۔ وہ ریلوے سٹیشن پہنچے۔ کسی سے پوچھا کہ انہیں امرتسر جانا ہے، گاڑی کتنے بجے آئے گی۔ انہیں بتایا گیا کہ لاہور جانے والی گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی ہے اور چلنے والی ہے۔ بھائیوں نے ٹکٹ لینے میں وقت ضائع نہ کرنا چاہا۔ بہن کو اپنے ساتھ دوڑاتے پلیٹ فارم پر گئے۔ گاڑی چل پڑی۔ وہ اندر کلاس کے ڈبے میں سوار ہو گئے۔ دلی اور امرتسر کے درمیان ایک ٹکٹ چیکر آیا۔ اسے انہوں نے بتایا کہ وہ فلاں سٹیشن سے جلدی میں سوار ہوئے ہیں اس لیے ٹکٹ نہیں لے سکے۔ ان کا ٹکٹ چیکر کے ساتھ جھگڑا بھی ہوا جو گارڈ نے آکر ختم کر لیا۔

وہ امرتسر پہنچے۔ لڑکی کو گھر لے گئے جہاں اُسے پٹیا لگوا کر بے میں بند کرنے کو کہا گیا۔ اگلی رات ہم اُس کے گھر پہنچ گئے۔ لڑکی نے بتایا کہ اُس کا باپ اندر آیا۔ وہ بہت گویا ہوا تھا۔ اُس نے بہن کو نکالیا دیں اور بیٹوں سے کہا۔ ”باہر پولیس کے دو انکپٹر آئے بیٹھے ہیں۔ ایک دہلی اور دوسرا انگریز ہے۔ وہ اس منہ کالی کو بلارہے ہیں۔ یہ تمہیں جیل بھجوانے کی۔“ بیٹے باپ کو بتا

جکے تھے کہ وہ اپنی بہن کے دوست کو قتل کر آئے ہیں۔ انہوں نے بہن کو کپڑا اور کنوئیں کی طرف گھسیٹ لگے۔ باپ نے کہا کہ اسے کنوئیں میں پھینک دو۔ ماں نے شور مچا دیا اور بیٹیوں کو گالیاں دے کر کہا کہ یہ تمہاری بہن ہیں جکے کنوئیں میں نہ پھینکیا۔ بھائیوں نے اسے بازوؤں اور ٹانگوں سے پکڑ کر اٹھایا۔ اور ہم نے اسے پھینکا دیا۔

لڑکی نے مجھے وحشی بنا دیا

میں نے یہ سارا بیان انکپٹر راء، رکن سدا دیا، لڑکی ایف۔ اے پاس تھی لیکن انگریزی آسانی سے نہیں بول سکتی تھی۔ میوزم میں بھی تھا کہ وہ پنجابی میں بات کرے تاکہ کوئی بات اس کے دل میں نہ رہ جائے۔ اس نے بیان تو دے دیا لیکن وہ نہیں سمجھتی تھی کہ اس کے لیے بے حد خطرناک مرحلہ تو اب آیا ہے۔ میں نے اور انکپٹر راجرنے جرح تیار کر رکھی تھی۔ ہم نے وہ ڈسک جس پر مانتا، لکھا ہوا تھا اور کاغذ کا وہ ٹکڑا جس میں الاپچی کے دانے پلٹے ہوئے تھے اس کے آگے رکھ دیئے۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ یہ دونوں چیزیں مقتول کی جیب سے برآمد ہوئی تھیں۔ لڑکی سے پوچھا۔ ”اس ڈسک اور کاغذ کی تحریر کا مطلب کیا ہے؟“

”مجھے معلوم نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ اس کے انداز سے صاف پتہ چلتا تھا کہ جب وہ بول رہی ہے۔

”گھنٹام کے ساتھ تمہاری دوستی کہاں اور کس طرح شروع ہوئی تھی؟“

”یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔“ اس نے پہلے سے انداز سے جواب دیا۔ اس کے متعلق کچھ نہیں بتاؤں گی۔“

”گھنٹام تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے امرتسر گیا تو کون سے دوست کے پاس

ٹھہرا تھا؟“

”مجھے معلوم نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”دلچسپ کوربائیں نے اسے نرم لہجے میں کہا۔“ تم ان تمام سوالوں کا جواب دے دو گی مگر اس وقت تک تمہاری یہ حسین صورت چڑیلوں کی طرح ہو چکی ہو گی اور تمہارا جسم بڑیلوں کا پنجر بن چکا ہو گا۔ کیا اس سے بہتر نہیں کہ تم عورت اور آرام سے ہمیں ان سوالوں کے جواب دے دو؟“

”دو آدمیوں کو ایک عورت مل جائے تو اس کی عزت کیسے محفوظ رہ سکتی ہے؟“ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”اگر ہمارے پیدا کر کے مجھے خراب کرنا چاہتے ہو تو میں کیا کر سکتی ہوں؟“

لڑکی چلاک معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اس کا جواب انکپٹر راجرنے کو انگریزی میں سنا کر اپنی رائے دی کہ یہ اپنے آپ کو خوبصورت سمجھتی ہے اور اس کا خیال ہے کہ ہم اسے خراب کریں گے اور اسے تفریح کا ذریعہ بنائیں گے۔ انکپٹر راجرنے مجھے کہا کہ اس کے دماغ میں یہ ڈالو کہ ہم اس طرف توجہ ہی نہیں دیں گے کہ یہ عورت ہے یا مرد۔ ہمیں اس کے حسن اور اس کے جسم کے ساتھ ذرہ بھر دلچسپی نہیں۔۔۔۔۔ یہ سن کر مجھے اطمینان ہوا کہ اس انگریز نے لڑکی کے متعلق کوئی ہیودہ ارادہ دل میں نہیں رکھا تھا۔ میں نے لڑکی سے کہا۔ ”تم بھول جاؤ کہ تم گورے رنگ کی بڑی حسین لڑکی ہو رہی ہیں صرف تین سوالوں کے جواب دے دو اور آزاد ہو جاؤ۔ مقتول تمہارا دوست کس طرح بنا؟ وہ امرتسر

کس کے پاس ٹھہرا تھا اور کھلتے تمہارا مشن کیا تھا؟“

”میں ذرا سوچ کر بتاؤں گی۔“ اس نے کہا۔

”یہ کوئی حساب کا سوال نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”فورا، ابھی جواب دو۔“ مجھے اس پر رحم آ گیا۔ وہ گراہ ہو گئی تھی، آخر لڑکی تھی۔ میں نے اسے کہا۔ ”تم نے کہا تھا کہ تمہارے بھائیوں

کو تھامے سامنے پھانسی چڑھایا جائے۔ تم اُن سے اُس آدمی کا انتقام لینا چاہتی ہو جسے تم چاہتی تھیں تم قاتل نہیں۔ ہمارے دونوں میں بیشک کیوں پیدا کرتی ہو کہ تم بھی قتل کے جرم میں شامل تھیں؟ ہم یہ سمجھیں گے کہ تمہارے بھائی بے گناہ ہیں اور تم نے گھنٹھام کو کسی وجہ سے کسی اور سے قتل کر دیا ہے۔ کیا تم تمام جرم میں گارانا چاہتی ہو؟
وہ گہمی سوچ میں کھو گئی۔ اُسے، جیسے اچانک کچھ یاد آگیا۔ کہنے لگی۔ ”میرے باپ کو چھوڑ دیں۔ میں بہت ساری باتیں بتاؤں گی۔“

میں نے اُسے ایک نظر راجر سے دیکھا۔ ”کیا تو اُس نے کہا۔“ اسے کوہم تمہارے باپ کو بھارت سے دیکھیں گے اور دو تین صدیوں میں پوچھ کر اُسے آزاد کر دیں گے۔“
”جب تک میرے باپ کو نہیں چھوڑو گے میں زبان نہیں کھولوں گی۔“
”اُس کے تمام کچے اُتار دو۔“ انیکٹر راجر نے غصے سے کہا۔ ”اور اس کے باپ کو یہاں لے آؤ۔ وہ تیزی سے اٹھا اور لڑکی کی طرف بڑھا۔“

لڑکی سمجھ گئی تھی کہ اس انگریز نے کیا کہا ہے۔ وہ سکرٹنے لگی۔ میں اُٹھ کر لڑکی کے آگے کھڑا ہو گیا اور انیکٹر راجر کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اُسے روک دیا۔ اُس نے حیران ساہو کے میرے منہ کی طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔ ”مسٹر راجر زبانی ڈیوٹی اور میرے ایمان میں کچھ فرق ہے۔ مجھے یہ فرق بڑا رکھنے کی مہلت دیں۔ میرا کردار کہتا ہے کہ بیٹی کو باپ کے سامنے لٹکا نہیں کروں گا۔ آپ بیٹھ جائیں۔ یہ بولے گی اور یہ سب کچھ بتائے گی۔“

اُس بے رحم انگریز کو نہ جانے کیوں رحم آگیا۔ وہ بیٹھ گیا۔ میں نے گھوم کر لڑکی کا ہاتھ پکڑا بہت خوبصورت ہاتھ تھا اور اُس کی انگلیاں باریک اور نہایت اچھی تھیں۔ میں نے میرت پینل اٹھائی۔ ہینسل لڑکی کی شہادت، اور درمیانی انگلی کے درمیان رکھ کر اُس کی دونوں انگلیوں کو مٹھی میں لے لیا۔

میں نے ہاتھ دبایا تو لڑکی درو سے دوہری ہو گئی۔ اس کے منہ سے ”سہی“ نکلی۔ میں نے ہاتھ کا دباؤ کم نہ کیا۔ لڑکی ترپنے لگی۔ اس سے کتنا درد ہوتا ہے؟۔ آپ اپنی انگلیوں میں ہینسل رکھ کر دبائیں اور اس درد کو محسوس کریں۔ وہ لڑکی تھی۔ اُس میں مردوں والی برداشت نہیں تھی۔ سردی کے باوجود اُس کا چہرہ پسینے سے تر ہو گیا۔ میں نے ہاتھ کو دبایا۔ اُس کی چیخیں نکل گئیں اور وہ فرش پر ترپنے لگی۔ میں اُس کی انگلیوں میں ہینسل دبانا چکا گیا۔ وہ چیختی رہی۔ پھر میں نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

”یہ ابتدا ہے۔“ میں نے اُسے کہا۔ ”تم نے سُن دیا ہے کہ یہ انیکٹر تمہیں لٹکا کر کے تمہارے باپ کو یہاں بلانا چاہتا ہے۔ میں نے تمہاری عزت کی خاطر انگریز افروزاراض کیا ہے۔ میرے سوال کا جواب فوراً دے دو۔“

”میرے باپ کو آپ نہیں چھوڑیں گے؟“ اُس نے باری ہوئی آواز میں کہا۔
”اُسے تمہارے سامنے لا کر ہم لٹکا کر دیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”اور تمہارے سامنے کھڑا کر کے اُس پر پرف والا پانی ڈالیں گے۔۔۔ ہمیں حکم نہ دو۔ ہمارا حکم مانو۔“

اُس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ اُس وقت میرے جسم میں بہت طاقت تھی۔ میں نے ایک ہاتھ پھینک کر اُس کے سر پر رکھا۔ مٹھی بند کی تو اُس کے بال میری مٹھی میں آگئے۔ میں نے اسی ایک ہاتھ سے اُسے اوپر اٹھالیا۔ اُس کے پاؤں زمین سے سات اٹھ انچ اوپر تھے۔ میں نے اُسے بالوں سے اوپر اٹھا رکھا تھا۔ اُس کی چیخوں سے کہہ دہل گیا۔ میں نے اسے اوپر اٹھا کر مٹھی کھول دی۔ وہ پاؤں پر گری۔ اُس کی آنکھیں لال سرخ ہو چکی تھیں۔ میں نے کہا۔ ”صرف ایک سوال کا جواب دے دو۔ امرتسر میں مانا کا ڈھو کہاں ہے اور اس گروہ میں کون کون ہے؟“

”چھوڑ آپ میرے باپ کو چھوڑ دیں گے؟“ اُس نے روتے ہوئے پوچھا اور کہنے لگی۔ ”میں

اپنے انجام کو جان گئی ہوں۔ میں آپ کو تکم نہیں دے رہی۔ سودا بھی نہیں کر رہی۔ میری عرض ہے کہ میرے باپ کو چھوڑ دیں۔ میں نے اُسے بہت بدنام کیا ہے۔ مجھے اجازت دیں کہ اُس کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگ لوں۔

میں نے انکسٹر راجر سے بات کی۔ اُس نے کہا کہ یہ پورا بیان دے دے تو میں وعدہ کر رہوں کہ اُس کے باپ کو چھوڑ دوں گا۔ میں نے لڑکی کو اس انگریز افسر کا فیصلہ سنا دیا۔ اُس نے پوچھا — ”میں آپ پر کس طرح اعتبار کروں؟“ یہ معاملہ جذباتی تھا۔ لڑکی نے مجھے دشمنی بنا دیا تھا کہ باپ بیٹی کے رشتے نے اور باپ کی خاطر بیٹی ان العوام نے مجھے موم کر دیا۔ انکسٹر راجر سے اجازت سے کہیں لڑکی کو ساتھ لے گیا۔ ایک کمرے میں بڑا کا انتظام کیا۔ اُس کے باپ کو قفل کر کے سنے کھلا اور کمرے میں بیٹہ بیٹن لٹا دیا۔ بوڑھے کی جذباتی حالت بہت بُری تھی۔ وہ لیٹ گیا تو بیٹی نے اس کے پاؤں پر سر رکھ دیا۔ اس نے باپ کے پاؤں چوسے اور چھوٹ چھوٹ کر روئی۔ باپ کی دھڑلے نکل گئیں۔ میں لڑکی کو وہاں سے بٹانے لگا تو باپ نے اٹھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ رورور کر اُس نے مجھ سے پوچھا — ”اب کیا ہو گا؟ میری قسمت میں اور کیا لکھا ہے؟“ میں نے اُسے تسلی دی اور اسے آرام سے سو جانے کو کہا۔ لڑکی کو میں قفسیتش کے کمرے میں لے گیا۔ اس کے باپ کے جھگنے کا کوئی ڈر نہیں تھا۔ اور گورڈا اپنا ہتھار

”ماتا، مہاتما گاندھی اور مسلمان

انکسٹر راجر نے چائے منگوا لیا تھا۔ میں نے لڑکی کو پانی پلایا پھر چائے پلائی اور کہا۔ ”بہنیں کوئی سوال کرنے کی ضرورت نہ پڑے ہر ایک بات بتا دو۔ میں تمہیں بچانے کی پوری کوشش کروں گا۔ میں ہندو ہوں۔ مجھ پر بھروسہ رکھو۔“

میں نے اُسے جوازیت دی تھی وہ اس سلوک کا عشرِ عیش بھی نہیں تھا جو ملزموں کے ساتھ وہاں کیا جاتا تھا۔ اس نازک سی لڑکی کے لیے آسان ہی کافی ثابت ہوا۔ باپ کی طرف سے بھی وہ مطمئن ہو گئی۔ نیند نے اُسے الگ پریشان کر رکھا تھا۔ رات کے تین بج چکے تھے۔ اُس نے غنودگی کے عالم میں خاصا طویل بیان دیا۔ اپنے متعلق اس نے بتایا کہ لڑکیوں کے آغاز میں اس میں دور جہان پیدا ہو گئے تھے۔ ایک آوارہ خیالی اور دوسرا مسلمانوں کے خلاف نفرت۔ والدین نے بچپن میں اُسے آزاد کر دیا تھا۔ آگے چل کر وہ خود آزاد ہو گئی۔ بڑے بھائی نے اس کی دوسیلیوں کے ساتھ دوستانہ کر لیا۔ بہن کو پتہ چلا تو اُس نے سب سے پہلے اپنے بھائی کے ایک دوست سے دوستی کر لی۔ سکول میں اُسے پڑھا گیا کہ کبھی بڑی زبردست قوم ہے۔ اسی سلسلے میں اس کے دل میں مسلمانوں کے خلاف دشمنی پیدا کی گئی۔ کالج میں وہ لڑکیوں کی لیڈر بن گئی۔ لڑکوں سے بھی ملنے لگی ۱۹۳۷ء میں اس کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ اس سال لاہور میں مسجد شہید گنج کا واقعہ ہوا۔ یہ سکھوں اور مسلمانوں کا تنازعہ تھا جس میں لاہور کے مسلمانوں نے جانوں کی قربانی بے دریغ دی۔ امرتسر میں سکھوں کو بتایا گیا کہ لاہور میں مسلمان سکھوں کو قتل کر رہے ہیں۔ بہت سے سکھ بچھڑیوں اور کرپاؤں سے مسلح ہو کر لاہور پہنچے۔ وہاں مسلمان، انگریز پولیس اور فرنچ کی گولیوں کا نشانہ بن رہے تھے۔ اس لڑکی کے دل میں مسلمانوں کے خلاف نفرت اور زیادہ گہری ہو گئی۔

اُس وقت تک وہ بہت ہوشیار اور مزہ پھٹ ہو چکی تھی۔ سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتی تھی۔ اس کا باپ بھی لیڈر قسم کا آدمی تھا۔ اُس کی لیڈر میونسپلٹی کے ایکشنوں اور گورڈارے اور راجا صاحب کے انتظامات وغیرہ تک محدود تھی۔ تاہم وہ اپنے آپ کو امرتسر کے سکھوں کا بچہ کہلاتا تھا۔ لڑکی سیاسی سرگرمیوں کے سلسلے میں اپنے ہم خیال لڑکوں سے بھی ملتی تھی۔ وہ تیز طرار بھی تھی، بے حیا بھی اور اُس کا چال چلن بھی وادار تھا۔ گھنٹاشام کے قتل سے اٹھ مہینے پہلے اس کی

پہلی ملاقات گھنٹشام سے ہوئی۔ یہ ایک غصیہ ملاقات تھی۔ گھنٹشام دہلی سے امرتسر ایک دوست کے پاس آتا تھا۔ یہی کہتا تھا۔ لڑکی کا ایک دوست اُسے گھنٹشام کے پاس لے گیا تھا۔ لڑکی نے اپنے قبائلی بیان میں کہا کہ گھنٹشام نے اُسے تفصیل سے بتایا کہ یوپی میں ہندوؤں نے ایک زمین دوز تحریک کا آغاز کیا ہے، جس کے اغراض، تمامد میں اسلام دشمنی اور مسلمانوں کی بیخ کنی سرفروست ہے۔ اس تحریک کا پروگرام دہشت، پسند، فسادوں جیسا تھا۔ دوسری تحریکیں انگیزیوں کے خلاف کام کرتی تھیں۔ "ماتا" کو مسلمانوں کے خلاف کام کرنا تھا۔ انہوں نے جو طریقے وضع کیے تھے ان میں ایک تو مسلمان لیڈروں کو ایسے طریقوں سے قتل کرنا تھا کہ قاتلوں کا سراغ نہ ملے۔ دوسرا طریقہ یہ کہ مذہبی لیڈروں اور مسجدوں کے مولویوں تک کے دہشت زدہ کیے رکھنا۔ مثلاً رات کے وقت اُن کے گھر میں پتھر پھینکنے، دستی بم پھینکنے، اُن کے بچوں کو اغوا کر کے قتل کرنا اور لاشیں غائب کر دینا۔ تیسرا طریقہ تبلیغ کا تھا۔ پیار سے بھی اور تشدد سے بھی مسلمانوں کو ہندو بنانا۔ چوتھا طریقہ یہ تھا کہ ہندو اور سکھ لڑکیاں مسلمان نوجوانوں کو بچانے کر اُن کا مذہب تبدیل کر دیں خواہ انہیں اپنی عزت، قربان کرنی پڑے۔ اور پانچواں طریقہ یہ تھا کہ مسلمان لڑکیوں کو اغوا کر کے دور دراز لے جانا اور انہیں ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ بیاہ دینا۔

دلچسپ اور کوئی تحریک اور اس کا پروگرام بہت پسند آیا۔ اس کا نشان لکڑی کی ٹرک رکھا گیا تھا جس پر لفظ "ماتا" لکھا ہوا تھا۔ گھنٹشام نے اُسے یہ بھی بتایا تھا کہ اس تحریک کے لیڈر ماتا کاڈ سے مل چکے ہیں اور اپنے اس روحانی لیڈر کی انہیں منظور ی مل گئی ہے۔ اُس نے جن لیڈروں کے نام لیے اُن میں سردار پٹیل، مراد جی ڈایسا، جے پرکاش نارائن اور جواہر لال نہرو قابل ذکر ہیں۔ یہ لیڈر پہلے ہی ان کو شمشوں میں مصروف تھے کہ ہندوستان سے مسلمانوں کو نکالاجائے یا انہیں مسلمان بنی نہ رہنے دیا جائے۔ انہوں نے شدید کی تحریک چلا رکھی تھی۔ گھنٹشام نے لڑکی کو

بتایا کہ یوپی میں "ماتا" کے ممبروں نے اس پروگرام پر عمل شروع کر دیا ہے۔ لڑکی نے بیان میں کہا کہ یہ تحریک اتنی سرگرم نہ ہو سکی جتنی توقع تھی۔ دہلی کے مصافحات ملاقات میں اس کے تین ممبر کپڑے گئے۔ اُن کے پاس دستی بم تھا۔ پولیس کے پاس جاکر ایک نے اقبال جرم کر لیا اور تحریک کو بے نقاب کر دیا۔ پھر یوپی میں کسی جگہ دھماکہ ہو گیا۔ وہ بھی پولیس کا تشدد نہ سہہ سکے۔ ان سب کو چودہ چودہ سال سزائے قید دی گئی۔

لڑکی کے بیان کے مطابق کچھ لوگ اس تحریک کو مالی امداد دیتے تھے مگر اُسے کسی ایک کا بھی نام معلوم نہیں تھا۔ گھنٹشام امرتسر آ رہا تھا۔ وہ دراصل سکھ نوجوانوں کو اس گروہ میں شامل کرنا چاہتا تھا۔ لڑکی ہر بار اُسے ملتی تھی۔ دونوں میں بے تکلفی پیدا ہو گئی جو محبت کی صورت اختیار کر گئی۔ لڑکی نے اپنے بھائیوں سے کہا کہ وہ اس تحریک میں شامل ہو جائیں۔ انہیں تحریک پسند نہ آئی۔ گھنٹشام نے امرتسر زیادہ ہی افسانہ شروع کر دیا اور زیادہ دن وہاں گزارنے لگا۔ لڑکی اُس کے ساتھ ساتھ رہتی تھی بھائیوں نے دیکھ لیا اور بہن کو منع کیا۔ وہ نہ مانی۔ باپ کو پتہ چلا تو اُس نے بھی لڑکی کو روکا۔ وہ باز نہ آئی کرتے کرتے باپ اور بھائیوں کو پتہ چل گیا کہ لڑکی کو تحریک سے اتنی دلچسپی نہیں جتنی گھنٹشام سے ہے۔ اُس وقت تک لڑکی بے حیائی اور آشنائی کی وجہ سے خاصی بدنام ہو چکی تھی۔ ایک روز دونوں بھائیوں نے گھنٹشام کو جا کھڑا اور اُسے دھکی دیا کہ وہ کچھ بھی امرتسر آیا تو اُسے قتل کر دیا جائے گا۔ اُس نے لڑکی کو بتایا۔ لڑکی نے کہا کہ وہ اُس کے ساتھ گھر سے نکل جانے کو تیار ہے۔ پروگرام طے ہو گیا۔

اس کے مطابق آٹھ دس روز بعد گھنٹشام امرتسر آیا۔ لڑکی کو اطلاع مل گئی۔ وہ اسے ملی گھنٹشام نے اُسے بتایا کہ وہ گلگتہ جارا ہے۔ وہاں کے ایک تاجر نے تحریک کے لیے خاصی رقم اور کچھ آرمی دینے کا وعدہ کیا تھا۔ دہلی کے ایک لیڈر نے (جس کا اُسے نام نہیں بتایا گیا) کاغذ پر یہ تحریر لکھ دی کہ امرتسر میں منڈی تیز ہے۔ مال بیچ دو۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ امرتسر میں جھوٹی منگی ملتی ہے۔ اس کے لیے

رقم چاہیے۔ گھنٹاشام نے اس لیڈر کو بتایا کہ وہ اپنے ساتھ ایک لڑکی کو لے جانا چاہتا ہے۔ لڑکی گھر سے
 بھاگ آئے گی، پھر گھر نہیں جائے گی بلکہ وہ شادی کر لیں گے۔ گھنٹاشام نے اس لیڈر کو یہ بھی بتا دیا کہ لڑکی
 تحریک کے لیے بہت کام کرے گی۔ لیڈر نے قعے میں یہ بھی مکھ دیا کہ بچے آرہے ہیں۔ اس کا مطلب
 یہ تھا کہ گھنٹاشام کا وہ تاجر این دونوں کی رہنمائی کا بھی بندوبست کرے اور انہیں چھپا کر رکھے۔ انتظام یہ کیا
 گیا کہ گھنٹاشام نے ریل گاڑی میں اپنی میڈم ایڈورڈ کی لکین لڑکی کو زیر ویشن کے بغیر لے جانے کا فیصلہ
 کیا۔ وہ چونکہ دہشت پسند تھا اس لیے نذرانہ سے خطرے سے بھی محتاط تھا۔ وہ لڑکی کی گندگی کا کوئی
 تحریری سران نہیں چھپانا چاہتا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ لڑکی پہلے ہی بیان کر چکی تھی۔
 بیان کا یہ حصہ آپ نے یاد لیا ہے۔

اپنے باپ کے متعلق اُس نے ایسے جذباتی انداز اور الفاظ میں صفائی پیش کی کہ میں نے
 اسے تسلیم کر لیا۔ باپ کے ذکر سے لڑکی بہت روئی۔ اُس کے الفاظ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہیں جو
 میں نے اپنی اولاد کو کئی بار سنائے تھے اور اب اپنی اولاد کی اولاد کو سنایا کرتا ہوں۔ لڑکی نے کہا —
 ”اولاد جو ان بوجہ جاتی ہے وہ تو سمجھتی ہے کہ عقل تو صرف اُسے ملی ہے۔ والدین پس ماندہ اور جاہل ہیں۔ مجھ
 جیسی لڑکیاں اپنے جیسے لڑکوں سے اپنی خوبصورتی کی تعریف سن کر اپنے آپ کو رانیاں مہارانیاں
 سمجھ لیتی ہیں اور ماں باپ کی عزت کو کوڑیوں کے بجائے بیچ ڈالتی ہیں۔ لڑکے دوبارہ ہر کمران باپ
 کے لیے روگ بن جاتے ہیں۔ آج جب میرا باپ میری گراہی پر گڑھ گڑھ کر میرے ساتھ قید ہو گیا
 ہے اور مجھے خدا سے میرے گناہوں کی سزا دی ہے تو مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ میرا باپ اور ہر کسی
 کا باپ ایک پورے خاندان انسان ہے۔ اور ماں لکنتی عظیم ہوتی ہے جس نے اپنی بیٹی کی بدکاریوں سے
 وقفت ہوتے ہوئے بھی بیٹوں سے کہا تھا کہ اسے کوئیں میں نہ پھینکا۔ اُس نے مجھے بچانے کے لیے
 اپنے بیٹوں پر حمہ کر دیا تھا۔ میں اُن سے کس طرح معافی مانگوں۔ اگر خدا نے مہلت دی تو باقی عمر اُن

کے قدموں میں سر رکھ کر گزار دوں گی اور اگر زندہ رہی تو فوجان لڑکیوں اور لڑکوں میں یہ تحریک چلاؤں
 گی کہ اپنے ماں باپ کو گورونامک اور شیوں کا درجہ دیں۔“
 ”اور تم مسلمانوں سے بدستور نفرت کرتی رہو گی“ ہمیں نے کہا۔
 ”نہیں“ اُس نے جواب دیا — ”اب صرف اپنی خوبصورتی اور اپنے جسم سے
 نفرت کروں گی۔“

لڑکی سو گئی، باپ بیدار ہو گیا

اُس نے امرتسر کے چھ سات آدمیوں کے نام پتے لکھوائے جو اس تحریک کے روح رواں تھے
 اور اُس آدمی کا نام پتہ بھی دے دیا جس کے گھر کو گھنٹاشام پنا آؤہ بنا رکھا تھا۔ کچھ اور بھی نشانہ بیاں
 تھیں جو اُس نے کر دیں۔ بہر تمام تر گروہ کو کپڑا پاتے تھے لیکن دہشت پسندوں کا دستور تھا کہ اُن
 کے جو ممبر مل کر کام کرتے تھے وہی ایک دوسرے سے واقف ہوتے تھے۔ باقی ممبر ایک دوسرے کو نہیں
 جانتے تھے۔ گھنٹاشام تجربکار اور محتاط دہشت پسند معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے لڑکی کو کسی دوسری جگہ کے
 ممبروں کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ جس کے پاس کلکے مارا ہے تھے اُس کے متعلق بھی وہ کچھ نہیں
 جانتی تھی۔ لڑکی دہشت پسندوں کی کسی کارروائی کے متعلق بھی کچھ نہ بتا سکی۔ ہم نے اس پر فوراً اعتبار
 نہیں کر لیا تھا۔ ہم نے اپنے خصوصی طریقے سے اس کا سینہ کھول لیا تھا۔ اس میں اتنا وقت صرف
 ہوا کہ دن کے گیارہ بج گئے۔ لڑکی پر غشی طاری ہونے لگی تھی اور وہ اس طرح بے قابو ہو کر بولنے
 لگی تھی جیسے اُسے نشہ پلا گیا ہو۔ اُس کا شعوری ذہن سو گیا تھا اور لاشعوری ذہن میں جھپٹی ہوئی
 باتیں چشمنے کی طرح اُبل اُبل کر باہر آ رہی تھیں۔ انکسٹر پراجرز کے کنبے پر میں اُسے اُس کے کمرے
 میں لے گیا۔ چار پائی، بستر اور اُس کے لیے ناشتہ منگوایا۔ اُسے ناشتہ کا ہوش نہ تھا۔ بستر پر

گری اور گری فینڈ سو گئی۔

میں اُس کے باپ کے کمرے میں گیا۔ اُسے ناشتہ دیا جا چکا تھا۔ وہ چار پائی پر بیٹھا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور میرے ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ”میرے ساتھ کیا سلوک ہو گا؟“ میری بیٹی کہاں ہے؟“ میں نے ایسے تسلی دی تو اُس نے پوچھا۔ ”میری بیٹی کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے؟“

”جو ایک باپ کو اپنی بیٹی کے ساتھ کرنا چاہیے۔“ میں نے کہا۔ ”میں آپ سے بہتر قسم کا باپ ہوں۔ آپ نے اسے کنوئیں میں پھینکنا چاہا تھا لیکن میں اُسے کنوئیں سے نکلنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اپنے ہاتھوں آزاد کیا اور اس کے دل میں مسلمانوں کے خلاف نفرت ڈالی۔ میرے ساتھ آئیں۔“ میں اسے تفتیشی کمرے میں لے گیا۔

ہم نے گزشتہ رات سے ایک منٹ بھی آرام نہیں کیا تھا۔ انکسٹراجرز نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ ”بارہ بجنے والے ہیں۔ آپ اسے لے آئے ہیں۔“

”اُس سے جلدی فراغت ہو جائے گی۔“ میں نے کہا۔ ”ہمیں تفتیش آج ہی مکمل کر لینا چاہیے۔ ام ترسہ جگر فدا یاں کرنی ہیں۔ ملزم روپوش ہو سکتے ہیں۔“

انکسٹراجرز گھبرا اٹھا اور بولا۔ ”ملزموں کی فرست کہاں ہے؟ جگر فدا یوں کے لیے ہم انتظار نہیں کر سکتے۔“ مجھے ڈر ہے وہ روپوش ہو چکے ہوں گے۔ لڑکی کی گرفتاری اور اس کے گھوکتی تلاشی سارے شہر میں مشہور ہو چکی ہوگی۔ وہ فرست لے کر کمرے سے دوڑنا نکل گیا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ ام ترسہ پولیس کو ٹیلیفون کرے گا یہ کہ ان اشخاص کو فوراً گرفتار کر کے اُن کے گھروں کی تلاشی ہو۔ میں نے اس دوران سردار سرحیت سنگھ پر توجہ مرکوز کیے رکھی۔ اُس نے مجھے پریشان نہیں کیا۔ اپنی بیٹی کے متعلق اُس نے وہی باتیں بتائیں جو بیٹی منا چکی تھی۔ اس نے

یہ بھی تسلیم کیا کہ وہ بیٹی اور بیٹوں کو مسلمانوں کے خلاف مجھ کا تاربتا تھا اور انہیں بتایا کرتا تھا کہ انہاں نے ملک تک کا علاقہ کھول کا ہے۔ اس پر انگریزوں، ہندوؤں یا مسلمانوں کا کوئی حق نہیں، لیکن اُس کی بیٹی نے جب اپنے بھائیوں سے کہا کہ وہ تحریک میں شامل ہو جائیں جو مسلم کشی کے لیے کام کر رہی ہے تو اُس نے مخالفت کی کیونکہ پڑے جانے کا ڈر تھا۔ تاہم وہ ہندو لیڈروں کے ساتھ اس موضوع پر تبادلہ خیالات کرتا رہتا تھا کہ مسلمانوں کو کس طرح ختم کیا جائے اور مسلمانوں کو اچھوتوں کا درجہ کس طرح دیا جائے۔ اُس کی بیٹی اُس سے آگے نکل گئی۔ تب وہ پریشان ہوا، اور اُس وقت تو وہ پریشانی سے بے حال ہو گیا جب اُسے اپنے چھپے معزز آدمیوں نے بتایا کہ اُس کی بیٹی شکوک چال چلن کے آدمیوں کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے۔ اُس نے بیٹی کو روکنے کی کوشش کی تو اُس نے پرواہ نہ کی۔ پھر بھائیوں نے اُسے روکا تو بھی وہ باز نہ آئی۔

اس کے بعد باپ کو گھنٹھام او۔ اُس کی خفیہ تحریک کے متعلق پتہ چلا اور فوراً ہی بعد بیٹوں نے باپ کو بتایا کہ گھنٹھام اور لڑکی کے تعلقات صرف سیاسی نہیں، معاملہ قابل اعتراض ہے۔ باپ بہت ہی پریشان ہوا۔ وہ سارے شہر میں بدنام ہو گیا تھا۔ اُس کے کہنے پر اُس کے بیٹوں نے گھنٹھام کو قتل کی دھمکی دی۔ باپ نے انہیں کہا کہ انفا ملک ہی رکھنا ورنہ اور زیادہ رسوائی ہوگی۔ گھنٹھام آخری بار ام ترسہ آیا۔ ایک شام لڑکی کی ماں نے کچھ کھانے یا رکھنے کے لیے ٹرک کھولا تو زیورات کے ڈبے خالی دیکھے۔ صرف بارو الا ڈبہ اور زیورات کی کئی اشیا غائب تھیں۔ اسی ٹرک میں کچھ رقم تھی۔ وہ بھی غائب تھی۔ ماں نے سر پیٹ لیا۔ بیٹوں کو معلوم ہوا تو وہ اُس مکان میں گئے جہاں گھنٹھام ٹھہرا کرتا تھا۔ انہیں بتایا گیا کہ وہ ہوٹرا ایکسپریس سے چلا گیا ہے۔ بیٹے ریلوے سٹیشن گئے تو گاڑی چل رہی تھی۔ انہیں اپنی ہمن نظر آگئی۔ وہ آگے کو دوڑی جا رہی تھی۔ وہ اس کے پیچھے دوڑے مگر سہن گاڑی میں سوار ہو گئی اور بھائی پیچھے کہیں گاڑی میں سوار ہو گئے۔ بیٹوں

کی غیر جانبداری نے باپ کا برا حال کر دیا۔ وہ انہیں اور اپنی بیٹی کو ڈھونڈتا پھر رہا۔ اس ڈر سے کسی سے پوچھتا بھی نہیں تھا کہ رسوائی ہوگی۔ تین روز بعد اس کے بیٹے بہن کو لے کر آگئے اور باپ کو بتایا کہ وہ گھنٹا تک کو قتل کر آئے ہیں۔ انہیں یقین تھا کہ وہ پکڑے نہیں جائیں گے مگر پکڑے گئے۔

اتنے میں انسپکٹر اجڑ گیا۔ اُس نے امریکہ پہنچ کر کئی مہینوں کے نام پتے بتا کر کہہ دیا تھا کہ انہیں فوراً گرفتار کر لیا جائے۔ اُن کے گھر کو کی تلاش میں جو اشیاء برآمد کرنی تھیں وہ بھی بتائیں۔ میں نے اسے لڑکی کے باپ کا بیان سنایا اور رائے دی کہ اس کے پاس اور کچھ نہیں۔ انسپکٹر راجرنے اُس پر بہت جبر کی اور مجھے کہا کہ اسے کمرے میں بھیج دو۔ باپ نے مجھ سے پوچھا۔ ”اب میرا کیا بنے گا؟ میری بیٹی کا کیا بنے گا؟“ اُس نے اس بار بھی اپنے بیٹوں کے متعلق نہیں پوچھا۔ اُسے بیٹی کا غم کھا رہا تھا۔ میں نے اسے کہا ”آپ مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں۔ میں آپ کے دل میں مسلمانوں کی محبت پیدا کروں گا۔“

بہن کھانے اور ذرا آرام کے لیے پٹے گئے۔

”ماما کے سپوت ہمارے شہنشاہ میں“

شام کو ہم دونوں بھائیوں کو اکٹھے ہی تفتیشی کمرے میں لے گئے۔ انہیں خبردار کیا کہ اُن کا جرم ہر ایک تفصیل کے ساتھ معلوم ہو چکا ہے۔ اگر انہوں نے کچھ چھپانے کی کوشش کی تو قانون کی سزا سے پہلے اس کمرے میں انہیں بڑی مہیا تک سزا ملے گی۔ دونوں اس قدر دلیر نہ تھے کہ میں انہیں اس حق کوں گا۔ بڑے بھائی نے کہا ”چھپانا کیا ہے۔ بہن کے یار کو قتل کیا ہے۔ کہیں ڈاکہ تو نہیں ڈالا۔“ چھوٹے بھائی نے ہاتھ میرے منہ کے قریب لاکر زور زور سے

بلایا اور دھمکانے کے لہجے میں کہا۔ ”ہم جھوٹ نہیں بولیں گے کیکن یاد رکھو ہم پر کوئی جھوٹا الزام نہ لگانا۔ ہم سر اُٹھا کر کے کہیں گے کہ ہم نے بہن کے یار کو قتل کیا ہے۔“

جو پاکستانی سکھوں کو نہیں جانتے وہ حیران ہوں گے کہ ان بھائیوں نے ایسی باتیں کی ہیں۔ جو لوگ سکھوں کے ساتھ رہے ہیں وہ جانتے ہیں کہ سکھ بہن کے یار سے کہیں زیادہ لنگی باتیں کیا کرتے ہیں۔ سکھ جس قدر احمق ہوتا ہے (جو وہ اکثر ہوتا ہی ہے، وہ اپنا سر اتارنا ہی اُنچا رکھتا ہے۔ میں نے ان بھائیوں کو کھل کر داد دی۔ انسپکٹر راجرنے بھی اُن کی تعریف کرائی اور سکھوں نے بڑے غر سے ساری واردات سنا دی۔ اس کا خاصا حصہ آپ لڑکی اور اُس کے باپ کی زبان سے سُن چکے ہیں۔ اس میں جو رہ گیا تھا وہ بھائیوں نے اس طرح پُور کیا کہ جب انہیں پتہ چلا کہ ان کی بہن زیورات اور نقدی سمیت لاپتہ ہے تو وہ گھنٹا تک اُس دوست کے گھر گئے جہاں وہ ٹھہرا کرتا تھا۔ انہیں پتہ چلا کہ وہ جوڑا ایکسپریس سے چلا گیا ہے۔ ان کے پاس کچھ پیسے تھے۔ ایک مڑھتی سے انہوں نے خاصی رقم لی۔ ایک ایک چاقو دونوں کے پاس تھا۔ وہ ریلوے اسٹیشن چلے گئے۔ لیکن کسی اور طرف سے پلیٹ فارم پر گئے۔ انہیں بہن اُس وقت نظر آئی جب گاڑی چل پڑی اور بہن انہیں کی طرف دوڑی جا رہی تھی۔ وہ اُس کے پیچھے دوڑے لیکن گاڑی تیز ہو گئی۔ بہن کو انہوں نے لگے والے ایک ڈبے میں سوار ہوتے دیکھا تو وہ پچھلے ایک ڈبے میں بغیر ٹکٹ سوار ہو گئے۔ راستے میں ٹکٹ چیک کیا تو انہوں نے امرتسر سے آگے کے تیرے یا چوتھے کسی اسٹیشن تک کے ٹکٹ بنوا لیے۔ (مجھے اس اسٹیشن کا نام یاد نہیں رہا)

جہاں بھی گاڑی رکی انہوں نے انڈیا اور تھوڑا کلاس کے ڈبوں میں بہن کو دیکھا۔ انہیں کہیں بھی نظر نہ آئی۔ رات پہنچی تھی۔ سیکنڈ اور فٹ کلاس کے تمام ڈبوں کے شیشے اور شرگرے ہوتے تھے۔ یہ تو انہیں معلوم نہیں تھا کہ ان کی بہن سیکنڈ کلاس میں جا رہی ہے۔ اُن کے ٹکٹ والا اسٹیشن گزر گیا۔

انہوں نے پرواہ نہ کی اور دلی تک چلے گئے۔ وہاں سیکنڈ کلاس سے مسافر اترے تو بھائیوں نے بہن اور گھنٹام کو بیکہ لیا۔ بہن انہیں زندہ کیوں نہ دیکھ سکی۔ وہاں سے گاڑی چلی تو وہ اسی کپارٹمنٹ کے ساتھ واسے کپارٹمنٹ میں چڑھ گئے۔ سائبر انٹر کلاس تھا۔ یہ لے کر دیکھ لیا تھا کہ ان دونوں ڈبلوں کے پائیدان دور دور میں گاڑی جب دلی پہنچے ان کے نکل گئی تو دلی انٹر کلاس کے پائیدان سے سیکنڈ کلاس کے پائیدان پر پہنچ گئے۔ انہوں نے آپس میں طے کر لیا تھا کہ وہاں اگر ندر سے لاک ہوا تو وہ چاقوؤں سے شیشہ اور گاڑی کا شیشہ توڑ کر اندر چلے جائیں گے۔ مگر انیس دروازہ کھلا مل گیا۔ لیور کھایا تو دروازہ کھل گیا۔ اُس وقت انکی غنٹام کے بازوؤں میں سختی۔ قتل۔ یہ میرا جواز کافی تھا۔ انہوں نے غنٹام کے قتل کا طریقہ وہی بتایا جو آپ ان کی بہن کی زبان میں سنے ہیں۔ اس کا گلا گھونٹ کر اسے گاڑی سے باہر چھینک دیا اور اگلے ٹاپ کے ٹیشنگ کے قریب بہن کو ساتھ لے کر آگئے۔ دوسرے دن وہ بہن کو اسی شیشہ سے گاڑی پر سوار کر لائے۔ بہن نے جب اتریں ان کے گھر چھاپا۔ پارتو انہوں نے بہن کو کہہ دیا کہ میں پہلے گئے تھے تاکہ لے کر لیا تھا لیکن میں بوقت پہنچ گیا۔ ان دونوں پر میں نے اور انکسٹر راجر نے بہت جرح کی لیکن انہیں قتل کے علاوہ اور کسی جرم میں ملوث نہ پایا۔ مگر تانائے گروہ کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہ تھا بلکہ وہ اس گروہ کے اس قدر غارت تھے کہ انہوں نے غنٹام کے اترنے والے دھڑوں کی نشاندہی کی اور ان کے خلاف گواہی دینے کی بھی پیش کش کی۔

دونوں بھائی ہمارے ملازم نہیں تھے۔ ان کے خلاف رپورٹ شہادت کی ذمہ داری کے ساتھ جرنل مندر تھے تو جیج جی۔ ان کے خلاف قتل کا الزام تھا۔ انہیں متعلقہ تھا نہ بھجوانے کا انتظام کر کے ان کی بہن اور باپ کو جرم اترے گئے۔ وہاں تانائے سات سہولت گرفتار کیے جا چکے تھے۔ ان کے گھروں سے تانائے ٹوک اور غنٹام کے دوست کے گھر سے دستاویزی ثبوت بھی مل گئے۔ سیدھے طاقت سے ان کے خلاف جرم ثابت کرنا فرار نکال دیا۔ میں نے اسی کو بہانہ بنایا اور انکسٹر راجر سے کہہ

لڑکی کو وعدہ معاف گواہ بنا لیا۔ تانائے سپوتوں کا دل گروہ ملاحظہ کیجیے کہ ہم نے انہیں اذیت کی پہلے ہی پر ہی رکھا تو ہر ایک نے جرم کا اعتراف کر لیا۔ میں اذیت رسانی کا قائل نہیں تھا لیکن ان کی میں بڑی پسلی ایک کر دینا چاہتا تھا۔ انہوں نے مجھے موقع ہی نہ دیا۔ چار اور دوستوں کی نشاندہی کر دی لیکن وہ فوری طور پر پکڑے نہ جا سکے کیونکہ ان سات کی گرفتاری سے وہ روپوش ہو گئے تھے۔

یہاں ایک مسئلہ پیدا ہو گیا۔ سب کے اقبالی بہر جانے سے وعدہ معاف گواہ کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ انکسٹر راجر نے لڑکی کو اس رعایت سے محروم کر دیا۔ میں اسے سزا سے بچانا چاہتا تھا۔ میں نے اُس کے باپ سے دو وعدے کیے تھے ایک یہ کہ اُس کی بیٹی کے ساتھ وہی سلوک کروں گا جو باپ بیٹی کے ساتھ کرتا ہے اور دوسرا یہ کہ میں اُس کے دل میں مسلمان کی محبت پیدا کروں گا۔ میں نے انکسٹر راجر سے صاف کہہ دیا کہ میں لڑکی کو بچانا چاہتا ہوں۔ اُسے جذباتی دلائل دیئے۔ وہ زندہ دل آدمی تھا۔ کہنے لگا۔ ”مسٹر خان! آپ تو شادی شدہ ہیں۔ میں آپ کی مجبوری سمجھتا ہوں۔ لڑکی میں اتنی کشش ہے کہ ایک شادی شدہ آدمی اس کی محبت میں گرفتار ہو جائے۔“ آخر وہ میری بات سمجھ گیا۔ اُسے میری یہ دلیل بہت پسند آئی تھی کہ یہ لوگ مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں۔ میں انہیں بتانا چاہتا ہوں کہ مسلمان محبت سے نفرت کو محبت میں بدل سکتا ہے۔

مجھے وہ وقت ساری عمر نہیں بھولے گا جب تانائے سارے گروہ کو دس دس سال سزائے قید سنائی گئی اور لڑکی کو وعدہ معاف گواہ کی حیثیت سے آزاد کر دیا گیا تو اس کا باپ میرے پاؤں میں گر پڑا۔ متھا۔ تب میں نے اُسے بتایا کہ اُس کی لڑکی کو میں نے کس طرح بچایا ہے۔ اس کے بعد میں نے باپ بیٹی کی صورت نہیں دیکھی۔ سردار صاحبیت سنگھ مر گیا ہو گا۔ اگر اُس کی بیٹی دلچسپ کو زندہ ہے تو اُس نے اپنے بچوں کو ضرور بتایا ہو گا کہ مسلمان کا دل محبت سے بھرا پڑا ہے اور مسلمان جب نفرت کرتا ہے تو کھلے میدان میں لٹاکر کرتا ہے، زمیں دوز، خفیہ اور مجرمانہ طریقوں سے نفرت کا اظہار

نہیں کیا کرتا۔

دونوں بھائیوں کو پانچ پانچ سال سزائے قید دی گئی تھی۔ بہن نے یہ بیان دیا تھا کہ وہ گھڑتے زیورات اور نقدی چھڑا کر بھاگ رہی تھیں اور جب اُس کے بھائی کپاسٹنٹ میں داخل ہوئے اُس وقت وہ گھنٹا مکہ ہارنوں میں تھیں۔ اس بیان سے فوری اشتعال ثابت ہو گیا تھا۔ اسی بنا پر انہیں تھوڑی سزا ملی۔ بہن نے بھائیوں کو سزائے موت یا عمر قید سے بچالیا۔

کالی چھپکلی اور ریت کے رستم

رٹکی چارپائی پر بیٹھی تھی۔ شراب
کی بوتل پڑی تھی۔ رٹکی واقعی
خوبصورت تھی۔ اُس نے دیکھا کہ
پولیس آگئی ہے تو وہ اٹھی مگر
اُس کا سر ڈول گیا اور وہ بیہوش
ہو کر گر پڑی۔

واقعات کے لیے اندر گئے تو دُہن غائب تھی۔ وہ کوئی بدعاش لڑکی نہیں، شریف اور پردہ دار تھی۔
میں نے جب تشفی شریع کی تو میرے لیے تو نہیں شہریوں کے لیے عجیب و غریب واردات
بن گئی۔

واقعہ یوں ہوا کہ چار بجے شام دو بزرگ اور ایک نوجوان یہ رپورٹ دینے کے آئے کہ
گزشتہ رات دُہن کو عروسی سے لاپتہ ہو گئی ہے۔ ان میں ایک دُہن کا باپ تھا، دوسرا
دُہن کا باپ اور تیسرا دُہن کا تھا۔ واقعات یہ بتائے گئے کہ کل پچھلے پہر ڈولی آئی۔ رات دُہن کو عروسی
میں داخل کیا گیا۔ نوجب کا وقت تھا۔ دُہن باہر دوستوں میں بیٹھا تھا۔ پندرہ منٹ بعد دُہن کی بہن دُہن
کے لیے دو دھولے لگتی لیکن اندر سے دروازہ بند تھا۔ بہن یہ سمجھی کہ دُہن دوسرے دروازے سے
اندر آ گیا ہے۔ دُہن کو برآمدے والے یعنی اندر والے دروازے سے کمرے میں جاتے نہیں دیکھا
گیا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد دُہن آیا اور اندر والے دروازے سے کمرے میں جانے لگا۔ دروازہ
اندر سے بند تھا۔ ڈیوڑھی والے دروازے کی طرف سے گیا۔ وہ دروازہ کھلا تھا۔ اندر جا کے دیکھا۔
وہاں دُہن نہیں تھی۔ اُس کی شلوار پنگ پر پڑی تھی۔ پنگ کی چادر غائب تھی اور کبل بھی غائب
تھا۔ موسم کچھ سرد ہو گیا تھا۔ لوگ برآمدوں میں یا کمروں میں سو تے اور کبل یا کھیس اوپر لیتے تھے۔
کمرہ عروسی میں بھی پنگ پر نیا کبل رکھا گیا تھا۔ ان لوگوں کو فوراً سمجھ لینا چاہیے تھا کہ دُہن اغوا
ہو گئی ہے۔

پہ بلائیک وش پولیس کالیں تھیں۔ اسی وقت پولیس کو اطلاع کر دیتے تو قحبے کی ناکہ بندی
کر لی جاتی۔ وہ چھ دن سا قحبہ تھا جہاں سے رات کو ایک مسافر گاڑی کو رتی تھی۔ وہ آج کی طرح بسوں
اور ٹیکسیوں کا زمانہ نہیں تھا۔ قحبے میں کل چار لاریاں تھیں جو صرف دن کے وقت چالیں میں دُور ایک

آپ نے حکایت میں جہاں کہانیوں کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا ہے جسے آپ "دُنیا
سکھ نہیں" وغریب جہاں کہتے ہیں۔ کہانیوں پچھ میں لیکن میری رائے یہ ہے کہ شریف لوگوں کی
لکھ میں ہر جرم عجیب و غریب ہوتا ہے۔ ان کا ذہن قبول ہی نہیں کرتا کہ کوئی انسان کوئی گھناؤنا
جرم کر سکتا ہے۔ بہر حال وہ قبول کریں نہ کریں جہاں کہتے ہیں اور ہوتے ہی رہیں گے۔ انسانی
فطرت ایسی ہے کہ اس میں نیکیوں کی بھی کوئی حد نہیں اور بدی کی بھی کوئی حد نہیں۔ انسان جس راستے
پر چل پڑے وہ سمجھتا ہے کہ اُسے کوئی روک نہیں سکتا۔ اکثر اوقات اچھے بھلے آدمی میں اچانک
جرم کی تحریک ہوتی ہے اور وہ بے قابو ہو کر جرم کر گزرتا ہے۔ وہ چونکہ پیشہ ور نہیں ہوتا اس لیے
عجیب و غریب احمقانہ حرکتیں کرتا ہے۔ ایسے جہاں شدید فوری اشتعال یا جذبات سے اندھے ہو کر
سکے جاتے ہیں۔ اشتعال اور جذبات کی شدت عقل کو یکا کر دیتی ہے۔ کسی بھی پولیس آفیسر سے
پوچھتے وہ آپ کو ایسی بے شمار وارداتیں سنائے گا جو صرف عجیب و غریب نہیں ہوں گی بلکہ آپ
انہیں سچ مانیں گے ہی نہیں۔

میں آپ کو ایسے ہی ایک جرم کی کہانی سناتا ہوں جس کا ارتکاب جذبات نے کرایا تھا کیا
آپ سچ مانیں گے کہ ایک دُہن کو پہلی رات کمرہ عروسی میں پنگ پر بٹھایا گیا مگر دُہن مایاں پہلی

شہنشاہ ایک طرف اور دوسری طرف تیس تیس میل دور ایک اور شہر تک جاتی اور آتی تھیں۔ رات کے وقت کوئی لاری نہیں چلتی تھی، اس لیے تاکہ بندی کی کامیابی کی توقع رکھی جاسکتی تھی، مگر ان لوگوں نے اتنے سنگین جرم کی تفتیش اور شروع کر دی۔ ساری رات گزار دی، اگلا دن بھی گزار دیا اور میرے پاس اُس رات نہ آئے جب دُعا کی کم از کم پانچ سو میل دور پہنچ چکی ہوگی۔ میں جانتا تھا کہ یہ لوگ بزم کے ماسے دہن کی گمشدگی کو پہنچا پھانے کی کوشش کرتے رہے۔ خود وہی ادھر ادھر تلاش کرتے رہے۔ آخر سخت پریشانی کے عام بینا میرے پاس آئے۔

میں نے اُن سے بہت کچھ پوچھا۔ میں نے دیکھا کہ دُعا کا باپ، دُعا اور اس کے باپ کے سامنے میرے سوالوں کا جواب دیتا تھا۔ کھٹکتا تھا۔ میں اُسے الگ لے گیا اور اسے کہا کہ اگر وہ اپنی بیٹی کو براہِ کرنا چاہتا ہے تو یہ ذہن سے اُتار دے کہ وہ اُس کی بیٹی تھی۔ اگر اُس کا چال چلن مشکوک تھا یا وہ کسی اور کو چاہتی تھی تو اس کے اظہار سے باپ کو ہچکنا نہیں چاہیے۔ میں اس لائن پر سوچ رہا تھا کہ لڑکی اپنی مرضی سے گئی ہے۔

باپ کی جذباتی حالت بہت ہی بُری تھی۔ شریف اور عزت دار آدمی تھا۔ بولنا کم اور رومانیاہ تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اس کے گھر میں پرست کی باندی ہے۔ لڑکی باہر نہیں جاتی تھی کسی سیملی کے گھر جاتی تو مال سے پوچھ کر اور بُرے میں جاتی تھی۔ باپ کو کبھی ایسا اشارہ نہیں ملا تھا کہ لڑکی کسی کو چاہتی ہے۔ اُس کا رشتہ طے ہوا، منگنی ہوئی، شادی ہوئی۔ اُس نے اپنی مال سے اور چھوٹی بہن سے کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے شک ہو تاکہ اُسے یہ رشتہ منظور نہیں۔ باپ نے مجھے یقین دلانے کی پوری کوشش کی کہ اس کی بیٹی ایسی ویسی نہیں تھی۔ میں نے ذہن میں یہ نوٹ کیا کہ باپ کو اپنی بیٹی کے دل کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں، یا وہ اپنی عزت کی خاطر چھپا رہا ہے۔ یہ قدرتی امر ہے کہ باپ اپنی بیٹیوں کے خلاف بات کرتے ہی نہیں۔ سُننے بھی نہیں اور اُن پر کسی قسم کی تہمت تسلیم ہی

نہیں کرتے۔

دوسرا شک یہ تھا کہ لڑکی کو کسی نے انتقاماً زبردستی اغوا کیا ہے۔ یہ تو میں مکان کا محل وقوع دیکھ کر رائے قائم کر سکتا تھا کہ وہاں زبردستی اغوا ممکن تھا یا نہیں۔ ایسا امکان کم ہی نظر آتا تھا کیونکہ اغوا غیر معمولی طور پر دلیرانہ اور خطرناک واردات ہے جس کا ارتکاب کوئی ناشیہ ور ہی کر سکتا ہے۔ میں نے دُعا کے باپ سے پوچھا کہ لڑکی کے چند اور امیدوار بھی ہوں گے جنہیں رشتے سے جواب دیا گیا ہوگا۔ اُن میں سے کسی نے انتقامی ردِ عمل کا اظہار کیا ہوگا یا دھمکی دی ہوگی۔

باپ نے بتایا کہ یہ رشتہ ایسا ہے کہ اسی گھیں دینا تھا۔ یہ برادری کے رشتوں کا لین دین تھا جس کے تحت بات کیے بغیر سمجھا جاتا تھا کہ فلاں لڑکی فلاں گھر میں جاے گی۔ پھر بھی دو گھنوں نے رشتہ مانگا تھا۔ انہیں دھکارا نہیں گیا تھا۔ انہیں سمجھا دیا گیا تھا کہ برادری کی پابندیوں کی وجہ سے یہ رشتہ نہیں دیا جاسکتا۔ ان گھرانوں نے مجبوری سمجھی تھی۔ باپ کی نگاہ میں لڑکی کی گمشدگی کسی کی انتقامی کارروائی نہیں تھی۔

تیسرا شک انسانی نفسیات سے تعلق رکھتا تھا۔ بعض باپ اولاد کو گھر کی زنجیروں میں باندھے رکھتے ہیں۔ لڑکی کو تو وہ بھڑے کا پرندہ سمجھتے ہیں۔ وہ اس دہم میں مبتلا رہتے ہیں کہ زور اٹھول چوک ہوئی اور لڑکی گئی۔ لڑکی اپنے کوٹھے پر جاتے تو باپ اُسے فوراً نیچے آنے کو کہتا ہے۔ اچھی قسم کے باپ شفقت سے بات کرتے اور سمجھاتے ہیں۔ سخت مزاج باپ حکم اور غصے کے بجائے بات کرتے ہیں۔ دن بھر لڑکیوں کے لیے وہاں جان بٹے رہتے ہیں۔ دوپٹہ اچھی طرح لے۔۔۔ دانت دنگ لا کر۔۔۔ دروازے میں کھڑی کیا کر رہی تھی پٹا لگیں توڑ دوں گا پھر کبھی دروازے میں دیکھا تو تڑو وہ اس قسم کے حکم چلاتے رہتے ہیں مگر یہ نہیں سمجھتے کہ بچی بڑی معصوم اور صابزوات ہوتی ہے۔ وہ باپ سے شفقت کی طلب کار ہوتی ہے اور اس کے عوض تمام بات باپ کا سروبانے یا ٹانگیں دبانے

کے لیے تیار رہتی تھیں۔

یہ بھی میرے پیش نظر تھا کہ اس کی شلوار پلنگ پر پڑی تھی اور پلنگ کی چادر اور کبیل غائب تھا۔ میں نے ایسے مریض دیکھے ہیں جو نیند میں بڑے تک بدل کر کمرے اور صحن میں گھومتے پھرتے اور پلنگ پر واپس آجاتے ہیں۔ باپ نے بتایا کہ اُس میں ایسا کوئی نقش نہیں تھا۔ بعض انسان اپنا کھٹے میں پھٹ پڑتے اور کوئی ناروا حرکت کر بیٹھتے ہیں، مگر فوراً ہی پچھلے گتے ہیں۔ اسے ہم ایک لمحے کا پاگل پن کہتے ہیں، خودکشی اور قتل اسی عارضی پاگل پن کا نتیجہ ہوتا ہے۔ دُشمن کے باپ نے بتایا کہ اس کی بیٹی میں ایسی عادت بھی نہیں تھی۔

اس کے بعد ایک ہی پہلو رہ گیا تھا۔ وہ یہ کہ لڑکی خود بھاگی ہے۔ اگر میرا دماغ ٹھیک کام کر رہا تھا تو میں نے اسے جرم کا یہ خاکہ بنایا کہ لڑکی نے شلوار اتاری اور پلنگ کی چادر دیہاتی عورتوں کی طرح کمرے باندھ لی۔ اُس نے کبیل اوٹھا اور باہر نکل گئی۔ ایک صورت یہ تھی کہ اس نے خودکشی کی ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ ریل گاڑی کے نیچے آسکتی تھی لیکن یہ بعید از قیاس تھا کہ وہ خودکشی کی رپورٹ تھمائے میں آچکی ہوتی۔ دوسری صورت یہ تھی کہ اُس نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ دریا تھبے سے ایک میل دُور تھا۔ اس صورت میں لاش ملنے کا یا بھلی ملنے کا امکان کم تھا، اور ایک صورت یہ بھی تھی کہ لڑکی خودکشی کے لیے جا رہی تھی کہ کوئی بدعاش اُسے لے اڑا۔ اگر ایسا بھی نہیں ہوا تو لڑکی جیسے بدل کر اور اپنے آپ کو کبیل میں چھپا کر بھاگنے کے ارادے سے باہر گئی۔ باہر اس کا آشنا کھڑا تھا جو اُسے ساتھ لے گیا۔

ایک ریل گاڑی رات دس بجے کے قریب چلی گئی تھی۔ دوسری دن کے گیارہ بجے گئی۔ تین پارلاریاں بھی جا چکی تھیں۔ لہذا لڑکی کو قبضے میں تلاش کرنا بیکار تھا۔

کالی پھسکی اور کمرہ عروسی

لڑکی کے بھاگنے یا خودکشی کے لیے جواز موجود تھا جو میرے سامنے تھا۔ وہ تھا دُشمن نے

لڑکے کے جلدی خراب ہو جاتے ہیں۔ لڑکیوں کی اگر نفسیاتی ضروریات جن میں شفقت، برہنہ تہ پہنچتی ہوتی رہیں تو وہ اپنے خاندان کی عزت پر مڑتی ہیں۔ اکثر باپ لڑکیوں پر اتنی سخت نگرانی کرتے اور ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں کہ لڑکیوں میں تلخی اور گھٹن پیدا ہو جاتی ہے۔ ان میں سے کچھ لڑکیاں ایسی بھی آتی ہیں جو اپنے لیے ہمت نہ بن جاتی ہیں۔ ان کے اندر مجرمانہ رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ جہاں انہیں دُشمن ملتا ہے وہ جرم گزار دیتی ہیں۔ یہ ایک نفسیاتی چکر ہے جس میں آتی ہوئی لڑکی بچ کر نکل نہیں سکتی اور لوگ حیران رہتے ہیں کہ اتنی شریف اور پردہ دار لڑکی نے یہ جرم کیا ہے۔

یہاں بھی مجھے ایسا ہی شک تھا۔ اور عارضی حد تک میرا شک صحیح ثابت ہوا۔ جرح کر کے میں نے معلوم کر لیا کہ باپ سخت مزاح تہ اور اُس کے احکام بھی سخت ہیں۔ لڑکیوں کے متعلق اُس کی رستہ یہ تھی کہ انہیں ذرا بھی ٹھیل نہیں دینی چاہیئے اور اُن کا کوئی قدم باپ کی اجازت کے بغیر نہیں اٹھانا چاہیئے۔ مجھے یقین سا ہونے لگا کہ لڑکی باپ کے گھر میں بر قدم اس کی اجازت سے اٹھاتی رہی اور یہ قدم اُس نے اپنی مرضی سے اٹھایا ہے جو میرے ریکارڈ کا عجیب و غریب جرم بن گیا ہے۔

میں نے باپ سے لڑکی کی دماغی حالت کے متعلق پوچھا۔ اُس نے کہا کہ وہ نارمل ذہن کی لڑکی تھی۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ پاگل تھی۔ دماغ کی کچھ اور خرابیاں بھی ہوتی ہیں بعض انسان کا دماغ ایک دو منٹ کے لیے بگڑتا ہے۔ اس کی تین چار قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ انسان اُلٹے کے چل پڑتا ہے مگر یہ اکثر نیند میں ہوتا ہے۔ باپ نے بتایا کہ اُسے ایسی کوئی تکلیف نہیں تھی۔ مجھے یہ شک تھا کہ ہو سکتا ہے کہ اس کی آنکھ لگ گئی ہو اور وہ نیند میں چل پڑی ہو۔

یہ معلوم کر لیا تھا کہ لڑکی اچھی خاصی خوبصورت تھی اور اس کا قد بہت بھی اچھا تھا۔ یعنی اس کی شکل، صورت اور قد بہت میں اتنی کشش تھی کہ اُسے دیکھ کر رنگین مزاج انسانوں کے دلوں میں انوکھی خواہش پیدا ہو سکتی تھی۔ اس کے آبلے میں دُلہا میاں اُس کا ٹہتا۔ قہقہو ہا جھمبلا، پتہ وزردی مائل سالن، بکال اند کو کچک بھرتے اور آنکھوں کے قریب کی پٹیاں ابھری ہوئی تھیں۔ لڑکی کا رنگ گورا اور آنکھیں سیاہی مائل بادامی رنگ کی بنائی گئی تھیں۔ دُلہا کا سر شاہ دولے کے چوہوں کی طرح چھوٹا اور مخروطی تھا۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ لیکن اُس کا مذاق نہیں اڑا رہا۔ ہر انسان کا خالق خدا ہے۔ کسی کی بدصورتی کا مذاق اللہ کے حضور گستاخی ہوتی ہے۔ میں نے دُلہا کی شکل و صورت صاف اس لیے بیان کی ہے کہ مجرم کا باعث۔ معلوم کرنے کے لیے یہ ضروری تھا۔ اتنی خوبصورت اور گورے رنگ کی لڑکی کو ایسے بدصورت لڑکے سے بیاہ دینا مجھے کچھ اچھا نہ لگا۔ مرد کو تو یہ حق دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی پسند کی شادی کرے مگر لڑکی پر یہ ظلم کیا جاتا ہے کہ برادری کی پابندیوں کی وجہ سے یا دولت کے لالچ میں جبد سے بدصورت مرد اور بعض اوقات بڑی عمر کے مرد کے ساتھ بیاہ دیا جاتا ہے۔ اس واردات میں میرا یہ شک پختہ ہوتا گیا کہ یہ لڑکی باغی ہو گئی ہے۔ اُس نے خودکشی کر لی ہے یا اپنے چوری چھپے کے آشنا کے ساتھ بیگ لگئی ہے۔

میں نے دُلہا کو انگ بٹھالایا۔ وہ منوم تھا۔ اس کی مردانگی پر کابری چٹ پڑی تھی میں نے جب اس کے ساتھ باتیں شروع کیں تو معلوم ہوا کہ وہ ذہنی لحاظ سے بھی بھدا اور کاہل ہے۔ میرا سوال سن کر خالی غالی سی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں اپنا سوال دہراتا تو وہ ادھر اس جواب دیتا۔ میں یہ تو سمجھ سکتا تھا کہ دہن کی گمشدگی یا فرار نے اس کا ذہن ماؤف کر دیا ہے لیکن ذہنی کاہلی اُس کی عادت معلوم ہوتی تھی۔ بعد میں اُس کے باپ سے بات ہوئی تو اس نے کہا تھا۔

”یہ تو بھولا بادشاہ ہے۔“

میری نگاہ میں یہ بادشاہ ضرورت سے زیادہ ہی بھولا تھا۔ عورت ذات اتنے زیادہ بھولے بادشاہوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا کرتی کیونکہ خداوند کو وہ اپنا فخر سمجھتی ہے اور وہ اپنے فخر کو مذاق کا نشانہ بنانا نہیں دیکھ سکتی۔

”شادی سے پہلے تم نے لڑکی کو دیکھا تھا؟“ میں نے دُلہا سے پوچھا۔ اُس نے جواب دیا کہ بہت قریبی رشتہ داری ہے۔ ہم بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ اکٹھے کھیلے بھی تھے۔ رشتہ طے ہونے تک ایک دوسرے کے گھروں میں آتے جاتے رہے ہیں۔

”لڑکی تمہیں پسند کرتی تھی؟“ میں نے سیدھے لفظوں میں سوال داغ دیا اور یہی پوچھا۔

”تمہارے ساتھ اُس کا سلوک کیسا تھا؟“

وہ عادت کے عین مطابق کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ مجھے بڑی ہی تیرج دا جرح کرنی پڑی۔ کوئی خاص بات معلوم کرنے کے لیے جرح ایک خاص ڈھنگ سے کی جاتی ہے بعض باتیں گپ شپ کے انداز میں کی جاتی ہیں۔ یہ استاد ہی صرف پولیس والے جانتے ہیں۔ میں نے اس استاد سے دُلہا سے معلوم کر لیا کہ لڑکی نے اُسے کبھی نفرت کی نگاہ سے بھی نہیں دیکھا تھا اور پسند بھی نہیں کیا تھا۔ میں نے اُس سے یہ بھی اگلو الیا کہ لڑکی اُس کا مذاق بھی اڑاتی تھی۔ دو بار لڑکی نے اسے کالی چھپکلی بھی کہا تھا۔ بہر حال یہ ثابت ہو گیا کہ لڑکی اُسے ایک بھدا بدصورت رشتہ دار سمجھتی تھی۔ میں نے یہ رائے قائم کی کہ لڑکی کا رشتہ طے ہوا تو لڑکی کو بہت دکھ ہوا ہو گا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ لڑکی اسے ناپسند کرتی تھی تو وہ کسی اور کو پسند کرتی تھی یا کسی اور کے ساتھ اس کا میل جول تھا؟ میں نے دُلہا سے صاف الفاظ میں پوچھا تو اُس نے پہلے تو گھبراہٹ کا مظاہرہ کیا اور اُسے شاید غصہ بھی آ گیا تھا۔ اُس نے سوچ کر یا جھینپ کر جواب دیا کہ وہ کسی اور کو پسند نہیں کرتی تھی۔

اُس کا جواب دینے کا انداز اِلا ہوتا تھا جس سے مجھے شک ہو کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے پوچھا کہ رشتہ طے ہو جانے کے بعد کسی نے اُسے براہِ راست یا کسی کی زبانی کوئی دھمکی دی تھی؟ ”نہیں“ یہ جواب بھی اُس نے کہ ”شیش کر کے منہ سے نکالا۔ میں نے رپورٹ کا اندراج اور ویڈیو ڈانڈنی کا دروائی کی۔ اپنے ایک بیٹا بانیبل سے کہا کہ ریلوے اسٹیشن سے پتہ کرے کہ رات کی کالہی سے کوئی لڑکی کبیل اوڑھتے ہوئے، اچھا دروازہ بند ہے ہوئے کسی کے ساتھ گئی تھی یا نہیں۔ میں نے اُسے حملیہ اور لباس اچھی طرح سمجھا دیا اور اُسے کہا کہ لاریوں کے اڈے سے بھی معلوم کرے۔ اُسے آدھری پہنچ کر میں وہ مکان دیکھنے لگا جہاں سے دُہن لاپتہ ہوتی تھی۔ یہاں میں پھر اسی انڈوس کہ اٹھارہ کروڑ کا جرینس کئی کہانیوں میں کرچکا ہوں کہ یہ واردات بھی مسلمان گھرانوں کی تھی۔ بندوق ایک پاک تو نہیں تھی۔ ہندو سے زیادہ ناپاک قوم اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ لیکن ان کے گھروں میں ایسی شرمناک وارداتیں نہیں ہوتی تھیں۔ میں اس محلے میں داخل ہوا تو تماشائی یہ سب سے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ لڑکی کے باپ اور سسر کے دل پر کیا گزُر رہی ہو گی۔ میں گلی کے دونوں طرف کے مکانوں کو دیکھتا واردات والے مکان میں داخل ہو گیا۔ مجھے دو کدو دکھائی دیا جہاں سے دُہن غائب ہوئی تھی۔

اس کمرے کا ایک دروازہ اندر تھا اور دوسرا ڈیوڑھی میں کھلتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور دروازہ تھا جو مکان کے صحن اور ڈیوڑھی کو ملا تھا، اور ایک دروازہ ڈیوڑھی کا تنہا جو گلی میں کھلتا تھا۔ وہیں سے گلی شروع ہوتی تھی۔ گلی زیادہ لمبی نہیں تھی۔ پانچ مکان ایک طرف تھے اور سات دوسری طرف۔ واردات والا مکان گلی کو بند کر دیتا تھا۔ گلی سڑک سے جا ملتی تھی جس کے دونوں طرف دوکانیں تھیں۔ کان کی سیڑھیاں ڈیوڑھی میں تھیں۔ گلی میں کوئی جتی نہیں تھی۔ سڑک پر بھی جتی نہیں تھی۔

میں جب وہاں پہنچا تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ لڑکی کا بھاگنا یا اغوا اس وجہ سے آسان تھا کہ وہ قصبہ تھا جہاں کی زندگی شام گہری ہوتے ہی سو جایا کرتی تھی۔ اُس زمانے میں کاروبار کا آج والا بنگام نہیں تھا۔ آبادی بہت کم تھی جس کی وجہ شاید یہ تھی کہ انگریزوں نے خاندانی منصوبہ بندی کا محکمہ نہیں کھولا تھا۔ رات کو بچے کو قصبہ قرسان کی طرح خاموش ہو جانا کرنا تھا۔ اُسی روز ڈولی آئی تھی۔ گھر میں مہمانوں کی کچھ تعداد تھی مگر مہمانوں کا بنگامہ صحن کی طرف تھا۔ اُس طرف ایک اور دروازہ تھا جو ایک میدان کی طرف کھلتا تھا۔ ایک کشادہ ڈیوڑھی اُس طرف بھی تھی۔ گھر کی عورتیں اور مہمان عورتیں اس ڈیوڑھی اور ساتھ والے ایک کمرے میں کھانے کمانے اور بنسنے کھیلنے میں لگی ہوئی تھیں۔ دُہا باہر میدان میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا گپ شپ لگا رہا تھا۔ گلی کی طرف کوئی رش نہیں تھا۔

میں نے کمرہ عوسی کو اندر جا کر ڈیوڑھی ہی غور سے دیکھا۔ پنگ پر پنگ پوش نہیں تھا۔ دُہن کی شلوار پنگ سے اٹھا کر الماری میں رکھ دی گئی تھی۔ مجھے دکھائی گئی۔ میں نے اسے پولیس کی گہری نظر سے دیکھا۔ اس پر مجھے تشدد کا اور زبردستی کا کوئی ثبوت نظر آیا۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ کہیں ایسا ہی نہ ہو کہ لڑکی کو اغوا کرنے والے اسے چادر اوکھیل میں لپیٹ کر اور گٹھڑی کی طرح اٹھا کر لے گئے ہوں، لیکن یہ دلیری پیشہ ور ہی کر سکتے تھے۔

یہ سوال بھی میرے سامنے آیا کہ انہیں یہ کیسے پتہ چلا کہ لڑکی کو فلاں وقت کمرے میں داخل کیا جائے گا اور دُہا ایک گھنٹہ بعد کمرے میں آئے گا؟ اندر کے دروازے کی چٹینی کس نے چڑھائی تھی؟ اور یہ بھی ایک مہمہ تھا کہ دُہن کی شلوار کمرے میں کیوں رہ گئی؟ اس کی جوتی بھی وہاں نہیں تھی۔ اگر اسے اٹھایا گیا تو پنگ سے اٹھایا گیا ہوگا۔ اُس کی جوتی وہیں رہ جانی چاہیے تھی۔ اس صورت میں لڑکی کی کوئی آواز کھنی چاہیے تھی۔ میں نے گھروالوں سے پوچھا کہ دُہن کی کشدگی کے بعد وہ اس کمرے

تھی۔ وہ بدلتے جاتا اور فوراً اٹھ کھڑا ہوتا۔ تین چار قدم چلتا اور رک کر میرے منہ کی طرف دیکھنے لگتا میں نے کہا کہ دلہن کی ماں کو بلاؤ اور اگر دلہن کی بہنیں ہوں تو انہیں بھی بلاؤ۔ معلوم ہوا کہ دلہن کی ایک ہی چھوٹی بہن تھی جس کی عمر سولہ سترہ سال ہے۔ وہ سسرال میں بھی رہتی تھی۔ میں نے سب سے کہا کہ لڑکی کی ماں کو میرے پاس بھیج کر سب باہر چلے جاؤ۔

کہہ خالی ہو گیا۔ دلہن کی ماں اندر آئی تو سہم ہوتا تھا اگر پڑے گی۔ غم سے نڈھال تھی۔ اُس کی آنکھیں رو رو کر سوچ گئی تھیں۔ اس نے وہ نیا پنک وکیا جو اُس نے بیٹی کو جہیز میں دیا تھا تو اُس کی چمکیاں نکل گئیں۔ وہ بات چلتی تھی اور زور زور سے باتی تھی۔ میں نے اسے تسلیاں دیں۔

”اے اسی طرح غائب ہونا تھا تو میرے گھر سے اس کا جنازہ اٹھتا۔ اتنی خوشیوں سے ڈولی میں بھرتی۔۔۔ اور اُس کی چمکی بند ہو گئی۔“

پولیس والوں کو پتہ چونا پڑتا ہے۔ اگر نہیں بھول جاتا کہ میں متناظر ہوں تو میں اس عورت سے زیادہ روتا۔ میں نے دل پر تپڑ کھڑکھا۔ ”رونے سے تو وہ واپس نہیں آجائے گی۔ میں جو پوچھوں وہ تباہ تو اسے واپس لے آؤں گا۔“

آپ جانتے ہیں کہ ماں بیٹی جبراً ہوتی ہیں۔ اگر بیٹی ماں کو ہمارا نہ بنائے تو ماں ایسی جاسوسی کرتی ہیں کہ بیٹی اُن سے اپنے پیٹ کے اندر کی سبھی کوئی چیز نہیں چھپا سکتی۔ جو ان بیٹیوں کی ماؤں کو جاسوسی کرنی ہی پڑتی ہے۔ اگر یہ ماں بیٹی کے معاملے میں دھل جاتی تھی تو نکل نہیں لے اس سے بی سسرال پوچھ کر لڑکی کے باپ سے پوچھتے۔ ماں نے سبھی بیٹی کے چال چلن کی تعریف کی۔

میں نے اُسے کہا کہ لڑکی کو زمین نے نہیں نگل لیا اور ابھی کسی ماں نے اتنا دلیر بیٹا پیدا نہیں کیا جہاں شادی والے گھر سے دلہن کو اٹھا کر لے جاتے۔ لڑکی نادان تھی۔ جذبات میں اگر یا کسی کے

دور غلانے میں اگر نکل گئی ہے۔ مجھے ذرا سا اشارہ دے دیں کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔ وہ جو کوئی بھی ہے آپ کے محلے یا بارادری کا ہو گا۔

ماں نے رو رو کر دہن کر کر کے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی کہ اُس کی بیٹی بیک پاک تھی۔ میرے سوال کے جواب میں اُس نے یہ بھی بتایا کہ لڑکی کو یہ رشتہ پسند تھا۔

”آپ کے گھر میں شکوک چال چلن کی کوئی عورت آیا کرتی تھی؟“ میں نے اُس سے پوچھا۔

اُس نے اس کا جواب بھی نفی میں دیا۔ میرے کریدنے پر اس نے بتایا کہ نوکرانی قسم کی ایک عورت اُن کے گھر آیا کرتی تھی۔ وہ بیاہ شادی اور ماتم کے موقعوں پر گھروں میں کام کرتی تھی۔ شادی بیاہ کا بلاوا دینے گھروں میں جاتی تھی اور اس کی ہر گھر میں بے تکلفی تھی۔ لیکن لڑکی کی ماں کو اس پر کسی قسم کا شبہ نہیں تھا۔ اپنی مزید اور میرا پیڑی والی جرح سے میں نے یہ معلوم کر لیا کہ یہ عورت اس کی بیٹی کے پاس بھی کبھی کبھی بیٹھا کرتی تھی۔

”کبھی ایسے بھی ہوا ہے کہ آپ کی بیٹی سامنے نہیں تو اس عورت نے آپ سے پوچھا ہو کہ بیٹی کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”اور پھر وہ اندر آپ کی بیٹی کے پاس جا بیٹھی ہو۔“

”کتنی بار ایسے ہوا ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔

”آپ کی بیٹی اس عورت کو بہت پسند کرتی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”دونوں کیسی بیٹھتی تھیں؟“

ماں کے منہ سے ہاں نکل گیا۔ میں معلوم کے ایسے کرداروں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ ہر قصبے اور بستی میں ایسی ایک نہ ایک عورت ضرور ہوتی ہے۔ یہ عورت ہر گھر کی رازدار اور ہر گھر کی نوکرانی ہوتی ہے۔ چالاکی اور چرب زبانی اس کا کمال ہوتا ہے۔ یہ ہر کسی کی ہمدرد ہوتی ہے اور

منہ ناک کی اجڑت کے کہ ہمدردی کے پردے میں جڑوں کو پانی دے جاتی ہے۔ یہ عورت دودلوں کو جوڑ
 بھی سکتی ہے۔ اور توڑ بھی سکتی ہے۔ پردہ نشینوں کے عشق و محبت میں یہ پیغام رسانی کا کام کرتی ہے۔
 میں نے جب گمشدہ زندگی کی اس کی زبان سنی۔ اسی ہی ایک عورت کا ذکر سنا تو میں چونکا۔ اس کا نام
 قبول کیا گیا۔ میں نے اس سے معلوم کر لیا کہ وہ ان کے گھر زیادہ آتی جاتی تھی۔ جب لڑکی کی ڈولی اس گھر
 میں آگئی تو وہ یہاں بھی یعنی لڑکی کے سسرال آگئی۔

میں نے اس کو باہر بھیج کر دیکھا کہ مار کر بٹایا۔ اس سے بہت ساری باتیں پوچھیں۔ اس نے
 بھی لڑکی کے چال چلن کے خلاف کوئی بات نہیں کی۔ میں نے قبول کے متعلق کچھ معلومات حاصل کیں۔
 دیکھا کہ اس نے بتایا کہ وہ ڈولی کے ساتھ آئی تھی۔ دوسرے کے کرے کی سجاوٹ وغیرہ میں اس نے بہت
 دلچسپی لی تھی۔ دوسرے کو کہتے ہیں داخل کیا گیا تو قبول دوسرے کے پاس گئی تھی۔

میں نے جرح کر کے یہ بھی معلوم کر لیا کہ اسے ایک بچہ دوسرے کے کرے میں جاتا دیکھا گیا تھا۔
 تاہم کسی کو اس پر شک نہ تھا۔ اسے سب بہ کسی کی خدمت کرنے والی عورت سمجھتے تھے۔ میں اس کو دار
 کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرے کے ساتھ اس کا انگوٹنی خاص واقعہ نہیں تھا۔ اسے اس گھر میں بھی
 اپنا حق اور انعام وصول کرنا تھا۔ دوسرا اور دوسرے کے گھر وہ نہیں تھے۔ میرے لیے قبول کیا یہاں تاغیر معمولی
 واقعہ تھا۔ میں فوراً ہی اسے تفتیش میں شامل نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اسے میں ہیڈ کا نیٹیل آگیا۔ اس نے بتایا کہ اس کی گاڑی سے ریوے ٹیشن سے صرف چار
 فٹ دینے گئے۔ بنگلہ کو کہنے نے بتایا کہ چاروں دیہاتی تھے۔ دن کی گاڑی کے لیے سات گھنٹے
 لگے۔ ان میں بھی کوئی عورت نہیں تھی۔ لارڈوں کے اوٹے سے بھی کوئی جواب ملا۔

گوکہ کیا چکر لگا رہا تھا۔ اس سے پوچھا کہ اس نے اس جگہ کے قریب جو ایک محلے دار نے بتائی تھی
 رات نو اور دس بجے کے درمیان کوئی ٹانگہ لکھا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ پہرے کے لیے ابھی آ رہا تھا۔

اسے ایک ٹانگہ جانا نظر آیا تھا۔ وہ چونکہ چونک رہا تھا اس لیے اس نے ذرا غصے سے دیکھا تھا کہ ٹانگے میں
 کون ہے۔ وہ کسی کو پہچان نہ سکا۔ اتنا دیکھا کہ وہ ٹانگہ بان سمیت چار تھے۔
 کوئی بات نہ بنی۔ میں نے ہیڈ کا نیٹیل کو الگ کر کے کہا کہ تمام انفارمیشن تمہارے پاس ہے۔
 کرو۔ انہیں جو کام دینا تھا وہ میں نے ہیڈ کا نیٹیل کو سمجھا دیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے گونگے
 کو بھی فارغ کر دیا اور دوسرے کی چھوٹی بہن کو کہے میں بلایا۔ سولہ سترہ سال کی فوجان اور پردہ دار
 لڑکی تھی۔ میں نے اسے بٹھالیا۔ وہ بھی رو رہی تھی۔

دوسرے کی چھوٹی بہن، سہیلی کا بڑا بھائی

جھبک اور شرم لازمی تھی۔ اس کے علاوہ پولیس کا خوف بھی تھا۔ بڑی بہن کے اس
 حادثے کا غم بھی تھا۔ میں نے کچھ وقت صرف کر کے اس معصوم سی لڑکی کے دل سے پولیس کا خوف
 نکال دیا۔ جھبک بھی کم کر دی اور اسے قائل کر لیا کہ میں اس کا ہمدرد ہوں۔ میں نے اس پر واضح
 کر دیا کہ میں چونکہ مسلمان ہوں اس لیے مسلمان گھرانوں کی عزت کی حفاظت کو اپنا فرض سمجھتا
 ہوں۔ اسے یہ بھی کہا کہ تمہاری بہن کسی کے دھوکے میں آگئی ہے۔ میں کل شام سے پہلے پہلے
 اسے اس جال سے نکالنا چاہتا ہوں۔ بہن بہن کی راز دار ہوتی ہے۔ اپنی بہن کے متعلق تم جو
 کچھ بھی جانتی ہو مجھے بتا دو۔ ورنہ میں اسے تلاش نہیں کر سکوں گا۔

اس لڑکی نے بھی بہن کے کسی خفیہ تعلق سے اس علی کا انکار کیا لیکن لڑکی عقل مند اور
 حقیقت پسند معلوم ہوتی تھی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ کسی کے بارے میں قسم بھی تو نہیں کھائی جاسکتی۔
 میں نے اسے کہا کہ میں کچھ پوچھوں مجھے اپنا بھائی اور باپ سمجھ کر بتا دے۔ اس نے بلا جھبک
 کہا کہ وہ کچھ بھی نہیں چھپاتے گی۔ میں نے سوالوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔

بلے شمار سوالوں کے جواب میں اُس سے میں نے جو حاصل کیا وہ یہ تھا کہ اس کی بہن کی تین سہیلیاں ہیں۔ ایک سہیلی بہت گہری ہے۔ بہن اس کے گھر زیادہ جاتی تھی۔ سہیلیوں کے نام سے ایک اور کردار میرے ذہن میں آ رہا۔ ”سہیلی کا بھائی“۔ یہ کردار اب بھی ہمارے معاشرے میں موجود ہے۔ ایسے کہ جن کی کوئی کمی نہیں کہ لڑکیوں کی سہیلیوں کے غیر شادی شدہ بھائیوں سے بے تکلفی پیدا ہو جاتی ہے۔ اچھی قسم کی سہیلیاں بھائیوں کو سہیلیوں سے بہادرتی ہیں مگر جہاں سے شرم و حیا اٹھ گیا وہاں کوئی اور بھائی نکلتے ہیں۔ لڑکیاں سہیلیوں سے ملنے کے بہانے اُن کے بھائیوں سے ملتی ہیں۔ اس دامن کا بہن سے میں نے پوچھا کہ ان تینوں میں سے کسی کا بھائی جوان اور غیر شادی شدہ ہے؟

اُس نے بتایا کہ جس کے ساتھ اس کا بہت پیار تھا اس کا ایک بھائی جوان اور غیر شادی شدہ ہے۔ میرے پوچھنے پر لڑکی نے یہ بھی بتا دیا کہ وہ اپنی بہن کے ساتھ اس سہیلی کے گھر جایا کرتی تھی۔ اُس نے دیکھا تھا کہ سہیلی کا یہ بھائی اُن میں بیٹھ جاتا اور گپ شپ لگاتا تھا۔ لڑکی سے میں نے یہ سچی معلوم کر لیا کہ اس کی بہن سہیلی کے بھائی کے ساتھ بے تکلف تھی۔ بعد میں بہن نے چھوٹی بہن کو رہا کر دیا۔ اُسے چھوٹی بہن نے محسوس بھی کیا تھا۔ اس بھائی کے متعلق بہن نے بتایا کہ خوب رو بوجوان ہے۔ منہس ٹکڑ ہے اور کرتی جسم والا ہے۔ طبیعت کا شون اور دلیر ہے۔

قبول کے متعلق لڑکی نے بتایا کہ اس کی بہن کے پاس آتی جاتی تھی۔ بہن اسے پسند کرتی تھی۔ کہا کرتی تھی کہ بڑی دلچسپ عورت ہے۔ میں نے لڑکی سے پوچھا کہ سہیلی کے اس بھائی اور اپنی بہن کے تعلقات کیسے متعلق اُس کی کیا رائے ہے۔

”آپ جو کچھ پوچھ رہے ہیں، وہ سچ بتا رہی ہوں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”میرا اپنا

دل کچھ اور قسم کا ہے اس لیے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتی۔ آپ خود سنانے ہیں۔ مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ قبول کے متعلق یہ نہ دو رکھوں گی کہ وہ شریف عورت نہیں۔“

میں نے بہت کوشش کی کہ وہ وضاحت کرے کہ یہ عورت کیا کرتی ہے۔ لیکن لڑکی نے کوئی بات یا خاص واقعہ نہیں سنایا۔ البتہ اُس نے ایسا لہجہ اختیار کیا جس سے میں سمجھ گیا کہ قبول نے اس لڑکی کو بھی کسی امیدوار کا پیغام دیا ہو گا جو لڑکی نے قبول نہیں کیا۔ اپنی بہن کے چال چلن کے متعلق اس نے شک کا اظہار نہیں کیا۔ یہ بھی دلچسپ سے کہا کہ اس نے سہیلی کے بھائی سے کبھی چوری چھپ کے ملاقات نہیں کی۔ بہر حال اس لڑکی نے میرے لیے کچھ نہ کچھ زمین ہموار کر دی۔ میں نے اُسے بھی فارغ کر دیا۔

میں نے گھر کے مردوں کو بلا کر قسماً دی۔ کچھ ہدایات دیں اور تھانے چلا گیا۔ مگر آگے تھے اور جانے ہی والے تھے۔ میں نے انہیں گندہ دامن کی سہیلی کے بھائی کا نام بتا کر کہا کہ اس کے متعلق تمام تر معلومات حاصل کریں۔ انہیں نصحت کر کے میں ان دو کرداروں کے متعلق سوچنے لگا۔ ایک قبول اور دوسرا سہیلی کا بھائی جس کا صحیح نام اگر مجھے یاد رہ گیا ہے تو آصف تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس فرامی قبول نے مدد دی ہے ورنہ جو آدمی ناگہ لاے تھے وہ کیسے جان گئے تھے کہ لڑکی فلاں وقت باہر کو جاتے گی۔ مجھے اب یہ فیصلہ کرنا تھا کہ اُن پر براہ راست حملہ کروں یا کچھ شہادت اور سرانجام فراہم کر کے انہیں گھیروں۔ تفتیش کا یہ مرحلہ بڑا ناگ اور خطرناک ہوتا ہے۔ بغیر شہادت کے شبہ پر حملہ کرنا تو صاف بچ کر اپنے تختہ کا بندوبست کر لیتا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ پہلے ناگے والے کو تلاش کروں۔ ہو سکتا ہے وہ اُن دونوں آدمیوں کو پہچانتا ہو۔

میرا اسسٹنٹ سب انسپکٹر ٹرنک کے کسی گاؤں کا رہنے والا لکھونا تھا۔ وہ تھا توندو لیکن مسلمان کی اولاد معلوم ہوتا تھا۔ دلیر بھی تھا دینا سدا رہی۔ اس میں مسلمانوں کے خلاف ذرہ بھر تعصب

نہیں تھا۔ اس شخص پر میں ہر قسم کی صورت حال میں انتہا دیکھتا تھا۔ میں نے اُسے دلہن کی شادی کی وارادت سنائی اور کہا کہ کل صبح قصبے کے تمام ناگہ بانوں سے معلوم کرے کہ گزشتہ رات فلاں گبارتہ کون سواری سے گیا تھا اور کہاں۔۔۔ گیا تھا۔ میں نے اُسے سواروں کے متعلق تمام تفصیلات بتائیں۔ لڑکی کے متعلق بھی بتایا کہ وہ کس عیس میں تھی۔

قصبے میں ناگہوں کی تعداد پچیس تھی۔ یہ ٹوٹے پھوٹے تھے جو قریبی دیہات تک جاتے تھے۔ قصبے کے اندر ان کی ضرورت کم تھی۔ اپنی اتھی کیونکہ فاصلہ زیادہ نہیں تھے۔ ناگہوں کی اتھی تھوڑی تعداد کی چینگ کوئی شخص کام نہیں تھا۔ مکمل نوجوان بھی تو ہمیں یہ کام کرنا تھا۔ صرف ناگہ والا ہی بننا تھا کہ اس نے سواریاں کہاں تھیں۔ رگھوناتھ نے اُسی وقت کانٹیلوں کو بلا کر اس ڈیوٹی کی تفہیم کر دی۔ میں نے کانٹیلوں کو خبر دیا کہ کسی نے کسی ناگہ والے سے ایک پیسہ بھی لیا تو بھانے ہو کر میں کیا دھڑکوں گا۔

ایک نوجوان قتل ہو گیا

رات کے گیارہ بجے تھے۔ چنگ اور نیند نے پریشان کر رکھا تھا۔ میں گھر گیا۔ نہایا کھانا کھایا اور گویا۔ صبح پانچ بجے ایک کانٹیل نے جگایا اور بتایا کہ قتل کی وارادت آئی ہے۔ لاش شناخت کی جا سکی تھی اور ابھی موقع وارادت پر پڑی تھی۔ قصبے کے ساتھ ہی ایک میدان تھا جس میں درخت بھی تھے۔ وہاں بچے کھیلنا کرتے تھے۔ چند ایک نوجوانوں نے وہاں اکھاڑہ کھودا ہوا تھا۔

وہ اکھاڑوں کا زمانہ تھا۔ نوجوان درخت کرتے۔ بٹنی روتے اور کبڈی کھیلتے تھے۔ لباس کی سہولت اور جسم کی ساخت پر توجہ دی جاتی تھی۔ عورت فیشن لباس والے کی کم اور توند جسم والے کی زیادہ ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اُس وقت کرور نہ تھے اور جرات مندی بھی تھی کسی کسی کو لہری غلا

رات پرے جاتی تھی جیسے لڑکی کی گشتگرگ کی وارادت میں ہوا لیکن جو کوئی سنتا تھا چونک اٹھتا اور ہاتھ کانوں پر رکھ لیتا تھا۔ آج کل کوئی بھی نہیں چونکتا۔ کسی لڑکی کو کسی کے ساتھ بھاگ جانے کی ضرورت ہی نہیں۔ انگریزی تہذیب اور فیشن نے سب کو کھلی ٹھٹھی دے دی ہے۔ جو گھرانے اخلاق کی طور طریقوں اور اسلامی طرز زندگی سے آزاد ہو گئے ہیں، ان کے میاں بیوی آزاد ہیں۔ ان کی دہانوں کو بھاگنے کی کیا ضرورت ہے۔ دوست بلاروک ٹوک بل جاتے ہیں۔

میں موقع وارادت پر گیا۔ تماشائی ذرا دھڑکے تھے۔ اکھاڑے کے کنارے پر ایک لاش چپٹ پڑی تھی۔ خوب رجوان تھا۔ جسم کے پٹے نہایت اچھی طرح بنائے گئے تھے۔ اُس نے پہلو انوں والا انگوٹ باندھ رکھا تھا۔ جسم پرتیل کی لاش کی ہوئی تھی۔ تیل کی شیشی ایک گھسی تھی اور اُس کے قریب اس کے کپڑے پڑے تھے۔ عمر پانچ تیس سال تھی۔ لاش کی زبان دانتوں میں کبڈی ہوئی تھی اور اکھیں قدرتی حالت سے زیادہ کھلی ہوئی تھیں۔ مقتول کا باپ، اماں، بہن اور دو چھوٹے بھائی جس طرح جیخ چلتا رہے تھے، اس سے آسمان کا سینہ چاک ہو رہا تھا۔

میں نے پتلا کام پر کیا کہ کھوجی کو لانے کے لیے ایک کانٹیل کو دوڑایا۔ کھوجی ڈیڑھ ایک میل دوڑ گاؤں میں رہتا تھا۔ لاش کا نظری معائنہ کیا۔ جسم پر کئی زخم نہیں تھا۔ گلا گھٹنا گیا تھا۔ گردن پر نشان واضح تھے۔ گتے میں رسی ڈالی گئی تھی۔ رسی وہیں پر ہی تھی۔ یہ چار پائی کی ادوا میں کی گز بھر لی رسی تھی۔ میں نے لاش کو اٹھوا کر ذرا پرے کرایا۔ مجھے امید تھی کہ قاتل کی کوئی نہ کوئی نشان بل جائے گی۔ نشان مل گئی۔ یہ ایک توہید تھا۔ یہ نصف انچ مربع توہید چاندی کا تھا۔ اس کے ساتھ کالی ڈوری تھی۔ یہ مقتول کا بھی ہو سکتا تھا قاتل کا بھی۔ لوگ گتے میں توہید باندھا کرتے تھے جن کی ڈوری زیادہ لمبی نہیں ہوتی تھی۔

میں نے مقتول کے باپ سے پوچھا کہ یہ توہید مقتول کا ہے یا اُس نے بتایا کہ مقتول کا نہیں۔

اس نے تعویذ بھی نہیں باندھا تھا۔ پھر یہ قاتل کا تھا۔ ڈوری ٹوٹی ہوئی اور پرانی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مقتول نے مرنے سے پہلے قاتل سے بچنے اور قاتل سے بچنے کی کوشش کی تھی۔ قاتل نے اس کے گتے میں دستی ڈالی تو مقتول نے اس کے تعویذ ڈوری پکڑ لی ہوگی۔ اس کا گلا گھونٹنے کے لیے ڈوری پر ڈوریا توڑ دی ہوگی۔

یہ تو قتل کا طریقہ تھا جو دستی کی موجودگی اور مقتول کی گردن پر دستی کے نشانات سے واضح تھا۔ میرا اصل مسئلہ تو یہ تھا کہ قاتل کون ہے۔ میں نے اکھاڑے میں دیکھا گزشتہ شام اکھاڑے میں آنے والے کھدی ہوئی گتے پر لکھا تھا۔ اکھاڑے کے ایک کنارے کے ساتھ پاؤں کے بہت سے گتے نشان تھے۔ اور دستی کی حالت بتاتی تھی۔ یہاں قاتل اور مقتول کا وقتا بہت لمبا ہے۔ ہمارے مٹی پر پاؤں کے صاف نشان تھے جن سے کارخ نما تھا کہ واردات کے بعد قاتل اوپر سے واپس گیا ہے۔ آٹھ کے نشان نہیں تھے۔ کھدی ہوئی ہموار اور نرم مٹی پر جس میں تیل اور پسینے کی آمیزش بھی تھی۔ یہ نشان جنہیں گھر سے کہا جاتا ہے بڑے ہی واضح اور بہت ہی کارآمد تھے۔ میں نے بیڈ کاسٹل سے کہا کہ وہ ان کا مولد تیار کرنے کا فوراً انتظام کرے۔

تماشاخیوں کو میں نے کہا کہ اس اکھاڑے میں جو آدمی آتے تھے وہ آگے آجائیں اور مقتول کے متعلق جو کوئی جو کچھ بھی جانتا ہے، وہ بھی آگے آجائے۔ میں نے سب کو یقین دلایا کہ انہیں پریشان نہیں کیا جائے گا۔ میرا انداز و نزاکت والا تھا۔ اس میں تمنا نیداروں والا رعب نہیں تھا۔ اس کا اچھا اثر ہوا۔ کچھ آدمی آگے آگے۔ باقی سب کو میں نے دور چل جانے کو کہا اور یہ بھی کہا کہ کسی کے ذہن میں کوئی فراموشی اور غیر اہم سی بھی بات آجائے تو فوراً میرے پاس آجائے۔

رنگونا تھا بھی آگیا تھا۔ اُسے میں نے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوانے کو کہا تب

میں سول ہسپتال تھا جس کا سول سرجن پوسٹ مارٹم کرتا تھا۔ البتہ دیگر پیچیدہ معائنوں وغیرہ کے لیے ہمیں دور جانا پڑتا تھا۔ میں نے وہیں چار پانی منگوالی اور بیٹھ گیا۔ اکھاڑے میں جو افراد آتے تھے وہ سب موجود تھے۔ ان کی تعداد نو تھی۔ پانچ ہندو اور چار مسلمان۔ یہ سب نوجوان تھے۔ مقتول کے ہم عمر۔ ان کا کوئی استاد نہیں تھا۔ سورج نکلنے سے بہت پہلے اکھاڑے میں آتے تھے۔ مقتول اُن سے پہلے سحر کی تاریکی میں آجایا کرتا تھا۔ یہ اُس کا روزمرہ کا معمول تھا۔ یہ لڑکے ورزش کرتے اور کشتی بھی لڑتے تھے۔ شام کو بھی اکھاڑے میں آتے تھے۔

میں نے ان سب کو الگ بٹھا دیا تھا۔ ان کے علاوہ سات آدمی اور بھی تھے۔ میں اکیلے اکیلے کو اپنے پاس بلاتا اور اُسے یہ یقین دلاتا تھا کہ وہ جو کچھ بھی بتانا چاہے بتا دے کسی کو یہ پتہ نہیں چلنے دیا جائے گا کہ اُس نے کیا بتایا ہے۔ میں نے تمام لڑکوں کو باری باری بلایا۔ پھر بڑی عمر کے جو سات آدمی تھے انہیں بھی باری باری بلایا۔ ان میں دو ہندو اور پانچ مسلمان تھے۔ یہ سب باعزت حیثیت کے لوگ تھے۔ میں نے ان سب پر جرح بھی کی۔ ان سے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ یہ تھیں کہ مقتول کو جوانی کے جوش پر قابو نہیں

تھا۔ چال چلن کا مبرا نہیں تھا۔ لوف اور لفنگا بھی نہیں تھا۔ غنڈہ گردی بھی نہیں کرتا تھا۔ اُس میں نقص یہ تھا کہ اپنے آپ کو بہت دلیر اور بہادر سمجھتا تھا۔ اپنے جسم اور طاقت پر اُسے ناز تھا۔ جس کسی کو دیکھے کہ اُس کا جسم موٹا تازہ ہے اور وہ ذرا اینٹھ کر چلتا ہے تو اُسے کشتی کے لیے چیلنج کرتا تھا۔ میرے لیے اس کو راکر سمجھنا مشکل نہیں تھا۔ ایسے کرواراب بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ وہ جو نوجوان ہوتے ہیں اپنے آپ کو رستم سمجھتے گتے ہیں۔ سینہ چوڑا کر کے اور بازو پھیلا کر پہلو انوں کی طرح چلتے ہیں۔ یہ جوانی کا جوش ہوتا ہے۔ ان میں کچھ نوجوان لوف بازی شروع کر دیتے ہیں اور بعض صرف اینٹھتے ہیں سوہ غنڈہ گردی سے جو بچتے ہیں اس میں شرافت کا

دخل نہیں ہوتا، اُن میں داخل اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ ایسی ویسی حرکت کریں۔ وہ اپنے آپ کو بیہ ضرور سمجھتے ہیں۔ میں نے چونکہ نفسیات کا بھی ستھورا سا مطالعہ کیا ہے اور عملی زندگی میں بھی مختلف النوع کردار دیکھے ہیں اس لیے میں ان کے اندر کے احوال کو الف سے وافت کر رہا ہوں۔

مقتول کے معتقدات میں نے اس کے دوستوں اور ساتھیوں کی یہ باتیں سنیں تو میں سمجھ گیا کہ وہ کیا تھا اور کیسا تھا۔ اور میں یہ بھی سمجھ گیا کہ وہ کسی کی عزت پر ہاتھ ڈال بیٹھا ہوگا اور قاتل ہو گیا۔

ایسے بڑے فوجی تھے انھیں کاٹھارہ میں بھیجا کرتے ہیں۔ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ یہ ایک لڑکی اُن پر مبنی ہے۔ میں نے اس کے دوستوں سے الگ الگ پوچھا کہ مقتول سے کبھی کسی لڑکی یا لڑکیوں کی بات کی تھی؟ اس قسم کے کردار اپنے عشق و محبت کے سن گھڑت تھے بھی نہ سنا تے رہتے ہیں۔

میں یہ سن کر یہ ان رہ گیا کہ مقتول نے کبھی کسی لڑکی کی بات نہیں کی تھی۔ دو دوستوں نے وثوق سے کہا کہ کسی لڑکی کے ساتھ اس کا بچہ چل ضرور رہا تھا۔ میں نے بہت کرید۔ یہ بھی پوچھا کہ وہ کون سے محلے میں زیادہ تر جاتا تھا۔ مجھے کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا۔ مقتول کا باپ بھی سرانجام نہ لے سکا تھا۔

ان لڑکوں کے بعد میں نے بڑی عمر کے آدمیوں کو باری باری بلایا۔ سب نے لڑکوں کے بیان کی تصدیق کی۔ وہ چار گمہ بنجیہ عمر کے آدمی تھے اس لیے انہوں نے بنجیہ گیتے باتیں کیں۔ ہندوؤں نے شکایت کی کہ ان کی لڑکیوں کو اس قسم کے مسلمان لڑکوں سے خلہ رہتا ہے مسلمانوں نے کہا کہ اس قسم کے لڑکے ہندوؤں کی نظروں میں ساری قوم کو بدنام کر رہے ہیں۔ انہوں نے

یہ بھی بتایا کہ ہندو لڑکیاں مسلمان لڑکوں کو پسند کرتی ہیں لیکن یہ اچھی بات نہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ مقتول کے باپ سے کہ چکے تھے کہ اُس کا بیٹا اچھی حرکتیں کرتا پھرتا ہے لیکن باپ نے کوئی توبہ نہیں دی۔ یہ تمام آدمی مجھے مقتول کے متعلق تو بہت کچھ بتائے لیکن مجھے ذرا سا بھی اشارہ نہ ملا کہ اس کی دشمنی کس کے ساتھ تھی اور اس کا قاتل کون ہو سکتا ہے۔

میں نے ہندو افراد کو ایک بار پھر بلایا اور اُن سے فرود پوچھا کہ انہوں نے جو کہا تھا کہ اُن کی لڑکیوں کو مسلمان لڑکوں سے خطرہ رہتا ہے، اس قسم کا وہ کوئی واقعہ سنا سکتے ہیں؟ اور کیا مقتول کا کسی ہندو لڑکی کے ساتھ دوستانہ تھا؟

یہ لوگ مجھے کوئی واقعہ نہ سنا سکے۔ یہ صرف شکایت تھی۔ مجھے شک ہوا کہ مقتول ہندوؤں کا شکار ہوا ہے لیکن میں اتنی جلدی تسلیم نہیں کر سکتا تھا کہ ہندو قتل کی واردات کر سکتا ہے۔ ہندو ہجوم کی صورت میں کم تعداد اور نشتہ مسلمانوں کا کشت و خون کر سکتے ہیں۔ انفرادی طور پر ہندو کسی مسلمان کو لٹکانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ پھر بھی میں نے اس امکان کو ذہن میں رکھا کہ قاتل کوئی ہندو ہو سکتا ہے، اور قاتل کرائے کا بھی ہو سکتا ہے جسے ہندوؤں نے نہ مانا گیا ہے دیا ہوگا۔ تعویذ صاف بتاتا تھا کہ قاتل مسلمان ہے۔ اس تفتیش سے مجھے یہی حاصل ہوا کہ مقتول کیسا تھا۔ اس سے قتل کے باعث کی بھی نشاندہی ہوتی تھی۔ مسئلہ البتہ خاصا پیڑھا تھا۔

گمشدہ دُہن اور مقتول

اس دوران کبھی آگیا تھا اور اکھاڑے سے دُور دُور تک کھڑے دیکھ آیا تھا۔ میدان میں گھاس تھی جو خشک بھی ہونے لگی تھی۔ اکھاڑے والا کھرا کہیں نظر آیا، کہیں غائب ہو گیا۔

کھوجی نے بتایا کہ اکھاڑے میں کھڑا قاتل کی واپسی کا ہے۔ دُور کے کھرے بتاتے تھے کہ وہ آیا دوسری طرف سے تھا۔ بادی کے قریب جا کر کھرے غائب ہو گئے۔ آگے سرٹک بھی تھی اور لوگوں کے پاؤں تلے کوئی ٹھہرا محفوظ نہیں تھا۔ میں نے کھرے کا مولڈ بنوانے کے لیے تو کہہ ہی دیا تھا لیکن تجربہ کار کھوجی کا ذہن بہترین مولڈ ہوا کرتا تھا۔ یہ لوگ برسوں تک کھرے ذہن میں محفوظ رکھتے اور اس طرح پہچان لینے سے شغف رہتے۔ انہوں نے ابھی ابھی دیکھے ہیں۔ شکل یہ تھی کہ ان کی گواہی عدالت میں تسلیم نہیں کی جاتی تھی۔ گفتیش میں ان کی مدد متھے حل کر دیا کرتی تھی۔ اس کوٹے کے متعلق اُس نے بتایا کہ ویسی جگہ ہے اور نہ ہی ہے۔ تلوے کی سلائی میں اس نے کوئی ایسی خصوصیت نوٹ کی تھی جو مجھے نظر نہیں آتی تھی۔

میں نے وہیں مقول کے باپ کو بلایا۔ اس سے پوچھا کہ کسی کے ساتھ دشمنی عدالت تھی؟ اُس نے کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا۔ کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اپنے بیٹے کے چال چلن کی اُس نے بہت تعریف کی۔ میں نے جرح کی تو بھی اُس کے مُنہ سے کاسم کی کوئی بات نہ نکلی۔ وہ ہر بات میں غلام کر رہا تھا کہ وہ بہت بڑا آدمی ہے اور اُس کے بیٹے سے سارا شہر ڈرتا تھا۔ مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے کہا۔ ”اپنا جوان بیٹا مروا کر بھی آپ کا بطن پہلے کی طرح موجود رہے گا۔ آپ کے بیٹے سے سارا شہر ڈرتا ہو گا لیکن آپ یہ سہول رہے ہیں کہ اُسے سارا شہر جانتا بھی تھا۔ اگر آپ جانتے ہیں کہ قاتل مل جائے تو مجھے بتائیں کہ کبھی کسی آدمی نے آپ سے یہ شکایت کی تھی کہ آپ کے بیٹے نے اُس کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے؟ میں نے طنز کیا کہ۔ ”اگر کوئی ویسے کہ یہ سہولت پوچھ لیں اور مجھے صحیح جواب دیں۔“

اُس نے دو سلاخانوں کا نام لے کر جن میں ایک حاجی تھا، کہا۔ ”انہوں نے ایک بار مجھے کہا تھا کہ تمہارا بیٹا اونچی حرکتیں کرتا ہے۔ انہوں نے کوئی خاص بات نہیں بتائی تھی۔“

کہتے تھے کہ یہ لڑکا کسی روز تمہاری عزت خراب کرے گا۔“

”ان دونوں کی جوان ہموٹیاں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔ ”اور اُن کے جوان بیٹے ہیں؟“

اُس نے جواب دیا کہ ایک کی ایک بیٹی جوان ہے اور دوسرے کی ہمو جوان ہے۔ دونوں کے بیٹے ہیں۔ میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مقتول نے ان لڑکیوں میں سے کسی کو چھیڑا ہو گا اور اس کے نتیجے میں قتل ہو گیا۔ باپ نے ایسے کسی الزام کو تسلیم نہ کیا۔

میں اندھیرے میں ہاتھ مار رہا تھا۔ مقتول کی ماں کو بلایا۔ وہ بیان دینے کی حالت میں نہیں تھی۔ جس ماں کا جوان بیٹا قتل ہو جائے اُسے تو ہر جہاں جاگتا انسان قاتل نظر آتا ہے۔ ماں پاگل ہو جاتی ہے۔ یہی کیفیت اس ماں کی تھی۔ اُس سے بھی کچھ پتہ نہ چلا۔ مقتول کے بھائی چھوٹے تھے۔ ایک بہن جوان تھی جس کی عمر بیس سال سے زیادہ تھی۔ جذباتی طور پر وہ بھی بات کرنے کے قابل نہیں تھی لیکن میں نے اُس کے جذبات کا ساتھ دے کر اُس کی زبان رواں کر لی۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ تمہارے اتنے خواہجہ بھائی کے قاتل کو تمہارے سامنے پہچانسی دوں گا۔ اُس سے میں وہی راز معلوم کرنا چاہتا تھا جو میرے ذہن میں اٹک گیا تھا۔ یہ تو میں نے معلوم کر لیا تھا کہ اس خاندان کی کسی کے ساتھ ایسی عدالت نہیں تھی کہ قتل تک نسبت پہنچ جاتی۔ قتل کا باعث ایک ہی رہ گیا تھا۔ کسی لڑکی کو اس نے چھیڑا ہو گا یا کسی لڑکی کے ساتھ مراسم ہوں گے۔

مقتول کی بہن سے میں نے پوچھا کہ مقتول شادی شدہ تھا یا رشتے کی بات ہو رہی تھی؟ اُس نے بتایا کہ خالہ کی لڑکی کے ساتھ ملگنی ہو چکی تھی۔ ابھی دن مقرر کرنا باقی تھا لیکن مقتول نہیں مانتا تھا۔ اس انکشاف نے میرا ذہن کھول دیا۔ میں نے انکار کی وجہ پوچھی تو

اُس نے بتایا کہ وہ ایسے گھر کا رشتہ چاہتا تھا جہاں سے نہیں مل سکتا تھا۔

”کیوں بچہ“

”وہ برادری کے باہر کا خاندان تھا۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”وہ رشتہ دیا بھی
نہ تھا۔ پرسوں اس گھر کی شادی بھی ہو گئی ہے۔“

”کیا اس لڑکی کو اُس نے دیکھا تھا؟“ مین نے پوچھا۔ ”اُس کے ساتھ
میل چل تھا۔“

”وہ میری سہیلی تھی۔“ لڑکی نے جواب دیا۔ ”میرے گھر ترقی رہتی تھی۔ دونوں
ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ لڑکی تو اتنی بہت ہی چاستی تھی۔“ یہاں لڑکی روتے
روہنے چھپاں لینے لگی۔ بہت دیر روتی رہی۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے سنبھالا۔ اس نے
اپنے دل کی تسکین کے لیے کہا۔ ”میرا سبائی شہر تھا۔ پتہ نہیں کتنی لڑکیاں اسے دیکھ کر کہیں
جوتی نکلیں اور پتہ نہیں اسے کس کی نظر پڑ گیا تھی۔ جس رات سے گزرتا تھا، کیا وہ کیا
عورتیں اسے چھوڑ دیتی تھیں اور یہ لڑکی تو اس کے اشاروں پر ناچتی تھی۔“ یہاں وہ
چُپ ہو گئی۔ اوجھڑا دھڑکیہ کر سننے لگی۔ ”لیکن اچھا بوا کہ اس کے ساتھ میرے سبائی کی
شادی نہیں ہوئی تھی۔“

”کیوں؟“

”میں اسے شریف گھر کی لڑکی سمجھی تھی۔“ اُس نے کہا۔ ”میرا اور اس کا اتنا
پہا تھا کہ آپ حساب نہیں کرتے مگر وہ تو کچھ اور بھی نکلی۔ آپ کو تو معلوم ہے۔ یہ وہی لڑکی ہے
جو شادی کی پہلی رات ہی کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ پرسوں رات۔“

”اُس کا نام؟“

”جمیلہ۔“ لڑکی نے جواب دیا۔ ”آپ کو پورٹ بل چکی ہے نا، ہمیں پتہ چل گیا
ہے کہ وہ پبلنگ کی چادر باندھ کر اور پُر کھل پیٹ کر کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔“

مجھے یوں دھکے لگا جیسے کسی نے بے خبری میں میرے منہ پر گھونسلہ دے مارا ہو۔ میرے
گمان میں بھی نہیں تھا کہ مقتول کا تعلق گمشدہ دلہن کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ اس لڑکی نے مجھے
یاد دلایا کہ مفروضہ دلہن اپنی ایک سہیلی کے سبائی کے ساتھ بے تکلف تھی۔ میں نے اس ناگہانی
دھکے سے سنبھل کر لڑکی پر نئے زاویے سے سوالوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ یہ سادی جرن اور جواب
کھنکے کی ضرورت نہیں۔ مختصر یوں ہے کہ بہن کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے سبائی (دلہن)
کی باہر بھی ملاقاتیں ہوتی تھیں یا نہیں۔ اسے یہ یقین تھا کہ وہ ایک دوسرے کو الہامانہ انداز
سے چاہتے تھے۔ اس کے سامنے جمیلہ (مفروضہ دلہن) نے اپنے ہونے والے خاندان کا ذکر
کرتے ہوئے اس کا نام نہیں لیا بلکہ اسے کالی چھپکلی کہا تھا اور وہ اسے کالی چھپکلی ہی کہا کرتی اور
ایسی نفرت کا اظہار کیا کرتی تھی جو اس کی برواشت سے باہر تھی۔ لیکن اپنے والدین سے یہ رشتہ
منسوخ نہیں کر سکتی تھی۔ مقتول کی بہن نے میرے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے یہ اکتشاف بھی
کیا کہ مقتول سبئی کالی چھپکلی کا مذاق اڑاتا کرتا تھا۔ اُس نے دو تین بار یہ بھی کہا تھا کہ اس نے اس
لڑکے (دلہا) کو راتے میں روک کر کہا تھا کہ تم اتنی خوبصورت لڑکی کے قابل نہیں ہو۔ شادی سے
انکار کر دو ورنہ پچھتاؤ گے۔ کالی چھپکلی نے کچھ مرام اس کا جواب دیا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو مقتول کے
دانت توڑ دیتا لیکن دلہا میاں کالی چھپکلی ہی ثابت ہوا۔

”لیکن۔“ مقتول کی بہن نے کہا۔ ”خدا کا شکر ہے کہ میرا سبائی اس لڑکی سے
بچ گیا۔ سارے خاندان کی رسوائی ہوئی۔“

”کیا تمہیں یقین ہے کہ جمیلہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے؟“

”تو کیا ات بہت گھٹ کوئی اٹھا کر گئے کیا ہے؟“ اُس نے جواب دیا۔ ”اس نے جس طرح میرے بھائی پر ڈورے ڈالے تھے اسی طرح کسی اور کو بھی بھانٹ کر رکھا ہوگا۔“

”تم اس کی سیلی سٹیں۔“ میں نے پوچھا۔ ”کیا جیلہ اچھے چال چلن کی لڑکی نہیں سمجھتی؟“

”میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”اس کا بھاگ جانا ثابت کرتا ہے کہ وہ کیا سمجھتی۔ میں تو اسے شریفیتہ سمجھتی تھی۔“

میرے دل میں اس شک کا پیدا ہوا۔ نہ رتی تھا کہ جیلہ کو مقتول نے ہی بھگایا ہوگا اور وہ اسی کی پروا میں قتل ہوا۔ اس امکان پر پُچھنے پر غور کرنا تھا۔ مقتول کی بہن سے میں براہِ راست نہیں پوچھنا چاہتا تھا کہ بھاگے جانے والا اس کا بھائی ہی تو نہیں تھا۔ میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ جیلہ کا موضوع ٹھپ کر کے میں مقتول کے قتل پر آگیا۔ اس کے متعلق دو چار باتیں کہے ہیں نے لڑکی سے پوچھ لیا۔ ”گزشتہ رات تمہارا بھائی گھر تھا؟ وہ دیر سے تو نہیں آیا تھا؟“

”وہ اکثر ذرا دیر سے ہی گھر آیا کرتا تھا۔“ بہن نے جواب دیا۔ ”رات کو وہ کچھ جلدی آگیا تھا۔“

”نفت میں تھا؟“ میں نے پوچھا۔ ”غرض تھا؟ گھبرا یا ہوا تھا؟“

”میں نے غور نہیں کیا۔“ اُس نے جواب دیا۔

”اُس سے ایک رات پہلے بھی دیر سے آیا تھا؟“ میں نے پوچھا یہ دواہن کے ذرا کی رات تھی۔

”ہاں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”وہ جب آیا تو میں سو گئی تھی۔ صبح جب اُگی تو وہ ورزش کر کے آگیا تھا۔“

”وہ ہر روز کی طرح خوش باش تھا یا تم نے اس میں کوئی تبدیلی دیکھی تھی؟“

”اُس میں تبدیلی تو ابھی گئی تھی۔“ بہن نے جواب دیا۔ ”جیلہ کی شادی نے اُسے مغموم کر دیا تھا۔“

”تمہارے گھر میں یہ خبر کب اور کس طرح پہنچی تھی کہ جیلہ کمرہ عروسی سے غائب ہو گئی ہے؟“

”دوسری صبح جیلہ کی بہن گھرائی ہوئی آئی تھی۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”اُس نے جیلہ کے متعلق پوچھا اور پھر رازدار سی سے بتایا تھا کہ جیلہ رات سے لاپتہ ہے۔“

”تمہارا بھائی کہاں تھا؟“

”گھر نہیں تھا۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”میری ماں جیلہ کے سسرال چلی گئی۔“

مقتول کی دیر بعد بھائی آگیا۔ میں نے اُسے یہ خبر سنائی تو اس نے ذرا اکھڑے ہوئے لیجے ہیں کہا تھا کہ باں پتہ چل گیا ہے۔ میں نے اس کے ساتھ اسی کے متعلق باتیں شروع کر دیں۔ اُس نے کہا تھا۔ ”کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔“ میرا بھی یہی خیال تھا۔

پُر اسرار تانگہ مل گیا

مترے میرے لیے مہمہ ہی رہا۔ میرا خیال تھا کہ جیلہ مقتول کے ساتھ گئی ہوگی مگر بہن بتا رہی تھی کہ مقتول رات گھر سویا تھا۔ اگلی رات بھی گھر تھا۔ اگر جیلہ اس کے ساتھ گئی ہوتی تو مقتول بھی اس کے ساتھ ہوتا۔ اگر یہ جرم مقتول کا ہی تھا تو لڑکی کو قصبے میں ہی ہونا چاہیے تھا۔ اس نے جیلہ کو کہیں چھپا رکھا ہوگا اور موزوں وقت پر قصبے سے باہر جانے کا پلان بنایا ہوگا۔ اس شک کے پیشِ نظر کہ جیلہ کو مقتول لے گیا تھا، میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ جیلہ

نے، اسکا وہ معلوم ہو گیا جو کہ یہ مقتول کی کارستانی ہے۔ اس نے برادری کے دلیر قسم کے آدمیوں کو بتایا جو کہ ان آدمیوں نے مقتول کو قتل کر دیا جو کہ دہلا میں قتل ہوئے جرم کی جرات نہیں تھی۔ وہ خود کشتی کر سکتا تھا۔ اس کی بھی اس میں جرات نہیں تھی۔ اس کا باپ اور حلیہ کا باپ قتل کرنے والوں میں سے نہیں تھے۔ دہلا اور ڈولمن کے بھائی چھوٹے تھے۔ چچے، مائے، ماموں اور اُن کے بیٹے قابل غور تھے۔ اگر قاتل ان میں سے کوئی تھا تو اُس نے ڈولمن اور دہلا کے والدین سے اپنے ارادے کا ذکر نہیں کیا۔ اسی لیے وہ نمائے آگئے۔ اگر وہ بھی قتل کی سکیم میں شریک ہوتے تو پولیس کو لڑکی کے ذرا سے بلے خیر تھے۔

مہر دھال میں اندھیری سبھلوں میں اُلجھ گیا تھا۔ میں ذہن میں جرم کے ارتکاب کے جو بھی نقشہ بناتا تھا اس کی لکیر میں کسی نہ کسی مقام پر رک جاتا تھا اور آگے کپ اندھیر آجاتا تھا۔ میں نے حالات آپ کے سامنے دکھ دیئے ہیں۔ یہ ایسے حالات تھے کہ فوراً ایک شک پیدا ہوتا تھا کہ آگے جا کر ایک ایسا سوال سامنے آجاتا جس کا کوئی جواب نہیں ملتا تھا۔ میری کوشش تھی کہ شام تک آفتیش کھل کر دوں۔ یہ ممکن نہیں تھا۔ تجربے اور فہم و فراست کی بنا پر یہ امکان میرے ذہن پر نقش ہو گیا کہ ڈولمن کے فرار اور اس قتل کی واردات کا آپس میں کوئی تعلق ہے۔ تفتیش کرنے والے افسر کے لیے یہی مرحلہ مشکل ہوتا ہے۔ اگر وہ قرائن اور حالات میں ہٹا چلا جائے تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اپنی عقل کا استعمال اور خود اعتمادی بہت ضروری ہے۔ اگر یہ کوشش کی جائے کہ کوئی وعدہ معاف گواہ کی بات یا پریشانی کو شدت کی پکی میں ڈال کر کسی نہ کسی سے جھوٹا سا اقبال جرم کر لیا جائے تو حالات میں جاکر کیس چلے جاتا اور بے وقوفی ہوتی ہے۔ آج کل تو پولیس اس بے عزتی کی عادی ہو چکی ہے۔ عدالتیں بھی پروا نہیں کرتیں۔ انگریز کے زمانے میں مجسٹریٹ اور جج

شک پر ملزم کو تو بری کر دیتے تھے لیکن تفتیش کرنے والے افسر کو نہیں بخشتے تھے۔ فیصلے میں لکھ دیتے تھے کہ پولیس نے تفتیش میں اور مقدمے کی تیاری میں مجراہ غفلت برتی ہے۔ اس فیصلے پر متعلقہ تھانیدار کے خلاف حکمانہ کارروائی ہوتی تھی۔

میں اس بے عزتی سے بچنا چاہتا تھا۔ یہ بے عزتی صرف میری نہیں پولیس کے پورے محکمے کی توہین تھی۔۔۔۔۔ میں نے وعدہ معاف گواہ کی تو سوچی ہی نہیں مجھے اپنے اوپر بھروسہ تھا کہ مجرم پیشہ ورنہ ہوئے تو میں اقبال جرم کروں گا۔

میں نے اٹھارے میں جانے والے نو لڑکوں کو شامل تفتیش کر لیا۔ اُن کے نام پتے لکھ لیے۔ اُن کے دلوں سے پولیس کا ڈر دور کیا اور کہا کہ ان کے دوست کے قاتل کو پکڑنے کے لیے مجھے اُن کی مدد کی شدید ضرورت ہے۔ اُس وقت دن کے دواڑھائی بج رہے تھے۔ میں ان لوگوں کو ساتھ لیے صبح سے وہاں بیٹھا تھا۔ میں نے لڑکوں سے کہا کہ وہ گھروں کو چلے جائیں اور کھانا کھا کر تھانے آجائیں۔

میں نے ضروری کاغذی کارروائی کی۔ مقتول کے باپ کو لاش کی وصولی کے لیے تھانے چلنے کو کہا اور میں تھانے چلا گیا۔ لاش تقریباً میرے ساتھ ہی تھانے میں آئی۔ پوشٹارٹم ہو گیا تھا اور رگھوناتھ نے ایک کمال پر کیا تھا کہ تانگے والے کو اُس نے پکڑ لیا اور اُسے تھانے لے آیا تھا۔ پوشٹارٹم رپورٹ قابل فہم تھی۔ مقتول کے گٹے میں رستی ڈال کر اُسے مارا گیا تھا۔ جسم پر اور کوئی چوڑ نہیں تھی۔ موت کا جو وقت لکھا گیا تھا وہ صبح کی تاریکی کا وقت تھا۔

تانگے والا حملہ ہی بل گیا تھا۔ کانسٹیبلوں کو زیادہ وقت صرف نہیں کرنا پڑا۔ انہوں نے صرف چار تانگے چیک کیے۔ پانچویں تانگہ بان نے بتا دیا کہ اس محلے میں وہ گیا

متنا۔ اُسے تھانے لے آئے۔

میں پہنچا تو اُسے اندر لے گیا۔ میں نے اس پر کوئی سوال نہ کیا۔ اُس کو بولنے کا موقع دیا۔ میں اُس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ معلوم نہ ہوا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔ بعض ٹانگہ بان بھی جرم میں شریک ہو سکتے اور اُجرت لیتے تھے۔ یہ آدمی ایسا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ جوان سے آدمیوں نے اُسے کہا کہ مجھ سے ایک ہیار کو لینا اور ریلوے سٹیشن جانا ہے۔ پیسے طے کر کے وہ اُن کے ساتھ گیا اور ملکانوں کے محلے میں اسے سوار یوں نے روکا اور نیچے اتر کر کہا کہ تیسری سواری ابھی آتی ہے۔ ٹانگہ بان نے انہیں کہا کہ جا کر ہیار کو لے آئیں۔ اُسے کہتے تھے چلے گا کہ ٹانگہ بان لے گیا ہے۔ ایک نے کہا کہ ہیار آ رہا ہے۔ پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔ ٹانگہ بان نے پریشانی کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ اور زیادہ نہیں رُکے گا۔ دونوں نے اسے کہا کہ وہ انتظار کی جتنی اُجرت مانگے دیں گے۔ ایک گلی میں سے ایک عورت نکلی۔ جتنی نہیں تھی۔ چاندنی تھی۔ یہ پتہ چلتا تھا کہ وہ عورت تھیں۔ پہچاننا مشکل تھا۔ ایک جوان نے آہستہ سے کہا۔

”وہی معلوم ہوتی ہے۔“
ایک نے ذرا اونچی آواز سے کہا۔ ”اے او“۔ وہ عورت واپس گلی میں چلی گئی۔ اس پندرہ منٹ بعد گلی میں سے کوئی اور نکلا۔ قریب آیا تو اُس کے سر پر کبل تھا جو گھٹنوں تک گیا ہوا تھا۔ اُس کا چہرہ دیکھل میں چھپا ہوا تھا۔ ٹانگہ بان بھی نیچے کھڑا تھا۔ اُسے ٹانگے میں بیٹھنے کو کہا گیا۔ ایک آدمی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور دوسرا ہیار کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ ہیار مرد تھا یا عورت؟ اُس نے جواب دیا کہ یہی سوال وہ اپنے آپ سے پوچھتا رہا ہے۔ پہلے وہ اُسے مرد سمجھتا تھا لیکن ٹانگے میں سوار ہوتے وقت چوڑیوں کی چھٹک بڑی صاف سنائی دی تھی۔ اُس نے ٹانگے سے اترنے تک کوئی بات نہیں

کی۔ دوسرے دونوں بھی خاموش رہے۔ ٹانگہ بان نے اُسے عورت سمجھا۔ آگے جا کر اُسے یقین ہو گیا کہ یہ عورت ہے۔ ٹانگہ بان کو ریلوے سٹیشن چلنے کو کہا گیا۔ ریلوے سٹیشن پر ٹانگہ پہنچا تو گاڑی جو پہلے ہی آئی ہوئی تھی چل پڑی۔ اگلی سیٹ والا ٹانگے سے اُترا اور بائیس ہو کر بولا۔ ”اب کیا کریں؟“

پچھلی سیٹ والے نے کہا کہ لاریوں کے اڈے پر چلو۔ ٹانگے والے نے کہا کہ اس وقت تو کوئی لاری نہیں ملے گی۔ ایک نے کہا کہ بل جائے گی۔ رات کو ایک لاری جاتی ہے۔ ٹانگہ بان کو یہ پتہ نہیں چل سکا کہ وہ لوگ کہاں جا رہے تھے۔

وہ ٹانگہ لاریوں کے اڈے پر لے گیا۔ وہاں ادھر ادھر جا رہا پانچ لاریاں کھڑی تھیں۔ جانے کے لیے تیار کوئی بھی نہیں تھی۔ ٹانگہ اڈے والوں کے کمرے کے سامنے کھڑا تھا۔ وہاں روشنی بھی تھی۔ ایک آدمی باہر کھڑا تھا۔ وہ کملا دوس نمبر بیٹھا تھا۔ اُس سے ایک سواری نے پوچھا کہ کوئی لاری جا رہی ہے؟ کمالے نے پچھلی سیٹ کی طرف غور سے دیکھا اور کمرے میں پہلا گیا۔ اندر سے ایک اور آدمی نکلا۔ اُس نے ٹانگے کے پیچھے اکربات کی۔ اس نے کہا کہ ایک لاری ٹھوکی دیر تک جا رہی ہے۔ ٹانگہ چھوڑ دو۔ اندر آ جاؤ۔ سواریاں سٹیشن پر انتظار کر رہی ہیں۔ ٹانگے کی اگلی سیٹ پر جو بیٹھا تھا اُس نے دوسری سواری سے پیسے لے کر ٹانگہ بان کو دیئے اور رخصت کر دیا۔ وہ ٹانگہ لے آیا۔

میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ جو وہ آدمی اُسے محلے میں لے گئے تھے اُن میں سے وہ اُسے پہچان سکتا ہے جو اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ لیکن اس نے یہ بھی کہا کہ اس نے اُسے مدد دینی میں دیکھا تھا۔ اب شاید پہچاننے میں مشکل پیش آئے۔ بہر حال اس نے کہا کہ اُسے سامنے لا تو بتا سکوں گا۔ ٹانگہ بان کو پتہ چل چکا تھا کہ ایک جوان آدمی قتل ہو گیا ہے۔ میں نے اس سے اپنے

مطلب کی بہت سی باتیں پوچھیں اور اسے تنہا نے میں موجود رہنے کو کہا۔ پھر بھی کچھ ٹانگہ بان
نے میری شکل آسان کر دی۔

دوست اور دشمن

ٹانگہ بان سب مجھ مجبوروں کے قویہ بن گیا۔ مجھے ایسے محسوس ہونے لگا جیسے میں نے خود
کی منہ زکال لی ہے۔ میں آپ کو لاریوں کے اڈے کے متعلق کچھ بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ آج کل
لاریوں کے اڈے اُس دور کے اڈوں سے مختلف ہو گئے ہیں۔ سواریوں اور بسوں کا اناجھوم
ہوتا ہے کہ راستہ نہیں ملتا۔ یہاں صرف جیب کترے اپنے کترے دکھاتے ہیں میرے وقتوں
میں لاریوں کے اڈے رات کے وقت بد معاشی کے اڈے بن جایا کرتے تھے۔ ستورہ می لاریاں
ہوتی تھیں جو رات کو نہیں چلتی تھیں۔ اڈے کے کمرے یا کمرہ چرسوں اور جوار لاریوں کا اڈہ بن جاتا
تھا۔ قصبوں میں ایسے دو اڈے ہوتے تھے۔ ایک لاریوں کا اڈہ اور دوسرا ٹمکیر۔ یہ قبرستان میں
ایک کوٹھڑی ہوتی تھی جس میں قبرستان کی دیکھ بھال کے لیے ایک ٹانگہ سارہتا تھا۔ اس کے
پاس تین چار اسی کی قسم کے ٹنگ مستقل یا عارضی طور پر رہتے تھے۔ یہ لوگ چرس اور بھنگ
پیتے اور ان جوار لاریوں کا پہرہ دیا کرتے جو ان کی کوٹھڑی میں جوا کھلا کرتے تھے۔ لاریوں کا اڈہ تو
دس نمبر سے بد معاشوں اور غنڈوں کا اڈہ ہوتا تھا۔ یہ گروہ پولیس کے لیے دوسرے بھی ہوتا تھا اور
یہ لوگ پولیس کے کام بھی آتے تھے۔

میں اس اڈے سے واقف تھا۔ کماے بد معاش کو بھی جانتا تھا۔ میرے ہی قصبے
کا رہنے والا تھا۔ ایک کانٹیل کو بھیجا کہ اڈے کے دونوں ٹیکیداروں کو بلا لائے۔ اڈہ دونوں
تھا۔ اتنے میں اکھاڑے والے لڑکے آ گئے۔ میں نے انہیں باری باری بلا کر پوچھا کہ مقتول کا

سب سے زیادہ گمراہ دوست کون تھا۔ میں اس لائن پر کام کر رہا تھا کہ لڑکی کو بھگالے جانے والا
مقتول تھا۔ یہ پختہ شک تھا، یقین نہیں تھا۔ پہلے چار لڑکوں نے ایک ہی لڑکے کا نام لیا۔
میں نے دوسروں سے نہیں پوچھا۔ میں نے اس لڑکے کو دیکھ لیا۔ اُس کا نام ارشاد یاد شاد
بتایا گیا تھا۔ ذہن سے نکل گیا ہے۔ آپ اسے ارشاد کہہ لیں۔ وہ مقتول کی عمر اور اُسی کے
جسم کا نوجوان تھا۔

میں نے ان سب کو برآمد سے میں بلایا اور لائن میں کھڑا کر کے ٹانگہ بان سے کہا کہ
وہ دیکھئے کہ ان میں وہ لڑکا ہے جو اُس کے ٹانگے میں اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا، مجھے خدشہ تھا کہ
وہ نہیں پہچان سکتے گا۔ مجھے یہ بھی توقع تھی کہ اگر میرا مطلوب آدمی ان میں ہوا تو وہ ٹانگے والے
کو پہچانا ہو گا۔ اس صورت میں اس کے چہرے کے تاثرات یقیناً تبدیل ہوں گے۔

ٹانگے والے نے ہر ایک لڑکے کو دیکھنا شروع کر دیا اور میں بھی ہر لڑکے کے چہرے کو
گہری نظروں سے دیکھتا رہا۔ میں نے زیادہ تر ارشاد کا چہرہ دیکھا۔ ٹانگہ بان اُس کے سامنے رک
گیا اور اُسے دیکھتا رہا۔ میں نے ارشاد کے چہرے پر بڑی صاف تبدیلی دیکھی۔ ٹانگہ بان اگلے
لڑکے کو دیکھنے لگا۔ اُس نے ایک بار پھر ارشاد کو دیکھا۔ ٹانگہ بان پھر اگلے چلا گیا۔

میں نے پیچھے جا کر ارشاد کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اُسے لائن سے باہر نکال کر دہلی سی
آواز میں کہا۔ ”میرے کمرے میں چل کر بیٹھو۔“ اُس کے چہرے پر جو رنگ اُڑا اور جو رنگ
آیا اُس نے مجھے صاف بتا دیا کہ احمد یار خان ایسی تمہارا آدمی ہے۔ دوسرے کسی بھی لڑکے
کے چہرے پر کوئی مشکوک تاثر نہیں تھا۔ میں نے ارشاد کو اپنے دفتر میں بھیج کر لڑکوں سے
کہا۔ ”شاہاش میرے بچو! جہاں جی چاہتا ہے بیٹھ لیکن یہیں رہنا۔“

میں نے ارشاد کو اس خیال سے پکڑا تھا کہ نوجوان دوست جوانی کے جوش اور محبت

کے جذبات سے مغلوب ہو کر ایک دوسرے کی مدد مانگ سے بے پروا ہو کر کیا کرتے ہیں۔ اگر انوکھا کجزم مقبول ہی تھا تو اُس کے کسی گھر سے دوست نے اُس کی مدد کی ہوگی۔ وہ ارشاد ہی ہو سکتا تھا۔ اُس کے ساتھیوں نے بتایا: ”اگر ارشاد اس کا گھر دوست تھا۔“

”تاہم باز نہ لڑکوں کے وہاں سے بٹنے کے بعد مجھے کہا۔“ یہی معلوم ہوتا ہے جسے آپ نے پکڑا ہے۔

میں نے شناخت کا یہ جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ غیر قانونی تھا۔ ملزم کی شناخت کا طریقہ اور ہوتا ہے۔ اسے دس بارہ غیر متعلق آدمیوں میں کھڑا کیا جاتا ہے۔ سب کے سروں پر گپٹیاں یا رومال ڈال دیئے جاتے ہیں۔ اسے شناخت پر پڑھتے ہیں۔ اور یہ شناخت ایک مجسٹریٹ کی موجودگی میں ہوتی ہے۔ یہ شناخت کو مصدقہ صرف اُس صورت میں سمجھا جاتا ہے کہ شناخت کرنے والا وثوق سے کہے کہ یہ ہے وہ آدمی۔ پھر مجسٹریٹ اس کی تصدیق کرتا ہے۔ میں اس پکد میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں مقدمے میں اس شناخت کا ذکر ہی نہیں کروں گا۔

میں نے اندر جاکر ارشاد کا چہرہ دیکھا تو اُس کے چہرے سے جوانی کا جوش پھلا پڑ چکا تھا۔ میں نے اُسے کوئی تہیہ کی کچھ نہیں دیا۔ اُس پر اپنی تمنا ندری کا رعب نہیں جمایا۔ بڑے تحمل سے پوچھا۔ ”ارشاد بھائی! وہاں کہاں ہے؟“

اُس کا منہ ٹھنک گیا۔ پھر وہ ہنس پڑا مگر یہ ہنسی نہیں تھی۔ اُس نے شاید خود ہی محسوس کر لیا تھا کہ وہ ہنس نہیں سکا۔ وہ گھبرایا اور آہستہ سے بولا۔ ”وہاں ہر کونسی دھن؟“ ”دیکھو ارشاد۔“ میں نے اُسے بڑے اچھے لہجے میں کہا۔ ”میں نے تمہیں بھائی کہا ہے۔ میں بھائی کا حق ادا کروں گا۔ بشرط یہ ہے کہ تم بڑے بھائی کا حق ادا کرو۔ تاہم اُسے نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ اچھی دوا اور آدمی نہیں پہچاننے کے لیے آ رہے ہیں۔ مجھے

چاہیے کہ تمہیں فوراً حالات میں بند کروں، لیکن تمہاری عمر پرتس آتا ہے۔ مجھے کچھ دوا اور مجھے سے کچھ لو۔ اپنی زندگی تباہ نہ کرو۔۔۔۔۔ جملیہ کو تم نے جارہے تھے یا تمہارا دوست؟“ وہ پیشہ ورم جرم تو تھا نہیں۔ احمق تو نہ تھا جسے ہندوؤں کی زبان میں موروکھ بابک کہتے ہیں۔ اُس نے میری طرف دیکھا تو اُس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ میں نے چند اور باتیں کہہ کر اُس کا رہا سہا دم بھی توڑ دیا اور اُس کا ہمد و بھی بن گیا۔ اُس نے ایک نہایت اطمینان سوال کیا۔ کہنے لگا۔ ”آپ میرے گھروالوں کو تو نہیں بتائیں گے؟“

اُسے معلوم نہیں تھا کہ اب تو ساری دُنیا اُسے گئی۔ میں نے اُسے ہم دوسروں کی طرح کہا۔ ”مذہب! مجھے تم ایسا کچھ سمجھتے ہو کہ دوسروں کو بتانا پھروں گا کہ تم نے مجھے کیا بتایا ہے۔“ ”لڑکی کو آصف (مقتول) نے جارہا تھا۔“ اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ”میں تو ویسے ہی ساتھ چلا گیا تھا۔“

”ارشاد بھائی!“ میں نے شفقت کے لہجے میں کہا۔ ”آصف قتل ہو چکا ہے۔ تم جو جھوٹ بولنا چاہو بول سکتے ہو۔ آصف اب یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ جھوٹ ہے، لیکن میں نہیں فائدے کی ایک بات بتا ہوں۔ تمنا نے اور جبل خانے کا چکر بہت بڑا ہوتا ہے۔ تم جانتے ہو۔ تم جھوٹ بول کر اس میں سے نہیں نکل سکو گے بلکہ اور زیادہ پھنسو گے۔ مجھے ہر بات سچ سچ بتا دو۔ پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ جھوٹ کہاں اور کس قسم کا بولنا ہے۔ تم نے میرا کچھ نہیں بگاڑا۔ مجھ سے مدد اور ہمدردی کی توقع رکھو۔ تم کا گویو بچتے ہو۔ میں تمہاری مدد کروں گا۔“

نفرت اور محبت — معجزہ نہ ہوا

اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ تو اپنی احمق ذات میں غرق ہو چلا تھا۔ میں نے اُسے جذباتی ہمارا دیا۔ اُس نے واردات سنا دی۔ اس کا اختصار یہ ہے کہ مقتول اور جلیلہ کی محبت تھی جس طرح مقتول کی بہن نے بیان کی تھی۔ ارشاد مقتول کا ہمارا دوست تھا۔ اُسے بتاتا رہتا تھا کہ جلیلہ کے ساتھ اُس کی شادی نہیں ہو سکتی اور وہ خالہ کی بیٹی کو پسند نہیں کرتا۔ ارشاد کے بیان کے مطابق مقتول اور جلیلہ کا باہر کہیں صرف ایک ملاقات ہوئی تھی۔ باقی ملاقاتیں مقتول کے گھر میں اُس کی بہن کے موجودگی میں ہوتی تھیں۔ اُن کے زبانی پیغام قبول نام کی صورت لاتی، لے جاتی تھی۔ جلیلہ کی نگینی کالی چھپکلی سے ہو گئی۔ ارشاد نے باتوں کی روانی میں اُس کا نام نہیں لیا، کالی چھپکلی ہی کہا تھا۔ معلوم ہوا کہ سب سے پہلے جلیلہ نے اُسے کالی چھپکلی کہا تھا۔ اُس نے مقتول کو بتایا۔ مقتول نے ارشاد کو بتایا، اور اس بے پناہ سے کا یہی نام دھروا گیا۔

پھر شادی کا دن مقرر ہو گیا۔ مقتول انہی نوجوانوں میں سے تھا جن کی میں تشریح کر چکا ہوں۔ اپنے آپ کو رستم زماں سمجھتے ہیں اور جوانی انہیں اندھا کر دیتی ہے۔ قبول کوئی مغرت مقتول نے اپنی یکسک جلیلہ تک پہنچانی کہ کہیں جھاگ جلیں۔ جلیلہ اپنے ہونے والے دلہا سے بعد نفرت کرتی تھی۔ اُس نے یکسک منظور کر لی لیکن نگینی کے بعد لڑکیوں کو پوری طرح قید کر لیا ماتا ہے اور جب شادی کا دن مقرر ہو جاتا ہے تو لڑکی کو ایک منٹ کے لیے بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ کوشش کے باوجود جلیلہ کو گھر سے نکلنے کا موقع نہ ملا۔

مقتول کا ایک دوست امرتسر میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں کلرک تھا۔ مقتول امرتسر جا کر

اُسے لا اور بتایا کہ وہ ایک لڑکی کو لا رہا ہے۔ اُس دوست نے رہنے کا انتظام کر دیا اور ہر طرح کی مدد کا وعدہ بھی کیا۔ مقتول نے سوچا تھا کہ جلیلہ کو وہاں لے جا کر شادی کرے گا اور وہیں کوئی ذریعہ معاش بھی مل جائے گا۔ قبول کو نہ مانگا انعام دینے کا وعدہ تھا۔ مقتول اُسے پیسے دیتا رہتا تھا۔

پھر شادی ہو گئی۔ اس موقع پر قبول نے یہ یکسک بنائی کہ وہ سڑال میں ایسی صورت پیدا کر دے گی کہ لڑکی دلہا کی پہلی ملاقات سے پہلے ہی جھاگ آئے گی۔ حالات نے اُن کی یہ درد کی کہ کمرہ عروسی ڈیوڑھی کے ساتھ تھا۔ ڈیوڑھی کا دروازہ لگی میں کھٹا تھا جرات کو اندھیری ہوتی تھی۔ قبول چونکہ گھر کی نوکرانی، ہر گھر کی فردا اور ہر گھر کی راز داں تھی، اُس نے کمرہ عروسی کے متعلق قبل از وقت معلوم کر لیا تھا۔ اُس نے یکسک نہایت اچھی سوچی مگر اُس نے یہ نہ سوچا کہ یکسک پر عمل کرنے والے مورکھ بالکل ہیں۔ ان مجرموں نے یہ بھی نہ سوچا کہ یکسک عین درمیان میں کوئی اور صورت بھی اختیار کر سکتی ہے۔ انہوں نے اس پر بھی دھیان نہ دیا کہ جرم مکمل کر لینے سے مسئلہ حل نہیں ہو جاتا۔ مسئلہ تو وہیں سے شروع ہوتا ہے جہاں جرم ختم ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ انہوں نے خوش فہمیوں کی بنیادوں پر ایک سنگین جرم کی یکسک بنائی اور خطوں کی پروا نہ کی۔

جلیلہ نے بھی اس یکسک کی منظوری دے دی۔ وہ عقل سے نہیں اپنے دلہا کے خلاف نفرت اور مقتول کی محبت کے زیر اثر سوچ رہی تھی۔ کمرہ عروسی کی چٹخنی چڑھا دینا، شلوار اتار کر پلنگ کی چادر باندھ لینا اور کیبل اوٹھ لینا، اور یہ ساری ترکیبیں قبول نے سوچی تھیں۔ مقتول نے ارشاد کو یہ یکسک بتائی اور دونوں نے فیصلہ کیا کہ وہ رات کی گاڑی سے پہلے تاک لے آئیں گے۔ گاڑی راستے میں بدلتی تھی۔ وہاں سے امرتسر کی گاڑی ملتی تھی۔ مقتول رات ہی جلیلہ کو قصبے سے نکال لے جانا چاہتا تھا۔ مقتول نے گھر سے پیسے نہیں چرائے۔ دولہن زیورات سمیت آ رہی

مقتی۔ زیورات اہم تر فروخت کرنے تھے۔

قبولہ جیلہ کی ڈولی کے ساتھ ہی آگئی۔ شام کو اُس نے مقتول کو بتا دیا کہ نو بجے کے بعد تانگہ لے آئے۔ ارشاد کو یہ معلوم نہیں تھا کہ قبولہ نے یہ اہم انتظام کس طرح کیا۔ وہ دونوں تانگہ لے آئے۔ قبولہ نے باہر جکر دیکھا کہ تانگہ کھڑا ہے۔ مقتول نے اُسے دیکھ کر کہا۔ ”لے آؤ۔“ اس کے جانے کے بعد لڑکی اسی جھیس میں سبکی جس طرح قبولہ نے بتایا تھا کہ آئے گی۔ ریلوے سٹیشن گئے تو گاڑی چل پڑی تھی۔ مقتول نے کہا کہ لاریوں کے اڈے پر پہلو تانگے والے نے کہا جی کہ اس وقت کوئی لاری نہیں جاتی مگر مقتول کو یقین تھا کہ ایک لاری جاتی ہے۔ اس کے کہنے پر وہ لاریوں کے اڈے پر پہنچے۔

اڈے سے ایک اور ڈرامہ شروع ہو گیا۔ وہاں انہیں کمالا بے معاش مل گیا۔ کمالا بڑی ظالم نسل کا بے معاش تھا۔ اُس نے غالباً یہ دیکھ لیا تھا کہ ان لوگوں کے ساتھ ایک لڑکی ہے۔ اُس کی اُستادگاریوں نے یہ سب سبب لیا۔ چونکہ کمالا کے معائنہ کر بیٹھے۔ وہ ان دونوں کو جانتا تھا اور دونوں اُسے جانتے تھے۔ اُس نے انہیں کہا کہ ایک لاری جائے گی۔ وہ کمرے میں چلا گیا۔ تانگے کو چھٹی دے دی گئی۔ کمالا باہر نکلا۔ انہیں یہ کہہ کر کہ کمرے میں لے گیا کہ ذرا سی دیر بیٹھو، لاری آ جائے گی۔ وہ اندر چلے گئے۔ کمرے میں لائٹیں جل رہی تھیں۔ وہاں ایک اور آدمی بیٹھا تھا جسے مقتول اور ارشاد نہیں جانتے تھے۔ اُس نے انہیں چارپائی پر بٹھایا اور پوچھا۔ ”یہ لڑکی کون ہے؟“

”یہ لڑکی نہیں لڑکا ہے۔“ مقتول نے کہا۔ ”اُسے بھارتیہ اس لیے کبل لپیٹ رکھا

تھا۔“

ان تینوں کی حماقت، دیکھو کہ کبل اور چادر میں تو وہ لڑکا گتھی تھی لیکن پاؤں تو پچھے

ہوئے نہیں تھے۔ جمیلہ نے زمانہ سینڈل پہن رکھے تھے جن میں سے اُس کے گورے اور زانہ پاؤں نظر آ رہے تھے۔

ارشاد نے اپنے بیان میں بتایا کہ اس آدمی نے اپنا کما لے سے ذرا غت سے کہا۔ یار تم کسے کیوں ہو؟ ذرا ٹائم دیکھو۔ اٹھارہ سواریاں سٹیشن پر انتظار کر رہی ہیں۔ تین یہ آگئے ہیں۔ چوتھے نہیں ہوں۔ گاڑی نکالو اور چلو۔“

کمالا باہر کو دوڑا۔ اُس آدمی نے انہیں کہا کہ تمہاری قیمت ابھی تھی کہ لاری ابھی نکلی نہیں تھی۔ اس بد بخت نے مجھے بھی دیر کرادی۔ اس اجنبی نے ایسی باتیں کیں کہ یہ لڑکے اور لڑکی اسے انتظار میں بیٹھا ہوا کوئی مسافر سمجھنے لگے۔ ان بے چاروں کو کون بتاتا کہ یہ اجنبی اُس دنیا کا مسافر ہے جہاں پولیس بھی جا کر راستہ متحول جاتی ہے۔ کمالا ڈرائیور بھی تھا۔ ڈرائیور میں ہی وہ پکا بے معاش بنا اور پولیس کے رجسٹر میں آیا تھا۔ متوڑی ہی دیر بعد وہ چابی لے کر گیا اور بولا۔ ”اُٹھو جی!“

سب اُٹھے اور باہر نکل گئے۔ کمالا انہیں ایک لاری کی طرف لے گیا۔ وہ خود ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ مقتول اور جمیلہ کو پیچھے والی سیٹوں پر بٹھایا گیا۔ کمالے نے لاری چلائی مگر ریلوے سٹیشن کی بجائے اُس کا رخ کسی اور طرف تھا۔ ارشاد کو ساتھ نہیں جانا تھا۔ وہ اڈے پر رہ گیا اور لاری اُس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ارشاد غوش تھا کہ اُس نے دوست کی مدد کامیابی سے کی ہے۔ وہ اپنے گھر آگیا۔

ریت کے رستم

دوسرے دن اُسے دوستوں نے یہ خبر سنائی کہ کل جس لڑکی کی شادی ہوئی تھی وہ رات

کو لاپتہ ہو گئی ہے۔ وہ صبح دیر سے جاگا تھا، اس لیے کھاڑے میں ورزش کے لیے نرگیا۔ چانک آتے وقت کو قتل مل گیا۔ وہ اُس کے گھر کی طرف آ رہا تھا۔ ارشاد اُسے دیکھ کر بہت ہی حیران ہوا۔ اُس وقت مقتول کو جھیل کے ساتھ امر ترسہ ہونا چاہیے۔ قتل کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ اُس نے ارشاد کو لاری پہننے کے بعد کاوتھ نہ لیا۔ ارشاد پر کشتہ طاری ہو گیا۔

مقتول نے اُسے سنایا کہ لاری شیش کی خرابی کے بجائے دریا کی طرف چلی گئی مقتول کمال سے پوچھنے ہی نکلا تھا کہ کہاں جا رہے ہو اور سوچا کہ کہاں سے لوگے کہ لاری رگ گئی۔ لاری کے اندر چھوڑا سا کیمبل بلب بلب مارتا ہوا آدمی تھا اُس نے اس بار چار فوٹ نکال لیا۔ کمال نے بھی چار فوٹ نکال لیا۔ دونوں اُن کے سر پر آن کھڑے ہوئے۔ اجنبی نے جھیل کے سر سے کبل ہٹا دیا۔ دونوں چار فوٹ مقتول کے سامنے تھے۔ وہ بیٹھا ہوا تھا۔

کمال نے کہا: ”وہ کی چھپا کر کہاں سے جا رہے ہو؟ تمہاری کیا گنتی ہے؟ جھوٹ بولو، ہم تمہیں یہ جانتا ہے۔“

مقتول کے جوش اڑ گئے۔ جوانی کا جوش اور جسم کی طاقت دو چار فوٹوں کے سامنے ختم ہو گئی۔ یہ ورہیل جبر کا اثر تھا جس نے مقتول جیسے تنومند جوان کو ریت بنا دیا۔ کمال نے اسے کلمت تم عزت دار باب کے بیٹھ بیٹھ کر آؤ اور گرگڑ چلے جاؤ۔ اگر تین پانچ کروگے تو ہم تمہیں قتل بھی کر سکتے ہیں۔ لاش دریا میں پھینک دیں گے اور چاہیں تو پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ چلو۔ نیچے اُترو۔ سوچو مت۔“

دوسرے آدمی نے بھی اُسے دھکی دیا اور اُسٹاکر لاری سے اتار دیا۔ جھیل اٹھنے لگی تو کمال نے اُسے بازوؤں میں جکڑ کر اٹھنے نہ دیا۔ جھیل نے شور مچا دیا لیکن اس کا منہ بند کر دیا گیا۔ مقتول کچھ بھی نہ سوچ سکا۔ لاری چل پڑی اور دریا پار کر گئی۔ وہ دونوں جھیل کو لے گئے۔ مقتول واپس آ گیا۔ اُس نے اگلے دن ارشاد کو بتایا۔ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ کمال کے منہ آنے سے بھی گھبراتے تھے۔ وہ

خود مجرم تھے۔ تھانے بھی نہیں جاسکتے تھے اور کسی کو بتا بھی نہیں سکتے تھے۔ مقتول نے اس ڈر کا بھی اظہار کیا کہ کمال انہیں بلیک میل کر سکتا ہے اس لیے چُپ ہی بھلی تھی۔

ارشاد اعانت جرم کا مجرم تھا۔ میں اُسے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ ابھی اُس سے مقتول کے قتل کے متعلق پوچھنا تھا۔ مجھے شک بھی ہو کہ ارشاد نے جھوٹا بیان دیا ہے۔ بڑکی پر اُس نے قبضہ کر لیا ہے اور مقتول کو قتل کر دیا ہے، لیکن کمال بد معاش کا ذکر اور تانگہ بان کا بیان اس شک کے خلاف تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ مقتول کے قتل کے متعلق اُس کی کیا رائے ہے۔ اُس نے کالی چھپکی کا نام لے کر میری ہنسی نکال دی۔

”اگر اُس نے اپنے ہاتھوں قتل نہیں کیا تو کہہ دیا ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”اُس کے چہرہ زوہجائی ہیں جو اتنے دلیر تو نہیں لیکن غیرت دلیر بنا دیتی ہے۔“

میرے پوچھنے پر ارشاد نے بتایا کہ کالی چھپکی زہری لڑکا ہے۔ وہ بے شک چُپ رہتا ہے لیکن اُس کے اندر دم موجود ہے۔ اُسے ضرور شک ہو گا کہ اُس کی دلہن مقتول لے گیا ہے۔

”مقتول نے انہوں سے پہلے یا بعد دُہا دہا کالی چھپکی کے ساتھ کوئی طنز یہ یا ایسی ویسی بات کی تھی؟“ میں نے اس خیال سے ارشاد سے یہ سوال پوچھا کہ مقتول جیسے اوچھے رتم بڑکیں مارنے کے عادی ہوتے ہیں۔ میرا خیال درست نکلا۔ ارشاد نے بتایا کہ مقتول نے شادی سے پہلے کالی چھپکی کو طعنہ دیتے تھے۔ اور انہوں کے اگلے روز پھلے پر کالی چھپکی شاید تھانے سے واپس آ رہا تھا تو اُسے مقتول رات میں مل گیا تھا۔ ارشاد بھی ساتھ تھا۔ مقتول ارشاد سے ہٹ کر کالی چھپکی کو انگ لے گیا اور اُسے کچھ کہہ کر ارشاد کے پاس آ گیا تھا۔ کالی چھپکی وہیں کھڑا مقتول کو دیکھتا رہا تھا۔ ارشاد نے پوچھا تو مقتول نے اُسے بتایا کہ اُس نے دُہا میاں سے کہا ہے کہ اب اپنے جیسی کوئی دلہن ڈھونڈ لو۔

”مقتول یا تم دونوں کمالے سے لے تھے؟“ میں نے پوچھا۔ ”اگر لے تھے تو کیا بات ہوئی تھی؟“

میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ مقتول... کمالے کو جاکر دھکی دی ہوگی اور کمالے نے خفیہ طریقے سے اسے قتل کر دیا ہوگا، لیکن ارشاد نے یہ ناکرستہ حل کر دیا کہ مقتول نے ارشاد کے مشورے کے باوجود کمالے کے پاس جانے سے گریز کیا تھا۔ کمالا اصل بدعاش اور استاد تھا اور مقتول ریت کا رستم تھا۔ میں نے اس امکان پر غور کیا کہ کالی چنگا قتل کر یا کر سکتا ہے، میرا دل مان نہیں رہا تھا۔ میں نے ارشاد سے کہا اور باتیں پوچھیں، پھر اس کے احتجاج اور منت سماجت کے باوجود اسے حالات میں بند کر دیا۔ لاریوں کے اڈے کے دونوں ٹھیکیدار آگئے تھے۔ ایک رکھ رہا تھا دوسرا سسٹان۔ انہیں اندر بلا کر پوچھا کہ اڈے پر رات کمالے کے ساتھ کون تھا۔ انہوں نے یہ کہہ کر علی کا انکار کیا کہ چونکہ شام کے بعد کوئی لاری نہیں چلتی اس لیے وہ شام کو ہی گھروں کو چھٹا گئے تھے۔ میں نے پوچھا کہ کیا انہیں معلوم ہے کہ رات اڈے پر اغوا کی ایک واردات ہوئی ہے۔ اور ایک لاری ایک لڑکی کو لے کر گئی تھی، وہ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بیک وقت کہا کہ انہیں معلوم نہیں۔

میں اُن پر زیادہ جرح نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ میرے پاس اب قابل اعتماد شہادت آگئی تھی۔ میں نے ان دونوں کو باہر بٹھا دیا اور اپنے اے۔ ایس۔ آئی رگھوناتھ سے کہا کہ لاریوں کے اڈے پر جاکر تمام ڈرائیوروں کو لاریوں میں بیٹھا دیا جائے۔ اگر کوئی لاری باہر گئی ہو تو وہ ایک کانسٹیبل کو وہاں چھوڑ آؤ۔ جو بھی لاری آئے کانسٹیبل اسے تھانے لے آئے اور کسی لاری میں سواریاں بیٹھی ہوئی ہوں تو لاری خالی کر کے لے آؤ۔

اُسے تین کانسٹیبلوں کے ساتھ بھیج کر ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ جو لوگو تھانے لے آئے

اور کمالے بدعاش کو ڈھونڈنے کا انتظام کرے۔ کمالا چونکہ رجسٹرڈ بدعاش تھا اس لیے اُس پر پابندی عائد تھی کہ قصبے سے باہر جانے سے پہلے تھانے میں اطلاع درج کرایا کرے کہ کہاں اور کیوں جا رہا ہے۔ چونکہ راکے لیے حکم تھا کہ وہ ہر رات دیکھا کرے کہ کمالا گھر میں موجود ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ چونکہ راکے کو تاہی کی یا کمالے سے پیسے لیے ہیں۔

انہیں بھیج کر میں قتل کی واردات کی کڑیاں ملانے لگا۔ مگر آئے ہوئے تھے۔ اُن سے رپورٹیں لیں۔ ان میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ میں جو کڑیاں ملار یا سنا وہ بٹنے بٹنے اُلجھ جاتی تھیں۔ نظر دہاکے چچا اور مہائیوں پر لگتی تھی۔ دو مجرمان دونوں کو اور اُن کے گھرانوں کو جانتے تھے۔ وہ میری تائید نہیں کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ اس خاندان کے آدمی قتل ہو سکتے ہیں قتل نہیں کر سکتے۔ اگر وہ قاتل نہیں تو کمالا ہوگا۔

میں نے تھانے کے باہر دیکھا۔ لوگوں کا ہجوم کھڑا تھا۔ اُس دور میں جرائم کا آج والا عالم نہیں تھا۔ اُس وقت کسی گھر میں چوری ہوتی یا قتل لگتی تھی تو سارا شہر اُس گھر کو دیکھنے کے لیے اکٹھا ہو جاتا اور پولیس رات سے پہلے پہلے مجرموں کو پکڑنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتی تھی۔ اُس دور میں پولیس اور جرائم پیشہ افراد کی آپس میں دشمنی ہوتی تھی۔ آج کی طرح دوستی نہیں تھی۔ اس قصبے میں ایک دہان لاپتہ ہوئی اور ایک نوجوان قتل ہو گیا اور ایسے گناہ تھا جیسے قصبے میں ہڑتال ہو گئی ہے۔ جسے دیکھو اُس کا رخ تھانے کی طرف تھا۔ جن لڑکوں کو میں نے تھانے میں بٹھا رکھا تھا اُن کے باپ تھانے کے احاطے کے اندر پریشان کھڑے تھے۔ مجھے پتہ چلا تو میں نے جا کر انہیں تسلی دی اور بتایا کہ ان سب کو گواہی کے لیے بلایا ہے کسی کو گرفتار نہیں کیا گیا نہ کیا جائے گا۔ ارشاد کا باپ بھی موجود تھا۔ اُسے میں نے کچھ نہیں بتایا۔

دیو اما چھی دِلہن لے اڑا

رنگھونا تہ تین لاریاں لے آیا۔ چوتھی لاری بھی ہوئی تھی۔ میں نے تینوں ڈرائیوروں کو اکٹھا کر کے کہا: ”اگر جھوٹ بولو گے تو یہ لاریاں ہمیں دیں گی۔۔۔۔۔۔ پرسوں تیسوں رات کمال کس کی لاری لے گیا تھا؟“ ایک ڈرائیور نے فوراً کہا: ”میری“

”کہاں لے گیا تھا؟“

”یہ معلوم نہیں۔“ ڈرائیور نے جواب دیا۔ ”آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ کمال ڈرائیور بھی ہے بدعاش بھی۔ میں دو آدمیوں کے ساتھ باہر چار پانی پر بیٹھا تھا کمال دوڑتا آیا۔ اُس نے مجھ سے لاری کی چابی مانگی۔ میں نے اُسے کہا، کمالے یاد دوزن جانا اور کہیں نہ پھنسا دینا۔ اُس نے کہا، دھوکہ فریب تمہارے ساتھ ہی کرنا ہے؟۔۔۔ میں نے ایک تانگے سے تین آدمی اترتے دیکھے تھے۔ کمال میری لاری آگے لے گیا۔ تینوں کو اُس نے لاری میں بٹھایا اور لاری لے گیا۔“

”پوچھتا آدمی کون تھا؟“

”وہ دیو اما چھی تھا۔“ ڈرائیور نے جواب دیا۔

”دیو اما چھی؟۔۔۔ میں نے سخت حیرت سے پوچھا۔“ وہ کیا کرنے آیا تھا؟“

”کبھی کبھی کمالے کے پاس آتا ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”اُس رات شام کے

بہت بعد آیا تھا۔“

دیو اما چھی کے نام نے مجھے چونکا دیا تھا۔ یہ دوسرے تھانے کی حدود کا ایک رہزن اور ڈکیت تھا۔ اُس کا شمار اُس زمانے کے نامی گرامی ڈکوتوں میں نہیں ہوتا تھا۔ وہ کوئی خوفناک

جرائم پیشہ نہیں تھا لیکن تھا جرائم پیشہ۔ تین چار بار کاسزا یافتہ تھا۔ برودہ فروشی بھی کرتا تھا لیکن اعلیٰ قسم کی نمیں کسی غریب اور جوان عورت کو درغلز کر کہیں بیچ ڈالتا تھا۔ پیشہ درجہک منگوں کی کوئی جوان اور اچھی صورت والی لڑکی نظر آئے تو اُسے خرید کر یا لڑا کر عصمت فروشوں کے ہاتھ بیچتا تھا۔ رہزنی اور ڈکیتی کی وارداتیں بھی کرتا تھا۔ چاقو چلانے کا ماہر تھا۔ مختصر یہ کہ استاد آدمی تھا۔ اُس کی تمام وارداتیں اُس کے اپنے تھانے کی تھیں۔ میرا علاقہ اس کے پڑوس میں تھا لیکن اس سے مجھ پر ہوتا تھا۔ اُس کا نام سُن کر میں چونکا۔ وہ میرے تھانے میں گیا تھا۔

میں نے سوچا کہ اب لڑکی کی برآمدگی مشکوک ہوگئی ہے۔ جھیلہ یعنی کنواری دِلہن اُس کے لیے بڑا ہی قیمتی مال تھا۔ اُس زمانے میں راجے مہاراجے اور نواب ایسے مال کے بڑے موٹے گاہک تھے اور مال کی تلاش میں رہتے تھے۔ ایسی خوبصورت لڑکیاں بازاروں میں نہیں دی جاتیں بلکہ راجوں مہاراجوں کے ہاں فروخت کی جاتی تھیں۔ انگریزوں کے بنائے ہوئے چھوٹی چھوٹی نگرہوں کے ان بادشاہوں کے پاس بے انداز دولت تھی۔ اُن کی رعایا بھوکے مرنے والی تھی اور یہ بادشاہ شراب میں بدست رہتے اور اُن کے محل لڑکیوں سے بھرے رہتے تھے۔ میں نے سوچا کہ دیو اما چھی کو ایسی قیمتی لڑکی کی منہ می کا علم ہوگا۔ اگر اُسے علم ہے تو سچے ایک شریف گھر کے دِلہن ہمیشہ کے لیے گئی۔ مجھے یہ خطہ بھی نظر آنے لگا کہ مقتول کا قاتل دیو اما چھی ہے۔ اُس نے خود قتل کیا یا کرایا ہے۔

”لاری کس وقت واپس آئی تھی؟۔۔۔ میں نے ڈرائیور سے پوچھا۔“

”تقریباً دو گھنٹے بعد۔“

”تم نے کمالے سے پوچھا تھا کہ وہ لاری کہاں لے گیا تھا؟“

”پوچھا تھا لیکن اُس نے نہیں بتایا۔“ ڈرائیور نے جواب دیا۔ ”اُس نے مجھے چابی

دن اور چا گیا۔

”اُس کے بعد تیس دن گملا کہیں نظر آیا مانتا ہے
”میں نے نہیں دیکھا۔“

”میں نے دیکھا ہے۔“ ایک اور لڑکا اُڑنے لگا۔ ”وڑیڑھ دو گھنٹے گزرتے ہیں نے
گملا بازار میں جاتا دیکھ مانتا۔“

”گالی جاہ!۔“ ایک ڈرامیور نے کہا۔ ”ایسا حکم جاری کریں کہ کمالے اور دیوے باہمی
جینا کوئی بدعاش اُس سے بڑا آیا کرے۔ بہری در خواست ہے کہ شام کے بعد وہاں مندری کھڑا
کر دیا کریں۔ آپ خود نمازیں کہ واردات ان بدعاشوں نے کی اور گھڑیاں ہماری ضبط ہو گئیں۔
یہ سب دیوے کا نام ہے۔ ہماری روزی میں بیٹھ پڑے کہ نہیں!“

”میں اُس لڑکی کو نہیں چھوڑ سکتا تھا جس میں لڑکی کو لے جایا گیا تھا۔ میں نے اُس کی
چال سنے۔ باقی لڑکیاں چھوڑ دیں۔ مطلوبہ ڈرامیور کو شامل تفتیش کر کے پابند کر لیا۔ اتنے میں قبول
تفتیشی کار کی عمر بیستیس سال کے ادھر دھڑکتی تھی۔ اُس کی آنکھیں تیار ہی تھیں کہ آسمان کی ٹانگی
اُتار بھی سکتی ہے اور گھوڑ بھی سکتی ہے۔ میرے سامنے آئی تو میں نے مسکرا کر اُس کی آنکھوں
میں دیکھیں۔ ڈالیں۔ اُس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔

”گجراؤ نہیں قبولو! میری موجودگی میں گجراؤ کی ضرورت نہیں، لیکن مجھے بچکر نہ دینا۔“
”میں نے کہا۔“ تورنت ذات جو عورت سے بات کروں گا اور جتنی دیر میرے پاس رہو گی
عورت سے دیکھوں گا۔“ میں نے اُسے اپنے ساتھ لیا اور عموالات کے دروازے کے سامنے
بٹھ کر لیا۔

اُس نے سلاخوں میں سے اندر دیکھا۔ ارشاد فرش پر بیٹھا تھا۔ میں نے قبولو سے

کہا۔ ”اچھی طرح پہچان لو تاکہ تمہیں کوئی شک نہ رہے۔“ وہاں سے ہٹا کر میں نے باہر
کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔ ”وہ جولاہی کھڑی ہے نا! اس میں جملہ کو لے جایا گیا ہے۔ جملہ
کو جانتی ہونا! جسے تم نے کبل اور چادر میں لپیٹ کر گھر سے نکالا اور تانگے کی طرف بھیجا تھا۔“

مُجرم کون ہے۔ آپ یا یہ عورت؟

قبولو پہلی بار پولیس کے پھندے میں آئی تھی اور وہ بھی اتنے سنگین جرم میں جو ایک قتل
کا بھی باعث بنا۔ ارشاد کو وہ اچھی طرح پہچانتی تھی۔ اُسے عموالات میں دیکھ کر اُس کے
چہرے سے خون اندر ہی کہیں غائب ہو گیا۔ اور میری مٹھری مٹھری باتوں اور تمہل نے
اُس کی ساری چالاکیاں ختم کر دیں۔ میں اُسے اپنے دفتر میں لے گیا۔ مُجرم کی بات ختم کر دی۔
اُسے یہ بھی نہیں کہا کہ اقبال جرم کر لو۔ میں نے پوچھا۔ ”تم کون ہو؟“ خاوند ہے، ہاں باب
ہیں؟“

”کوئی نہیں۔“ اُس نے جواب دیا اور اُس کے آنسو نکل آئے۔ میں اُس کے متعلق
اُس سے باتیں پوچھتا رہا اور وہ بتاتی رہی۔ وہ ہمہ دی کے قابل تھی۔ میں دلی ہمدردی کا اظہار
کرتا رہا۔ اُسے پانی پلایا۔ کھانے کی پوچھی لیکن وہ کھانا کھا آئی تھی۔

تھانیداری کو ایک رکھ دیں تو ہمارے معاشرے کے یہ کردار ہمہ دی کے طلب گار ہوتے
ہیں۔ آپ کو اپنے شہر اور شاید اپنے محلے میں بھی قبولو جیسی کوئی عورت ملے گی۔ ایسی عورتیں
جب پیدا ہوتی ہیں تو فرشتوں کی طرح معصوم اور پاک ہوتی ہیں مگر یہ جب ہمارے اور آپ
کے درمیان بستی بڑھتی اور جوان ہوتی ہیں تو یہ گناہگار اور جرائم پیشہ ہو جاتی ہیں۔ پھر ہم
انہیں اپنے گناہوں کا ذریعہ بھی بناتے ہیں اور انہیں گناہگار کہہ کر دھتکار بھی دیتے ہیں۔

روزِی رساں تو اللہ تعالیٰ ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ قبولِ وحی عورتوں کے روزِی رساں ہم لوگ ہیں جن کے گھروں میں وہ کام کرتی اور جن کی اجرت پر وہ گناہوں کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اگر یہ حرم تھا تو قبولِ کاسب سے پہلے یہ تھا کہ وہ غریب ماں باپ کے گھر پیدا ہوئی۔ ماں باپ محنت مزدور بن کر رہتے اور عزت تکتے تھے اور رہتے تھے۔ قبولِ وحی کی شکل و صورت ذرا اچھی تھی۔ ماں باپ کے گھر یہی تو عزت تھے۔ جن۔ وہ امیروں کی بیٹی ہوتی تو امیروں کے گھر جاتی غریب تھی اس لیے ایسے آدمی کے ساتھ باندھ دی گئی جو بظاہر کمین ملازم تھا لیکن جواری اور شرابی تھا۔ اس آدمی نے قبولِ کاسب کو وہ ازدواجی زندگی نہ دی جس کے وہ خواب دیکھا کرتی تھی۔ مثلاً نہ کو جوتے، چرس اور دیسی شراب کے لیے پیسوں کی ضرورت رہتی تھی۔ اُس نے قبولِ کاسب کو یہ کہ وہ کوئی کام کاج کرے اور پیسے کمائے۔ اُس نے ایک گھر میں اوپر کا کام لے لیا۔

چوتھے پانچویں سالِ خاوند کا دم اکھڑنے لگا۔ اُس نے چرس اور شراب نہ چھوڑی۔ آخر وہ ہتھ پانی سے لگ گیا۔ تین سال قبولِ کاسب نے گھروں میں کام کر کے اُس کی خدمت کی۔ اس دوران قبولِ کاسب ماں باپ مر گئے۔ دو بچے پیدا ہوئے اور مر گئے۔ ایک کھاتے پیتے گھرانے کی کچھ بھانڈی لے کر ایک آدمی کی طرف پیغام بھیجنے کے لیے اُسے استعمال کیا اور پیسے دینے کے لیے غلط قسم کی محبت تھی جس میں قبولِ کاسب کو رابٹلے کا ذریعہ بنایا گیا۔ اُسے اجرت کی ضرورت تھی وہ بلی رہتی تھی۔

وہ گنوار اور حاجت مند لڑکی تھی۔ اُس نے مذہب اور اخلاقیات کی کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی۔ ماں باپ۔ نہ عزت سے رہنا سکھایا تھا نہ خاوند نے شرم تاروی اور کیا ایسے گناہ کی لڑکی نے اُسے جانی کا پیغام دیا جہاں علم بھی تھا اور فضل بھی تھا۔ قبولِ

نے اس عورت دار گھرانے سے پیغام رسانی کا پیشہ سیکھ لیا۔ وہ جس آدمی کو پیغام دینے جاتی تھی اُسے قبولِ کاسب ہی پسند آگئی۔ جتنی بڑے گھرانے کی لڑکی پسند آتی تھی۔ یہاں سے اُس نے غیر مرد اور خاوند کے درمیان فرق مٹا دیا پیسے لیے اور چرس کے ماہر ہمیشہ خاوند کی بیماری پر خرچ کیے۔ خاوند بچ نہ سکا۔ ایک روز مر گیا۔ قبولِ کاسب عمر اٹھائیس سال سے ذرا اوپر ہو گئی تھی۔ اُسے شادی کے لیے کہا گیا مگر اُس نے ازدواجی زندگی میں ہمیشہ کے لیے توڑ دیں اور ہم اور آپ جیسے عورت والے اور اونچے ناموں والے گھرانوں کی نوکرانی بن گئی۔ عورت داروں نے اُسے گناہوں کا ذریعہ بنالیا۔ قبولِ کاسب چوڑنے اور توڑنے کی ماہر بن گئی۔ وہ بہت سے گھروں کے بھیدوں کی رکھوالی تھی۔ چار دیواری کی دُنیا کے بھید اُس کے سینے میں بھرے ہوئے تھے۔

اُس نے مجھے چند ایک واقعات سنائے۔ وہ مجھے اپنی زندگی کی کہانی یوں سنارہی تھی جیسے میں اُسے اس دوزخ سے نکال کر عزت کی کرسی پر بٹھا دوں گا۔ اُس کے اندر ابھی یہ احساس پیدا نہیں ہوا تھا کہ میں اُسے اس گندے دوزخ سے تو نکال دوں گا لیکن ایسے دوزخ میں فیکہ کروں گا جو اُسے ضعیف بوڑھا کر کے سوسائٹی میں اُٹکے گا۔ پھر قبولِ کاسب مجرم بن جائے گی۔ میں مجبور تھا۔ میرے جذبات کیسے ہی تھے، میرا فرض بڑا ظالم تھا۔ میں اُس کی سنارہا۔ اُس کی زبان ایسی رواں ہو گئی تھی کہ مجھے کسی سوال اور جرح کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ اُسے زندگی میں پہلی مرتبہ سینے کا غبار نکالنے کا موقع ملا تھا۔ میرے سلوک اور ردِ لیے میں اُسے وہ انسِ نظر آگیا تھا جسے وہ شاید ہمیشہ تلاش کرتی رہی تھی۔ یہ تو اُس نے دیکھ ہی لیا تھا کہ اُس کا جرم بے نقاب ہو چکا ہے اور اب ہیرا پھیری نہیں چلے گی۔ اُس نے جیل اور آصف و مقول کی داستانِ محبت شروع کر دی۔

نے اگر ڈیوڑھی کی پتی بچھا دی اور دُسن سے کہا کہ چلو۔ دُسن نے مہنایت پھرتی سے شلوار تار دی۔ پلنگ کی چادر باندھتی۔ اوپر کبل لیا اور نکل گئی۔ قبو لو ڈیوڑھی کے دروازے میں کھڑی رہی۔ دُسن گلی سے نکل گئی تو قبو لو نے ڈیوڑھی کی پتی جھلائی اور مہمان عورتوں میں گھل مل گئی۔ دُسن کی گمشدگی کا انکشاف ہوا تو اس کی تلاش میں سب سے زیادہ جھباگ دوڑ قبو لو نے کی۔ ساری رات قیامت بپا رہی۔ کوئی بھی نہ سویا۔ صبح کے وقت دُسا کے باپ نے کہا کہ مٹھانے رپوڑٹ لکھائی جائے۔ قبو لو نے مخالفت کی اور کہا کہ آج کا دن ویکہو لو شاید واپس آجائے۔ رپوڑٹ لکھوائی تو پولیس آئے گی اور لوگ تماشا دیکھیں گے۔ دونوں گھوڑے تو اوسان خلا تھے۔ بے چارے عقل کی بات سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔ صورت حال یہی کچھ ایسی پیدا ہو گئی تھی۔

[illegible]

میرے پوچھنے پر قبول کرنے والوں کے رد عمل کے متعلق بتایا کہ اُس پر تو ایک ہی چپٹا رسی متھی۔ اُس نے صرف ایک بار کہا۔ ”میں جانتا ہوں۔ میں جانتا ہوں۔ جو اللہ کو منظور ہو گا۔ دنیا دیکھنے کی۔“

میں نے قبول کو حوالات کے زمانہ کمرے میں بند کر دیا۔
وہ حوالات میں بیٹھی تھی
میرے بیڈ کانسٹیبل کی مہنگ دوڑ اور تین مجروں کی کوشش سے کمالا ہمعاش مل گیا۔

”کما لے دوست“۔ میں نے اسے کہا۔ ”میں تھک کر چور ہو چکا ہوں۔ تم بھی تھکے ہو۔ معلوم ہوتے ہو۔ ہم دونوں کو آرام کی ضرورت ہے۔ آؤ۔ کام ذرا جلدی ختم کریں اور آرام کریں۔“

”وہ لاری کھڑی دیکھ رہے ہو؟“

”اور اس کے ڈرائیور کو بھی تم پہچانتے ہو!“

”اس چابی کو بھی پہچانتے ہو“۔ میں نے جیب سے لاری کی چابی نکال کر اُسے

دکھائی۔

”اور تم مجھے بھی پہچانتے ہو!“

”میرے ساتھ آؤ۔“ میں اُسے حیرات کے آگے لے گیا اور استاد کی طرف اشارہ کر کے

اُس نے ماتھا کیڑا اور میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ میں اُسے حوالات کے اگلے کمرے

کے سامنے لے کیا جس کی سلاخوں میں سے اسے بھولو فرس پر بیسی لطرائی۔ بھولو سے سرفہر

کیا اور نہیں دیکھا۔ لگاتار لے لیا۔ اگلے میری نبوی ابوہی اسی پھر میں اور جابہ۔

کھائے کو اپنے دفتر میں بیٹھا کہ میں نے یوحیہا — عدویو اما بھی اس وقت کہاں

”میں تو سرکار کے حضور بیٹھا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”دلوں کے متعلق کیا بتا

سکنا ہوں۔“

”کمال ہے!“ میں نے ذرا عجب سے کہا۔ ”مقدمہ اڑنا چاہتے ہو تو میں تم سے کوئی

بیان نہیں ہوگا۔ زبردستی بھی نہیں کروں گا۔ میرے پاس اتنی شہرت ہے کہ تمہارے بیان کی

مجھے ضرورت ہی نہیں۔ یہ بھی سن لو کہ اغوا کا ایسا مجرم مل ہو کیا ہے۔ یہ تم نے کیا سنا ہے یا نہیں؟

میں نے گریہ کر کے قسم اُٹھا کر لی تھی کہ میں اس سے لڑنے سے باز رہوں گا اور یہی ہے کہ میں نے اس سے لڑنے سے باز رہا ہے۔

اُس نے حیران ہو کر لومھا۔ ”قتل کون ہوا؟“

پہلے مجھے جواب دو۔ میں نے کہا۔ اپنی ہسٹری ٹیٹ دیکھو۔ تمہیں ساری

عمر کے لیے اندر بند کرنے کو یہی کافی ہے۔ اگر بزرگے تو فائدے میں رہو گے۔ تم انہی تو

نہیں کماے! قانون اور پولیس کی اُوپر نیچ سمجھتے ہو.... بولو کیا ارادہ ہے۔“

”وعدہ معاف گواہ بناتے ہوئے۔ اُس نے پوچھا۔

”اگر ضرورت پڑی تو۔۔۔“ میں نے جواب دیا۔

”ملک سرکار!۔۔۔ اُس نے پہلے ہاتھ جوڑے پھر میرے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر میرے پاؤں میں بیٹھ گیا۔ منت کرنے لگا۔ ”وعدہ معافی مکھو دو۔ ساری واردات ثابت کر دوں گا۔ اللہ پاک کی قسم، مقدمہ سزا سنہ ہوا لوگوں کی مار دینا۔“

”پہلے بولو۔۔۔ میں نے کہا۔ ”وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری خواہش پوری کروں گا۔ مجھے مجبور نہ کرو۔ تم اب میرے پھندے سے نکل نہیں سکتے۔ میں اب قاتل کو نہیں ڈھونڈوں گا۔ قتل بھی تمہارے کھاتے میں جائے گا۔“

جو قارئین جرائم پیشہ افراد سے واقف نہیں وہ شاید حیران ہوتے ہوں کہ ایک جرم میرے ساتھ بے تکلفی سے اپنے جرم پر سودا بازی کر رہا تھا۔ جرم اور جیل این لوگوں کے لیے یوں ہوتا ہے جیسے دفتر اور گھر کوئی جرائم پیشہ گرفتار ہو جائے تو دیکھ لیتا ہے کہ پولیس کے ہاتھ میں کیا ہے۔ اگر پولیس اندھیرے میں ہے یعنی شک ہے شہادت نہیں ہے تو وہ پولیس کو کوئی بیان نہیں دیتا۔ مقدمہ لڑتا ہے۔ اکثر جرائم پیشہ افراد قانون سے اتنے واقف ہوتے ہیں کہ وکیل کے بغیر کیس جیت سکتے ہیں، اور اگر اُسے معلوم ہو جائے کہ پولیس کے پاس شہادت ہے تو جرائم پیشہ سودا بازی کر کے اقبال جرم کر لیتا ہے۔ یہ نسل قید سے نہیں ڈرتی بلکہ قید کو اپنے کاروبار کا لازمی حصہ سمجھتی ہے۔ کما لے نے دیکھ لیا تھا کہ میں نے شہادت کا پھندا بہت حد تک تیار کر لیا ہے۔ اس کے پاس ہی ایک چال رہ گئی تھی کہ وعدہ معاف گواہ بننے کی کوشش کرے۔ میں نے اُسے جھوٹا وعدہ دیا۔

وعدہ معاف گواہ جسے سلطانی گواہ بھی کہا جاتا ہے پولیس کا کام آسان کر دیتا ہے۔

میں اس کو قائل نہیں تھا۔ سلطانی گواہ اُس واردات میں بنایا جاتا ہے جو زیادہ مجرموں سے بل کر کی ہو اور کوئی شہادت نہ ملے۔ ان میں سے ایک پکڑا جاتا ہے تو وہ وعدہ معاف گواہ بنایا جاتا ہے جو سب کو پکڑا دیتا اور شہادت مینا کرتا ہے۔ عدالت اُسے کوئی سزا نہیں دیتی۔ یہ اُس کا انعام ہوتا ہے۔ یعنی ایک مجرم کو معاف کر دیا جاتا ہے۔ یہیں وجہ نفی کو نہیں دیکھ سکتا گواہ کہ ہی بنایا کرتا تھا۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ وعدہ معاف گواہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہ نیک کرتا ہے کہ عدالت میں مقدمے کی سماعت کے دوران بیان دے دیتا ہے کہ اُسے پولیس نے غیر انسانی تشدد کے زیر اثر وعدہ معاف گواہ بنایا ہے۔ اُس کا اس واردات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ ایسی صورت میں پولیس کے لیے کیس ثابت کرنا بہت ہی دشوار ہو جاتا ہے۔

”ولسن دریا پار کر گئی

کما لے نے مجھے خوش کرنے اور مجھ سے رعایت لینے کے لیے بیان دے دیا۔ اُس نے بتایا کہ اُس نے تانگے کی پچھلی سیٹ پر دو لڑکیاں لڑکی ہے لیکن اُسے شک نہیں ہوا تھا۔ مقتول اور ارشاد کو اُس نے پہچان لیا کہ قصبے کے نو جوان ہیں۔ انہیں ساتھ لے کر رات کو کوئی لاری نہیں جاتی۔ اُن کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہوں نے یہ بھی فیصلہ نہیں کیا کہ انہیں جانا کہاں تک ہے۔ اندر ویلا مانا ہی آیا بیٹھا تھا کما لے نے اُسے بتایا کہ مال معلوم ہوتا ہے۔ لڑکوں کو اندر بلا لیا گیا۔ وہاں وہاں سے نے پوچھا کہ یہ لڑکی تمہاری کیا گئی ہے تو مقتول نے کہا کہ لڑکی نہیں لڑکا ہے اور جیسار ہے۔ کما لے نے بتایا کہ معاف لڑکا تھا کہ یہ لڑکی ہے۔ مختصر یہ کہ دونوں اُساد ستھے۔ دیوار اچھی تو آسمان سے تارت نوچنے والا

اُستاد تھا۔ دونوں بھائی بچ گئے۔ دیوے کے مجرم دماغ نے فوراً سکیم تیار کر لی اور انہوں نے لڑکی باکھل اُسی طرح اُڑان جس طرح میں دوسرے مجرموں کی زبانی سنا چکا ہوں۔ اس سے آگے یوں ہو کہ مقبول کرتے ہیں میں اتار کر انہوں نے لاری چلائی تو لڑکی نے بیچ و پکار شروع کر دی۔ دیوے نے ہانپ کر لڑکی کو اُس کی گردن پر رکھ دی۔ لڑکی نے کہا کہ میری گردن کاٹ دو مجھے قتل کر دو۔ انہوں نے کپڑے سے اُس کا منہ باندھ دیا۔

دریا کے پار قبضے سے پھر میل دور ایک گاؤں تھا جہاں دیوے ماچھی کا ایک ٹھکانہ تھا۔ وہاں تک لاری جاکر تھی وہ لے گئے۔ ڈیڑھ ایک میل فاصلہ رہ گیا تھا۔ وہاں سے دیوے نے لڑکی کو کنڈھوں پر اُٹھالیا۔ لاری وہیں چھوڑ کر کمالا اُس کے ساتھ گیا۔ انہوں نے لڑکی کو باری باری اُٹھایا اور اپنے ٹھکانے میں پہنچ گئے۔ کمالا واپس گیا کیونکہ اُسے لاری واپس کرنی تھی۔ اُس جنگل یا باغ میں کوئی دیکھنے والا نہ تھا کہ لاری ادھر کیوں آئی ہے۔

کمالا لاری واپس آئے پر لے آیا۔ اُسے کوئی دو گھنٹے ٹنگے۔ لاری کے ڈرائیور نے بھی بتایا تھا کہ کمالا لاری دو گھنٹے بعد لایا تھا۔ کمالا بیدل دیوے ماچھی کے ٹھکانے کی طرف چل پڑا۔ اُسے اپنا حصہ وصول کرنا تھا۔ دونوں نے لڑکی کو بہت پریشان کیا۔ اُس کے زیورات تقسیم کر لیے۔ ایک رات میں لڑکی کو بے ہوش ہوئی۔ دیوے ماچھی نے کمالے کو بتایا کہ وہ صبح اپنے ایک آدمی کو پٹیلہ بھیجے گا۔ وہاں سے وہ گاؤں لائے گا۔ ظاہر ہے کہ گاؤں ہمارا چوٹیالہ کے آدمی ہوں گے۔ دیوے نے یہ بھی کہا تھا کہ ان گاؤں سے سوداگر بن کا تو وہ کوئی اور گاؤں دیکھے گا۔ ایسے مال کو ساتھ لے پھرنا خطرناک تھا۔

دیوے ماچھی نے کمالے سے کہا کہ وہ واپس چلا جاتے۔ مال فروخت ہوتے ہی اُس کا حصہ اُسے مل جائے گا۔ کمالا صبح کے وقت وہاں سے واپس آیا۔ دیوے نے اُسے یہ بھی

کہا تھا کہ آؤں گاؤں کو پکار کھنا اور پولیس کی بھی خبر کھنا۔ گڑبڑ کا خفاہ ہو تو قبل از وقت اطلاع دے دینا۔ کمالے کو دیوے ماچھی پر بھروسہ تھا۔ اُسے یہ بھی یقین تھا کہ لڑکی ابھی اسی گاؤں میں ہوگی۔ گاؤں کو دوسرے آنا تھا۔ کمالا اگلی شام بھی گاؤں گیا اور دوسرے دن واپس آیا۔

یہ وقت مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ سورج غروب ہونے میں ابھی دیر تھی۔ میں نے تھانے کا چارن رگھوناتھ کو دیا۔ کمالے سے گاؤں کا محل وقوع سمجھا۔ اُسے سمجھا۔ لڑکی جس مکان میں تھی وہ معلوم کیا اور بارہ کانٹیل رائفوں سے مسلح تیار کیے۔ تین تانگے منگوا لیے۔ کمالے کو حوالات میں بند کر دیا۔ سورج غروب ہونے کے ایک گھنٹہ بعد میں نے اپنی پارٹی تانگوں میں بٹائی اور روانہ ہو گئے۔ گاؤں سے ایک میل دور تانگے روکے۔ تانگہ بانوں کو وہیں انتظار کرنے کو کہا اور ہم پیدل چل پڑے۔ میں نے اپنی پارٹی کو حملہ اور گیر کرنے کی سکیم بتا دی تھی۔ تیز روشنی والی ٹارچیں بھی ساتھ تھیں۔

یہ چھوٹا سا ایک گاؤں تھا جس پر گہری نیند طاری تھی۔ ایک آواز آئی۔ کون ہوا ہے؟ ادھر آؤ۔ میں آگے گیا۔ فائدہ یہ تھا کہ چاندنی تھی۔ یہ آئی دیوے ماچھی کو چمکیدار معلوم ہوتا تھا۔ میں اُس کے قریب گیا تو اُس نے وردی سے بچپانا میرے ہاتھ میں رکھ دیا اور تھپتھپانے لگا۔ میں نے لڑکی اور اُس کے سینے پر رکھ کر پوچھا۔ ”دیو ماچھی کہاں ہے؟“

ایک کانٹیل آگیا۔ اُس کے پاس رائفل تھی۔ میں نے اس آدمی سے کہا۔ ”مجلدی بتاؤ دیو کہاں ہے۔ اس گاؤں میں اتنے آدمی نہیں۔“ لڑکی پولیس آگئی ہے۔ اُس نے بتا دیا۔

وہ کچا مکان تھا جیسے دیہات میں ہوتے ہیں۔ صحن کی دیوار چھ فٹ کے گتہ گتہ

اوپر جی تھی۔ میں نے اس آدمی سے معلوم کر لیا تھا کہ وہ دیوے کا چوکیدار ہے۔ یہ غریب سے کسانوں کا گاؤں تھا جو دیوے ماچھی جیسے ڈکیتوں کا حکم مان سکتے تھے ان کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔

میں نے دیوے کے چوکیدار سے کہا کہ دیوے کو آواز دے کہ باہر بلاؤ۔ کو کوئی دوست آیا ہے۔ میں نے دو کانٹیلوں کو دروازے کے ادھر ادھر چھپا دیا اور خود دروازے کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اُس آدمی نے دیوے کو آواز دی اور باہر آنے کو کہا۔ دروازہ کھلا۔ دیوہا باہر آ گیا تھا کہ میرے دیوہا کی نالی اُس کے پہلو کے ساتھ لگ گئی اور تین کانٹیلوں نے اُسے گھیر لیا۔ یہ اتفاق کی بات تھی کہ وہ لوہا ماچھی ہی تھا۔ میں نے اُسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُسے پکڑ لیا اور فوراً پھٹکڑی لگائی۔ گاؤں کے لوگوں کو جگایا۔ ان میں سے دو جو دریا سانے تھے انہیں لڑکی کی برآمدگی کا مشیر (گواہ) بنایا اور دیوے سے کہا کہ مجھے لڑکی کے پاس لے چلو۔

”تمہیں کمالے نے بھیجا ہے؟“ دیوے ماچھی نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے پوری طاقت سے اُس کے منہ پر گھونٹ مارا۔ ایک کانٹیل نے اُس کے کولے پر رانفل کا بٹ مار کر کہا کہ ملک صاحب نے تمہیں کیا حکم دیا ہے؟

وہ اندر کو چل پڑا۔ میں اُس کے پیچھے گیا۔ کمرے میں لڑکی چار پائی پر بیٹھی تھی۔ شراب قبول پڑی تھی۔ لڑکی واقعی خوبصورت تھی۔ اُس نے دیکھا کہ پولیس آگئی ہے تو وہ اٹھی مگر صُمن کا سر ڈول گیا۔ وہ ہوسٹس ہو کر گر پڑی۔ یہ غیر متوقع اور اچانک نجات ملنے کا اثر تھا۔ لڑکی برآمد ہو گئی۔ اُس رپورت بھی دیوے ماچھی نے نکال دیئے۔ میں نے مشیر نامہ تیار کیا۔ مشیروں کے دستخط لیے اور انہیں سمجھا یا کہ انہیں گواہی کے لیے طلب کیا جائے گا۔ لڑکی کو میں ہوش میں لایا اور ہم کامیابی سے ستھانے کو روانہ ہوئے۔ تانگے انتظار میں کھڑے تھے۔

کالی چھپکلی اور رینینہ کے رستم

آدھی رات گزر گئی تھی جب ہم ستھانے میں پہنچے۔ لڑکی اور دیوے ماچھی کی حراست، ایک کھانسی کا نظام کر کے میں نے وہ زیدہ کارروائی صبح تک کے لیے ملتوی کر دی۔ صبح پانچ بجے میں نے دیکھا کہ کمالے سے زیورات برآمد کر لیے جو اُس نے ابھی بیچے نہیں تھے۔ ملازموں کا رینا لڈیا۔ لڑکی کے بیان کی تفصیل سے پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اُس نے ان بیانات کی تصدیق کی جو دوسرے ملازمین نے چکے تھے۔ اس کی ذہنی اور جسمانی حالت بہت بُری تھی۔ معلوم ہوتا تھا وہ پاگل ہو چکا ہے۔ مگر موقع ملا تو خود کُشی کر لے گی۔ وہ آخر پر دو دار لڑکی تھی۔ اُسے جب یہ بتایا کہ میں کی خاطر اُس نے اتنا سنگین جرم کیا اور پاگوں کی سی دیری کا مظاہرہ کیا ہے وہ قتل ہو چکا ہے تو وہ اتنا روتی کہ اُس کی چینیں نکل رہی تھیں۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ مقتول کا قاتل کون سی ہے۔ لڑکی نے کمالے اور دیوے ماچھی کے خلاف میرا شک رفع کر دیا۔ قتل کے وقت یہ دونوں گاہک تھے۔ لڑکی کے پاس تھے۔ میرے لیے اب قتل کا معرہ روا تھا۔

اگر کمالا اور دیوہا قاتل نہیں تھے تو کمالا اور اُس کے چچا زاد بھائی ہو سکتے تھے۔ میں نے ارشاد کو چاندی کا تعویذ جو مقتول کی لاش کے پاس ہے، برآمد کیا۔ اُسے دیکھا کہ چچا زاد بھائی کا تو نہیں؟ اُس نے دیکھ کر کہا ”مقتول نے کبھی تو اپنے نہیں باندھا تھا۔“ اُس نے غور سے دیکھا اور وثوق سے کہا ”یہ کالی چھپکلی کا ہے۔“ اُس کے چچا زاد بھائیوں کو اچھل چڑھنا ہوں وہ بھی گلے میں تعویذ نہیں ڈالتے۔“

میرا دل مان نہیں رہا تھا کہ کالی چھپکلی اتنی جرات کر سکتا ہے لیکن انسان کی فطرت کو اندر سے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ ذہن پر زور دیا تو مجھے قبول کیا یاد آ گیا۔ دوا کے تین

اُس نے کہا تھا کہ دامن کے اغوا کے اگلے روز دُلا کو یہ کہتے سنا گیا تھا۔ ”میں جانتا ہوں۔ میں جانتا ہوں۔ جو اللہ کو منظور ہوگا۔ ساری دُنیا دیکھنے گی۔“ مجھے یہ بھی یاد آیا کہ ارشاد نے بتایا تھا کہ مقتول نے اُسے طعنہ دیتے تھے۔ یہ طعنہ ایسے تھے جو اشتعال کا باعث بنے ہوں گے۔ میں نے محض شک پر کالی چھپکلی کو تھانے بلایا۔

وہ آیا تو میں نے سب سے پہلے اُس کی جوتی دیکھی۔ یہ اُس کے کھڑے کے مولڈ میں فٹ آگئی۔ کھوج کو بلایا۔ اُس نے جوتی کا تلو ا دیکھا تو کھڑے میں اُس نے سلائی میں جو خصوصیت نوٹ کی تھی وہ جوتی میں نظر آگئی۔ جس وقت ہم اُس کی جوتی اُتروا کر دیکھ رہے تھے اُس وقت اُس کی حالت گھٹنے لگی تھی۔ اُس کی زبان تھقیانے لگی اور میں نے دیکھا کہ اُس کے ہونٹ خشک ہو گئے اور اس کے ہاتھ کا نپ رہے تھے۔

”گلے کا تو نڈیہ کہاں ہے؟“ میں نے اُس سے پوچھا۔

اُس نے کچھ بھی جواب نہ دیا۔ بیوقوفوں کی طرح میرے منہ کی طرف دیکھتا رہا میں نے تو نڈیہ اُس کے آگے رکھ دیا اور کہا۔ ”یہ ہے تمہارے جرم کا ثبوت۔“ پھر میں نے اُس کے ساتھ ہمدردی کی باتیں شروع کر دیں۔ قاتل ہونے کے باوجود اُسے گناہ اور ظلم کہا۔ ایسی بہت سی باتیں کہیں جن سے وہ موم ہو گیا۔ بہت سی جھک جھک اور طعنہ کی باتوں کے بعد میں نے اُسے اقبال جرم کے لیے تیار کر لیا۔

اُس نے اپنے طویل بیان میں کہا کہ اُس کی شکل و صورت، جسم اور رنگ کی وجہ سے اُسے دھتکارا گیا۔ لڑکی نے بھی اسے کالی چھپکلی کہا۔ وہ جسے پابستی تھی اُس نے بھی اُسے طعنہ دیتے۔ اُس نے کہا۔ ”وہ جس کے ساتھ بھاگی تھی اُس نے مجھے کہا کہ اب اپنے جیسی کوئی اور ڈھونڈ لو۔ میں نے یہ بالکل نہیں سوچا کہ وہ یہیں موجود ہے تو میری دامن بھی یہیں

ہوگی۔ آپ نے مجھ سے پوچھا تھا تو میں نے کسی پر شک ظاہر نہیں کیا تھا۔ اُس وقت مجھے معلوم تھا کہ وہ کس کے ساتھ گئی ہے۔ میں نے موقع تلاش کرنا شروع کر دیا۔“

اُسے خیال آگیا کہ مقتول بہت سویرے کھاڑے میں ورزش کرنے لیے جاتا ہے۔ آگے دن وہ ادوان کی گز بھرتی لے کر بہت سویرے گھر سے نکل گیا۔ رات وہ اُسی کمرے میں سویا تھا جہاں سے اُس کی دامن غائب ہوئی تھی۔ سحر کے وقت اُٹھا اور دبے پاؤں باہر چلا گیا۔ وہ میان میں گیا اور کھاڑے کے قریب ایک درخت کے پیچھے چھپ گیا۔ تھوڑی دیر بعد مقتول آیا۔ اُس نے کپڑے اُتارے اور جسم کی مالش کی۔ وہ ڈنٹر پہننے لگا تو دُلا دبے پاؤں اُس کے پیچھے چھپ گیا۔ رستی کے دونوں سرے ہاتھوں میں پکڑ کر اُس کے پیچھے سے رستی مقتول کی گردن میں چھپ گیا۔ مقتول کے سنبھلنے تک اُس نے تیزی سے رستی کو مروڑ کر بڑا تنگ پھندا بنا دیا۔

مقتول کے مقابلے میں قاتل کا جسم کچھ بھی نہ تھا مگر اُس کی گردن پسینہ میں آگئی تھی اور قاتل رستی کو ابھی تک مروڑ رہا تھا اور جھٹکے بھی دے رہا تھا۔ مقتول نے ایک بار زور لگایا۔ قاتل نے بیان میں کہا کہ رستی اُس کے ہاتھ سے چھوٹ پئی تھی۔ مقتول نے ایک ہاتھ پیچھے کر کے قاتل کی گردن پکڑنے کی کوشش کی۔ مگر اُس کے ہاتھ میں تو نڈیہ کا دھماکہ آگیا جو ٹوٹ گیا۔ اس کے فوراً بعد مقتول کا جسم ڈبیا۔ ہو گیا۔ قاتل نے پسینہ اور زیادہ تنگ کر کے زور زور سے جھٹکے دیتے۔ مقتول گر پڑا۔ قاتل نے رستی وہیں چھوڑی۔ تو نڈیہ کا اُسے خیال نہ رہا اور وہ کھاڑے سے گزر کر گھر چلا گیا۔ گھر وائے ابھی تک سوئے ہوئے تھا۔ وہ اپنے کمرے میں گیا اور لیٹ گیا۔

قاتل کا جرم ثابت کرنا آسان نہیں تھا لیکن وہ عدالت میں اپنے اقبال بیان سے منحرف نہیں ہوا۔ میں نے جو گواہیاں پیش کیں وہ اشتعال ثابت کرتی تھیں۔ موقعہ کا کوئی

وہ دلیر تھا یا بیوقوف

اگر ایک کنواری لڑکی اپنی شلوار
کو غن لگا کر سارے گاؤں کو یہ
دھوکہ دینے کے لیے راتے میں
چھینک سکتی ہے کہ اس کی
آبروریزی ہوئی ہے اور وہ قتل
ہو گئی ہے تو فوج کا ایک ناکہ
تو بہت کچھ کر سکتا ہے۔

گواہ نہ تھا۔ اُسے سات سال سزائے قید دی گئی۔ ہائی کورٹ نے اپیل میں اُسے شک کا فائدہ
دے کر بری کر دیا۔ کمالے اور دیوے ماچھی کو اغوا اور آبروریزی کی دفعات کے تحت مجموعی ملو
پر گیارہ گیارہ سال سزا دی گئی۔ ارشاد کو اعانت مجرم میں چھ ماہ اور قبو کو تین سال۔ جمیلہ
بے شک مظلوم تھی لیکن وہ ملزم بھی تھی۔ میں اُسے معاف نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس معاملے
میں قانون بڑا ڈھیلا ہے۔ سزا اُس آدمی کو مافی ہے جو لڑکی کو یا کسی کی بیوی کو ورغلا کر لے
جاتے۔ میں نے سوچا کہ جمیلہ بچ گئی تو اس سے اُن بیویوں کو شہ ملے گی جو خاوندوں کو ناپسند
اور کسی رکوپسند کرتی ہیں۔ میں نے اُسے دھوکہ دہی کے الزام میں پیش کیا تھا لیکن وہ بچ
گئی۔ وہ بہت ہی بُری اور شرمناک سزا سبکت چکی تھی۔ یہ سزا کیا کم تھی کہ وہ برادری سے
بہمیشہ کے لیے دھتکار دی گئی تھی۔

تھے اور وزیر تفتیش تھے۔ انگریز ڈپٹی کمشنر پکا فرعون تھا۔ پولیس کا وڈ مشن تھا۔ جب دوسرے پر آتا تھا تو کانٹیلہلوں کے پرائیویٹ بکس بھی کھول کر دیکھتا تھا۔ پولیس کپتان ہیں انگریز تھا۔ تھانیداروں کو وارڈسٹارک ان کا امتحان لیتا تھا۔ اردو بولتا تھا لیکن ماں بہن کی گالیاں پنجابی زبان میں دیا کرتا تھا۔ وزیر تفتیش کیسوں کی کارگزاری اور روزنامہ پوری توجہ اور غور سے دیکھتا تھا۔ ذرا سی سستی یا بیہوشی نظر آئے تو معطل کر دیتا تھا۔

اُدھر تمارت دیہات کے مسلمان بھائیوں کا یہ حال تھا کہ ایک دوسرے کے پولیٹیکل موشیوں کو زہر دینے، کھیان سنانے، ایک دوسرے کی عورتیں اغوا کرنے اور قتل کرنے سے باز نہیں آتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ہمارے لیے یہ شکل پیدا کر دیتے تھے کہ تفتیش میں ذریعہ تعاون نہیں کرتے تھے۔ گاؤں کا بچہ بچہ اس طرح بدعنوان بناتا تھا جیسے ان کے گاؤں میں کوئی وارڈسٹارک ہوئی ہی نہیں۔ اصل پر کم کراچی طرح جانتے ہوئے بھی یہ لوگ تفتیش میں کوئی بد نہیں کرتے تھے کیونکہ اسے وہ گاؤں اور برادری کے خلاف غداری سمجھتے تھے۔ ان حالات میں پولیس کو جادوگری کرنی پڑتی تھی۔ ساری تفتیش اُدھیرے میں ہوتی تھی۔ تھانیداروں کو عقل اور فہم درست کے زور پر سراسر سانی کرنی پڑتی تھی۔

لڑکی مناسب شہلوار موجود

وہ ایسے ہی حالات تھے جن میں ایک روز وزیر نے تھانے میں یہ رپورٹ درج کرنی گئی کہ عائشہ نام کی ایک لڑکی، عمر بیس سال دوروز۔ لاپتہ ہے۔ گاؤں سے نصف میل دور ایک کھڈے اُس کی شوار ملی ہے۔

رپورٹ درج کرانے والا اُس کا باپ تھا۔ اس کے ساتھ لڑکی کا چچا تھا۔ لڑکی گنوا رہی

یہ وارڈسٹارک پاکستان سے ڈیڑھ ایک سال پہلے کی ہے۔ وارڈسٹارک علاقہ پاکستانی ہے۔ متعلقہ افراد بقید حیات ہیں، اس لیے میں کسی گاؤں کا نام نہیں لکھوں گا۔ افراد کے نام انہی کی بجائے فرضی استعمال کر رہا ہوں۔ میں اُس وقت وارڈسٹارک کے تھانے کا امین۔ ایچ۔ او تھا اور یہ تھانہ دیہاتی علاقے کا تھا۔

پنجاب کے دیہاتی علاقوں کی تھانیداری سے اللہ بچائے۔ برادریوں کے مابین خاندانی دشمنیوں پر قتل اور خون خرابے روزمرہ کا معمول ہیں۔ اللہ کا فضل، تو خوب ہوتا ہے۔ دولوں فریق ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر رشوت دیتے ہیں لیکن ہر ایک کیس گول نہیں کیا جا سکتا۔ مقدمہ تو قلم کرنا ہی پڑتا ہے۔ استغناء کمزور کر کے ملزم کو چھڑا لیا جاتا ہے۔ البتہ انگریزوں کے زمانے میں یہ کام بہت مشکل تھا۔ ہندو، مسلمان اور سکھ اکٹھے کام کرتے تھے چنانچہ کاڈر رہتا تھا۔ انگریز افسر اچانک تھانوں پر جادو دیکھتے تھے اور وزیر تفتیش وارڈسٹارک کی بال کی کھال اتارنے بیٹھ جاتے تھے۔ اس لیے ہر وارڈسٹارک کی تفتیش سوچ سمجھ کر اور پوری محنت سے کی جاتی تھی۔

میرا تھانہ ایسے ہی ایک علاقے میں تھا۔ قتل کے سات مقدمے کورٹ میں چل رہے

بتائی گئی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ شلوار کا رنگ آسمانی ہے اور اس پر خون کے داغ دھبے ہیں۔ انہوں نے شلوار و رات پر ہی پڑی رہنے دی تھی۔

عائشہ کے باپ سے تمام تر ضروری معلومات لی گئیں۔ میرے کچھ سوال ایسے تھے جن کا جواب کوئی بھی باپ صحیح نہیں دیا کرتا۔ مثلاً یہ سوال کہ کیا لڑکی دکانوں کے کسی آدمی کے ساتھ کبھی دیکھا گیا تھا یا گاؤں کے کسی آدمی کو لڑکی ایسی ہی نظروں سے دیکھتی تھی یا گاؤں کے کسی آدمی پر کبھی شبہ کیا گیا تھا کہ وہ لڑکی میں غیر معمولی دلچسپی لیتا ہے؟ اکثر والدین قسمیں کھا کر کہہ کرتے ہیں کہ ان کی لڑکی نیک پاک ہے۔ وہ اپنی مرضی سے نہیں گئی بلکہ اسے زبردستی انگوایا گیا ہے۔ لہذا اس راز سے پولیس کو اپنی کوششوں سے پردہ اٹھانا پڑتا ہے کہ لڑکی کتنی کچھ نیک پاک ہے۔

میں دو کانٹیلوں کو سہارا لے کر اس مقام پر گیا جہاں شلوار پڑی ہوئی تھی۔ میں نے اسے اچھی طرح دیکھا۔ اس کے بالائی حصے پر خون کے تین دھبے تھے۔ شلوار پر خون یہ گواہی دیتا تھا کہ لڑکی کی آبرو پر حملہ کیا گیا ہے لیکن شلوار برآمد ہونے والی جگہ پر تشدد اور زبردستی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔ واردات دور و زپٹے ہوئی تھی۔ بارش بھی نہیں برس چکی تھی اور آندھی بھی نہیں چلی تھی۔ وہاں مٹی تھی۔ پاؤں کے کچھ نشان موجود تھے۔ کھوجی بلائے گئے۔ انہوں نے گھرا اٹھایا۔ یہ دو انسانوں کے پاؤں کے نشان تھے۔ ایک کھوجی بوڑھا اور بہت تجربہ کار تھا۔ اس نے یہ رائے دی کہ ایک کھرا عورت کا ہے اور دوسرا مرد کا۔ وہ اس طرح یہاں سے گزرے تھے کہ مرد آگے اور عورت پیچھے تھی۔ دونوں گھر سے بتاتے تھے کہ وہ شلوار کے قریب سے گزر گئے ہیں۔ وہاں رُکے نہیں۔

کھوجی ہماری بہت مدد کیا کرتے تھے۔ بعض اوقات تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ان کی نظریں زمین کے اندر چلی جاتی ہیں۔ کسی ملزم کے گھر سے کاؤز اسٹانڈ نظر آجائے تو یہی

ان کے لیے کافی ہوتا تھا۔ اگر کل ان کی قدر قیمت ختم ہو گئی ہے۔

گھر سے (پاؤں کے نشان) شلوار کے پاس رُکے نہیں تو یہ سوال پیدا ہوا کہ لڑکی پر تشدد کس جگہ کیا گیا؟ اور اگر اسے قتل کیا گیا ہے تو لاش کہاں ہے؟ لیکن جو سوال میرے ذہن پر غالب آگیا۔ وہ یہ تھا۔ کیا واقعی لڑکی کے ساتھ زبردستی کی گئی ہے اور کیا واقعی اسے قتل کر دیا گیا ہے؟ اگر اس کی شلوار پینیک دی گئی ہے تو اس کا مطالبہ بھی تھا کہ اسے قتل کر دیا گیا ہے۔ وہ اپنی رضامندی سے گھر سے نہیں نکلی نہ بھی وہ کسی آسٹ نامکے ساتھ گئی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو شلوار اس کے ساتھ ہوتی۔

غیر وار میرے ساتھ تھا جو اسی گاؤں میں رہتا تھا۔ اس نے پوچھا کہ گاؤں کا کوئی آدمی لاپتہ تو نہیں؟ اس نے کہا: نہیں۔

دو کھوجی جھکے ہوئے زمین پر اس طرح گھرے دیکھنے لگے جس طرح بولگے کشتہ شکن کار کی بوسونگتے اور ادھر ادھر جگہ گتے دوڑتے ہیں۔ کھوجی بیٹھ جاتے تھے اور نظریں زمین پر گاڑ دیتے تھے۔ وہ مٹی سے پھیلے رہے تھے۔ میں وہیں کھڑا لڑکی کے باپ سے پوچھ گیا کہ کیا رہا تھا۔

”گاؤں میں کسی کے ساتھ عداوت ہے؟۔ میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے جواب دیا کہ برادری کے ایک خاندان کے ساتھ عداوت چلی آ رہی ہے۔

”لڑکی کی منگنی ہو چکی ہے یا کسی سے وعدہ کیا گیا ہے؟“

”جی، اسی خاندان میں لڑکی کی منگنی ہوئی ہے۔ باپ نے جواب دیا۔ ”پھر ہم نے

جواب دے دیا۔“

”کیوں؟“

”برادری کتنی تھی کہ دشمنوں کو لڑکی نہ دو۔“ اس نے جواب دیا۔

”لڑکے والوں نے پھر کیا کیا تھا؟“

”انہوں نے دھکی دی تھی کہ لڑکی کی ڈولی ہمارے سامنے نہیں اٹھے گی۔“ باپ نے کہا اور یہ بھی بتایا کہ یہ کوئی ایک مہینہ پہلے کی بات ہے۔

لاش ملی لیکن لڑکی کی نہیں

چار پائیاں وہیں آگئی تھیں۔ گاؤں والوں کا ایک ہجوم وہاں اکٹھا ہو گیا تھا۔ بیٹے دودھ کی ایک باٹی بھی آگئی تھی۔ میں نے غبردار سے کہا کہ وہ اُس لڑکے کے باپ کو بلائے جس کے ساتھ لڑکی کی منگنی ہوئی اور توڑی گئی تھی۔ وہ تماشائیوں کے ہجوم میں نہیں تھا۔ اتنے میں میرا وہ خیر میرے پاس آگیا جسے میں نے گاؤں میں بھیج دیا تھا۔ اس نے میرے کان میں اپنی رپورٹ دی۔ میں نے شلوار ایک کانٹیل کو دے کر سٹھانے بھیج دیا تاکہ وہ اسے ڈاکڑی معائنہ کے لیے بھیجنے کے لیے کاغذات اور پارسل تیار کرے۔

اُس لڑکے کا باپ آگیا جس کے ساتھ لڑکی کی منگنی کر کے توڑی گئی تھی۔ میں نے فالٹو لوگوں کو ڈور بٹھا دیا اور اس سے پوچھا ”اکبر کہاں ہے؟“ اکبر اُس کے بیٹے کا نام تھا۔

”اکبر.... وہ گھر آگیا“ وہ....

”وہ مین دن ہوئے گھر سے غیر حاضر ہے۔“ میں نے اس کا فقرہ مکمل کر کے اس کی شکل

آسان کر دی۔

”جی جی۔“ اُس نے ہلکا کر کہا۔ ”وہ آجائے گا۔“ بچہ تو نہیں کہ گم ہو جائے گا۔

”جی۔ وہ بچہ بالکل نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اُس نے تمہاری دھکی پر عمل کیا ہے۔“

دیکھو چوہدری! بہرا پھری چھوڑو۔ میں تم پر سیدھا سوال کرتا ہوں۔ سیدس جواب دو۔ میں جان چھڑاؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ مقدمے میں پوری دکر دوں گا۔ تم میرے مارا کرو۔ ”اللہ پاک کی قسم ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”پیر دوست گیارہ گز میں اس کی قسم ہے۔ مجھے کچھ بھی علم نہیں۔ لڑکا تیسرا دن ہے گھر نہیں آیا۔“

”اور تیسرا ہی دن ہے کہ لڑکی بھی گھر نہیں آئی۔ اور میں نے اسے ڈاکڑی معائنہ کے لیے مخاطب ہو کر کہا۔“ اور دو روز بعد کافر کا بچہ پولیس کپتان کو سامنے آکر سہا ہے۔ ”اگر تم لڑکی واپس کر دو تو میں راضی نامہ کروا دوں گا۔ میں نے لڑکے کے باپ سے کہا۔ ”پرچہ چاک نہیں کر دوں گا۔ اس نے پھول علی کم اٹھا کر دیا۔ میں نے لڑکی کو دیکھو چوہدری! چار سال گزرے اُن لوگوں نے لڑکی والوں نے، تمہاری بیٹی اُن کے گھر لیکن چھ سات روز بعد واپس کر دی تھی۔ تم بھی واپس کر دو۔“

اُس کا رنگ اڑ گیا۔ یہ خیر مجھے خبر نہ دی تھی۔ لڑکے کا باپ مجھے یہ سب سنا کر بھی بھیج پانا چاہتا تھا۔ ادھر ادھر کی چند ایک باتیں مجھے گراہ کرنے کے لیے کہنے کے لیے وہاں چار سال گزرے اس کی سبھی اس لڑکی کے ماموں۔ ملامت کی بنا پر انھوں نے اور بڑوں کی رائے سے واپس کر دی گئی۔ اب غلابہ یہی بتاتا تھا کہ ان لوگوں نے اتفاقاً لڑکی کو انوا کیا ہے اور اس پر مجرمانہ حملہ بھی کیا ہے۔

اس علاقے میں کھڑا اور خشک ندی نالے، عام تھے۔ زمین ہوار نہیں تھی۔ بیٹھا تفتیش کر رہا تھا اور کھوجی نظروں سے اوجھل رہتے تھے۔ دو گھنٹے گزر گئے تھے۔ میں نے تھوڑی دُور دیکھا تھا کہ گدھ اُتر رہے ہیں۔ پھر میں نے وہاں درختوں پر چڑھ کر دیکھنے دیکھے تھے مگر میں نے اس لیے توجہ نہ دی کہ کوئی مردار ہو گا۔ یہ ہے کہ گدھ کوئی

نئی چیز نہیں تھی۔ میں نے دیکھا کہ اُس طرف سے دونوں کھوجی بہت تیز تیز چلے آ رہے تھے اور ٹوٹھا کھوجی چادر ہلار رہا تھا۔ وہ ہمیں ہلار رہا تھا۔

میں اُن کی طرف چل پڑا۔ ہم ان کے قریب پہنچے تو وہ کچھ کہے بغیر آگے آگے چل پڑے۔

وہاں سے بجز اور کھڑوں کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ علاقہ اتنا بخر تھا کہ مویشی بھی اُدھر نہیں جاتے تھے۔ عام راستوں سے بہت ہٹا ہوا تھا۔ کھوجی ایک جگہ ٹک گئے وہاں گدھوں کا ایک غول اُدھر اُدھر بیٹھا تھا اور کھوجی پتھر اٹھا اٹھا کر نیچے مار رہے تھے اور نیچے سے گدھہ اڑ کر باہر آ رہے تھے۔

میں نے جا کر دیکھا۔ ایک نشی جگہ ایک لاش پڑی تھی اور اس کے قریب ایک کلہاڑی رکھی ہوئی تھی۔ یہاں نظر سے میں نے یہی سمجھا کہ لڑکی کی لاش ہے لیکن یہ کسی آدمی کی تھی۔ لاش کی حالت یہ تھی کہ پیٹ گدھوں نے چیر بھاڑ کر اندر سے کھا لیا تھا۔ سینہ بھی کھا لیا تھا۔ پسلیاں ننگی ہو گئی تھیں۔ بازو اور ٹانگیں الگ ہو چکی تھیں اور دھڑکے قریب ہی پڑی تھیں ان کا زیادہ تر گوشت گدھوں اور گیدڑوں وغیرہ نے کھا لیا تھا۔ ہڈیاں نظر آ رہی تھیں۔ انکھیں گدھوں نے نکال لی تھیں۔ صرف چہرہ اور سر سلامت تھا۔ لاش کو دیکھ کر پہلے تو سب پر سناٹا طاری ہو گیا۔ کسی کی اونچی سانس بھی نہیں نکلتی تھی۔ اس خاموشی میں ایک آدمی کی دھاڑ توپ کی طرح سنائی دی۔

یہ دھاڑ اکبر کے باپ کی تھی اور لاش اکبر کی تھی۔ یہ وہی نوجوان تھا جس کے ساتھ گمشدہ لڑکی کی منگنی بیوی اور ٹوٹی تھی اور اسی کے متعلق میرے دل میں یہ شک پیدا ہوا تھا کہ لڑکی کو اغوا کر کے لے گیا ہے اور انتقام اُس پر مجرمانہ حملہ کر کے قتل کر دیا ہو گا مگر وہاں

اُس کی اپنی لاش پڑی تھی۔ میں تو لڑکی پر اکر کر کے واپس کرنا اور کیس و میں فخر کرنے کی سہن رہا تھا لیکن یہاں قتل کا ایک اور کیس رجسٹر کرنا پڑا۔

بات جو ایک عام ذہن کے آدمی کو بھی سمجھ آ سکتی تھی، یہی تھی کہ اس مقتول کم سن لڑکی کو اغوا کیا اور اسی روز یا دوسرے روز لڑکی کے اداحقین سے کہہ کر قتل کر دیا۔ عام ذہن کا نہیں تھا۔ پولیس کو قتلہ و قمار کرنا پڑتا ہے جس کے لیے استغناء مضبوط اور قبیح طریق ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے لیے گواہوں اور شہوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ عدالتیں یہ جان پولیس کے منہ پر شک کر دیتا ہے۔ اور یہ تو اکثر ہوتا تھا کہ سیشن دن اپنے قریب ہی یہاں تک لکھو دیتے تھے کہ اغفین کرنے والے تھا نیا دارنے والے تو ناجی کا اثر کو بک گیا ہے۔

دوسری لاش کی تلاش

اس لاش کے ٹکڑے اکٹھے کرانے اور پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوانے کا اہتمام کر دیا میں نے یہ دیکھا کہ لاش کی کھوپڑی ٹوٹی ہوئی تھی۔ کلہاڑی کے ساتھ بال چپکے ہوئے تھے۔ اسی کلہاڑی سے قتل کیا گیا تھا۔

مجھے امید تھی کہ مقتول کا باپ جو اپنے ان بیٹے کی لاش دیکھ کر پاگل ہو گیا تھا، وہ ذہنی حالت میں کوئی کام کی بات بتا دے گا۔ میں نے اس سے بہت سوال پوچھے۔ گھر گھر جرن کی لیکن اس نے ”مجھے کچھ پتہ نہیں“ کے سوا کچھ بھی نہ کہا۔ صرف یہ بتا چکا کہ یہ کلہاڑی مقتول کی تھی۔ دستہ نم اور بنوا گیا تھا اور اس پر تین چار رنگ کیے گئے تھے۔ انہی سے کلہاڑی پہچانی گئی تھی اور اسی کلہاڑی کے ساتھ بال تھے اور دونوں بھی بنا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ ہو سکتا ہے اس کلہاڑی سے مقتول نے قاتل پر وار کیا

ہو۔ اس کے ساتھ ہی میں نے یہ بھی سوچا کہ یہ کھاڑی یقیناً سر پر ماری گئی ہے۔ اگر یہ قاتل کے سر میں اُترتی ہے تو وہ بھی زندہ نہیں ہوگا اور اگر وہ زندہ ہے تو دیکھنا پڑے گا کہ کون ہے اور کہاں ہے؟

میں نے لوگوں کو یہ کہہ کر دوڑا یا کہ ادھر ادھر جا کر دیکھو کہیں کوئی اور لاش تو نہیں پڑی؟ کھوجیوں سے کہا کہ وہ اپنی کارروائی کریں۔

گھنٹہ بھر کی تلاش سے کہیں کوئی اور لاش نہ ملی۔ البتہ کھوجیوں نے مجھے ساتھ لے جا کر پاؤں کے نیچے نیچے نشانات سے واردات کا ایک منظر دکھایا جو اس طرح تھا۔ خون کے خشک قطرے کھڈے نکلے اور آگے چلے گئے تھے۔ ان کے ساتھ پاؤں کے نشان کھڈکی طوف آتے تھے۔ مقتول کھڈکی طرف آ رہا تھا اور اس کا خون زمین پر گر رہا تھا۔ ایک جگہ مٹی نرم تھی۔ کھڑا تھا تھا کہ یہاں مقتول رکھا تھا۔ ہم آگے گئے۔ مقتول چلا آ رہا تھا اور آگے گئے اور کھوجیوں نے نیچے ایک جگہ روک لیا۔

میں نے زمین دیکھی۔ پاؤں کے بے شمار نشان اس طرح گڈٹ تھے جیسے دو تین آدمی یہاں ناچتے رہے ہوں۔

”یہاں لڑائی ہوئی تھی۔“ بوڑھا کھوجی بولا۔

اس سے آگے خون کا کوئی نشان نہیں تھا۔ خون وہاں سے کھڈکی طرف آیا تھا۔ مقتول زخمی ہو کر گاؤں کی طرف آیا تھا اور اس نے گاؤں تک پہنچنے کے لیے یہ راستہ اختیار کیا تھا کیونکہ یہ شارٹ کٹ تھا مگر زخم نے اسے اس کھڈے سے آگے نہ جانے دیا۔

شلوار پر خون، ایک معمر

قاتل کون تھا؟

ان حالات میں تھانیداروں کو مداروں کے کتب خانے پر پڑتے ہیں۔ سوچنا شروع کر دماغ تنگ جاتا ہے اور رات کو نیند بھی نہیں آتی، اور جب سر پر انگریز افسانہ چلا ہوتے تھے اور عدالت میں بال کی کھال اتارنے والے صفائی کے وکیل میو گواناں صفائی موجود ہوتے تھے اور جب تعقیب میں گاؤں کے لوگ ذرہ بھر تعاون نہیں کرتے تھے تو تھانیداروں کا جینا حرام ہو جاتا تھا۔ میرے لیے لڑکی کی گمشدگی کے ساتھ اس آدمی کا قتل جس پر اغوا کا شبہ کیا جاسکتا تھا۔ کچل کے دو پتھر بن گئے اور مجھے پیسے لگے۔ میرے دماغ میں واردات کے جو پہلو اٹھتے وہ یہ تھے:

لڑکی کو مقتول اغوا کر کے لے جا رہا تھا۔ لڑکی کے لواحقین نے اسے رات میں جا لیا اور قتل کر دیا۔ لڑکی مقتول کے ساتھ جا رہی تھی۔ رات میں کوئی گھنٹہ پہلے لڑکی لوگ ملے۔ انہوں نے مقتول کو قتل کر کے لڑکی کی آبروریزی کی اور اسے اٹھا کر لے گئے اور کہیں قتل کر کے لاش دبا دی۔ لڑکی اپنی مرضی سے مقتول کے ساتھ جا رہی تھی۔ لڑکی کسی اور کے ساتھ اپنی مرضی سے جا رہی تھی کہ اس کے سابق منگیتا (مقتول) نے دیکھ لیا اس نے لڑکی کو اس نامعلوم آدمی سے تھینا چار۔ ورڈزانی میں دھماکا لگایا۔ قاتل بھی زخمی ہوا۔ قاتل کسی اور گاؤں کا رہنے والا تھا۔ قاتل کو لڑکی کے والدین نے قتل کیا اور لڑکی کو بھی قتل کر کے لاش کہیں غائب کر دی۔ لڑکی کی آبروریزی کی گئی لیکن میں نے یہ شبہ بھی دل میں رکھا کہ لڑکی کی آبروریزی نہیں ہوئی اور شور اور اس پر خون پوسیں اور والدین کو دھوکہ دینے کا ایک ڈھونگ ہے۔

میں تھانے میں چلا گیا۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لیے شہر تھانہ دئی۔ شلووار کا پارسل کیا۔ کانسٹیبل کے ہاتھ لہوہ بیج دیا۔ ساتھ میں نے واردات کی ضروری تفصیلات لکھیں۔

کو وادات کے علاقے میں پھیلادیا۔ کھوجی اپنا کام کرتے رہے۔ کھوجیوں کی حیثیت صرف اتنی ہوتی تھی کہ وہ تفتیش آسان کر دیا کرتے تھے یا یوں کہنا چاہیے کہ اندھیرے میں پولیس کا ہاتھ کچھ کر جہاں تک ان کا تجربہ ساتھ دیتا تھا رہنمائی کرتے تھے مگر عدالت میں ان کی شہادت کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوتی تھی۔ مثلاً قانون کسی کھوجی کا اس قسم کا بیان قبول نہیں کرتا تھا کہ میں نے جو کھڑا دیکھا وہ اس ملزم کا تھا۔

کھوجیوں نے رات کے وقت مجھے یہ رپورٹ پیش کی کہ لڑکی کسی اور کے ساتھ گئی ہے اور ریلوے اسٹیشن کی طرف گئی ہے۔ (یہ پراچ لان کا چھوٹا ساسٹیشن تھا) مقتول وہاں تک ساتھ ہے جہاں لڑائی ہوئی ہے اور جہاں سے خون اور اس کا کھڑا کاؤں کی طرف واپس گیا ہے اور کھڈ میں جا کر ختم ہو گیا ہے۔

میں سوچنے لگا۔ کیا مجھے کھوجیوں پر بھروسہ کر کے تفتیش کو اس لائن پر ٹال دینا چاہیے کہ لڑکی کسی اور کے ساتھ اپنی مرضی سے گئی ہے مگر شلوار؟

انگریزوں کی حکومت میں سرکاری دفتر، ڈاکٹر اور جس محکمے کے ساتھ بھی واسطہ پڑتا تفتیش کے معاملے میں پورا پورا تعاون اور فوری کارروائی کرتے تھے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ تو سرے ہی دن مل گئی۔ لاہور سے شلوار والے نوں کی تیسرے دن رپورٹ آگئی۔ مقتول کی پوسٹ مارٹم رپورٹ سے ظاہر ہوا کہ کھٹائی کھوڑی میں سو تین انچ اُتر سی ہے۔ کھٹائی کے ساتھ جو بال ہیں وہ مقتول کے معلوم ہوتے ہیں۔ مقتول کی پیٹھ پر دونوں شولڈر بلیڈوں کے درمیان کھٹائی کا ایک آڈاز خرم ہے اور ایک زخم گردن کے دائیں طرف ہے جو دو انچ گہرا ہے۔ معدے کے متعلق کوئی چیز نہیں لکھا گیا کیونکہ معدہ گھٹما گئے تھے۔ چونکہ دل، پیسیپیڑے، جگر، تلی وغیرہ نہیں تھے اس لیے موت کے وقت کا تعین نہیں کیا جاسکا۔ کام کی بات یہ معلوم ہوئی کہ کھٹائی پر جو

خون ہے وہ مقتول کا ہے۔ گویا مقتول اپنی ہی کھٹائی پر تپا ہوا۔

لاہور سے شلوار پر لگے ہوئے خون کے متعلق جو رپورٹ آئی اس نے میرے کان کو بڑھ کر دیئے۔ لکھا تھا کہ خون جسم کے کسی اور حصے کا ہے۔ خون ایسی شہادت باق نہیں دیتا کہ لڑکا پر جہاز حملہ کیا گیا ہے۔ یہ رپورٹ تفتیش سے دی گئی تھی جو ساری کی ساری سنا اور دیکھی تھی۔ اس نے میرا شبہ نچھڑا کر دیا کہ شلوار اور اس پر خون ایک ڈھونگ ہے۔ مگر یہ سوال بھی پیدا تھا کہ اس ڈھونگ میں لڑکی بھی شامل ہے یا اسے اغوا کرنے والوں نے پولیس کو تفتیش میں گمراہ کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ لڑکی کے لواحقین نے اس مقتول کے ساتھ نازیبا حالت میں دیکھ لیا اور مقتول کو بھی قتل کر دیا جو اور لڑکی کو بھی قتل کر کے اس پر اس طرح پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہو کہ وہ لاپتہ ہو گئی ہے۔

بھائی اس مہن کا

جس روز شلوار کی رپورٹ آئی اس روز پولیس کپتان بھی آگیا۔ اس نے یہ کیس لکھا تو کہنے لگا کہ بہت دلچسپ کیس ہے۔ اس نے اس وقت کی تفتیش کی تفصیل پوچھی اور پھر مجھے پوچھنے لگا کہ میں اب کیا کروں گا۔ میں نے اسے بتایا تو اللہ نے مجھ پر کریم کیا کیس کے ذہن میں بھی یہی لائن آئی تھی۔ اس نے خوش ہو کر میری راہنمائی کی اور میں نے جی ٹیوٹن کے تمام کرتب دکھا کر اس پر ظاہر کیا کہ صاحب بنا، کو اذبال بلند ہو۔ میں اسی لائن پر چلنا چاہتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس نے بہت سارے شورے ایلے دیئے تھے جو میرے لیے سننے تھے اور میں نے نہیں سوچے تھے۔ خدا نے اسے بڑا قابل دماغ دیا تھا۔

جب وہ دایں جانے لگا تو مجھے کہا ”تمہیں یہ لڑکی مل جائے گی۔“ پھر اُس نے مُسکرا کر کہا ”اگر تم لڑکی کو اور قاتل کو کوپڑاؤ تو میں تمہیں انگلیٹڈ سکاٹ لینڈ پارٹ میں بھیج دوں گا۔“

میں نے غلاموں کی طرح اُس کا شکریہ ادا کیا اور دل میں کہا۔ ”تم اگر ذرا جلدی ٹل جاؤ تو یہی انعام کافی ہے۔“ میں نے پہلے سیلوٹ کیا اور جب اس کا گھوڑا چل پڑا تو میں مغلیہ دور کے درباریوں کی طرح جھک کر کوڑش سجالایا۔ میرے محتر نے جب کہا۔ ”دفع ہو گیا ہے۔“ تو میں سیدھا ہوا۔

میں مقبول اور گم شدہ لڑکی کے گاؤں چلا گیا۔ مخروں سے کوئی ایک بھی کام کی بات معلوم نہ ہوئی۔ گاؤں کے لوگوں نے زبانوں کو تالے لگا لیے تھے۔ یہ دو خاندانوں کی عداوت کا معاملہ تھا اس لیے دوسرے خاندان کوئی بات بتا کر ان سے دشمنی مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ میں نے ایک گھر کی ڈیوڑھی میں ڈیرہ ڈال دیا۔

لڑکی کے دو بھائی تھے۔ ایک چھٹلا۔ ایک بڑا۔ اس کا باپ تھا اور ایک چچا میں نے انہیں بلا کر باہر بٹھا دیا۔ سب سے پہلے باپ کو اندر بلایا۔ اسے ہر طرف سے گھرنے کی کوشش کی لیکن وہ اصل بات پر نہ آیا۔ پھر اس کے چچا کو بلایا اور اسے اعتماد میں لینے کے سینکڑوں جتن کیے۔ اس نے ہر ایک سوال کا جواب خود اعتمادی سے دیا لیکن میرے مطلب کی ایک بھی بات اس کے منہ سے نہ نکلی۔

لڑکی کے بڑے بھائی کو بلایا۔ اُس پر میں نے سیدھا وار کیا۔ میں نے کہا۔ ”تمہارا باپ اور تمہارا چچا پھسل گئے ہیں۔ تم یہ بتا دو کہ اپنی بہن کی لاش کہاں پھینکی جیے؟“

اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور پوری دیر سے بولا۔ ”لاش

کہیں پھینکی نہیں۔ اگر بہن زندہ سامنے آگئی تو اس کی لاش کہیں پھینکوں گی نہیں۔ لاش کہیں میں پڑی ہوگی اور میں تمہارے پاس کلماڑی کے درخود جس پر چڑھ جاؤں گا۔ اور اگر اُس کو قاتل کا تاپنا مل گیا تو اُس کی لاش بھی تمہیں خود دکھاؤں گا اور اپنے ہاتھ تمہارے آگے کر کے رکھ دوں گا۔ یہ لے تمہارا رہتی ہوگی لگا لے۔“

اسی پنچت بات سن کر میرا دل مان گیا کہ قصہ کچھ اور ہے اور میرا شبہ بے بنیاد ہے۔ پھر بھی میں نے اسے کہا ”دیکھ جانِ بغیرت، والے بھائی اسی طرح باتیں کیا کرتے ہیں۔ پولیس کا آدمی ہوں۔ میں صرف باتوں سے راضی نہیں ہوں گا۔“

اُس تیس چوبیس سال کی عورت گھبرو جان نے میرا ذرا سبھی لحاظ نہ کیا۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ”میں جانتا ہوں تم صرف باتوں سے راضی نہیں ہو گے۔ تم نے ہمارے دیکھوں کا خفیہ ریکھ لیا ہوگا۔ ہمارے گھر سے تمہیں ایک پیسہ نہیں ملے گا۔ ایک ہماری عزت گئی۔ دنیا کے سامنے بدنام ہوئے اور تم ہم پر الزام لگاتے ہو کہ ہم نے اپنی بہن کو قتل کر کے لاش کہیں چھپا رکھی ہے۔“ میں درمیان میں بولا۔ ”گناہ تو اس نے بڑے رعب سے کہا۔ اگرچہ ملک صاحب اہم تھا نیا رہو۔ میرے خدا نہیں ہو۔ تمہارے گھر میں بیٹی کی وفات سب سے بڑی غرت کرو۔ مجھے ہتھکڑیوں اور پھانسی کا ڈر نہیں۔ جس دن سے میری بہن غائب ہوئی ہے۔ میں پھانسی کے تختے پر کھڑا ہو گیا ہوں۔ مجھے اب تمہاری دھونس اور ٹھکانا لڑیاں ڈر انہیں سکتیں۔ اصل کارم کپڑو نہیں تو مجھے حوالات میں بند کر دو کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا سہ بہنیر سے ہاتھوں میں چھپ جائیں۔“

دیہات کے لوگ تمہا نیا لڑوں کو خدا سمجھا کرتے تھے۔ ایسی دھونس سے پولیس کے آگے کوئی نہیں بولتا تھا، لیکن اس نوجوان نے مجھے ہلاک رکھ دیا۔ میں بھی مسلمان تھا اور دو بچپن کا

باپ اور ایک بہن کا بھائی۔ میں نے اس کی بات تسلیم کر لی کہ لڑکی اپنے لواحقین کے ہاتھوں قتل نہیں ہوئی۔

اس کے باپ اور چچا کا انداز بھی بتاتا تھا کہ وہ بے گناہ ہیں۔ میں نے اس کے چہرے بھائی کو نہ بلایا۔ بڑے بھائی کو یقین دلایا کہ میں نے دوسرے فریق سے رشوت نہیں لی اور میں اس کی بہن کو اپنی بہن اور بھٹی سمجھتا ہوں۔ اسے میں نے کہا کہ میں اس کی ماں سے بھی ملنا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا کہ یہ مہربانی کرو کہ اسے یہاں نہ بلانا۔ ہمارے گھر چلو اور اکیلے چلو۔ کوئی سپاہی ساتھ نہ ہو۔ جو پوچھو گے بتائیں گے۔ عزت خاطر کریں گے لیکن ہم گاؤں میں یہ نہیں کہلوانا چاہتے کہ ہماری ماں کو پولیس نے طلب کیا ہے۔

میں اُس وقت وردی میں تھا۔ مجھے اس جوان کی باتیں اتنی اچھی لگیں کہ میں نے اسے کہا ”میں تمہارے خاندان کی پوری عزت کروں گا۔ میں وردی میں تمہارے گھر نہیں جاؤں گا اور دن کے وقت بھی نہیں جاؤں گا۔ آج رات کو آؤں گا۔“

لڑکی دوسرے گاؤں جاتی تھی

میں اُسی رات دیہاتی کپڑے پہن کر اُن کے گھر گیا۔ لڑکی کی ماں کو الگ بٹھا کر پوچھا کہ لڑکی عام طور پر کس طرح کے کپڑے پہنا کرتی تھی۔ میں نے اپنے ذہن پر بہت ہی زور دے کر تنقید کی ایک لائن نکالی تھی اور اس میں پولیس کپتان کے مشورے بھی شامل تھے۔ میں اب ان کے مطابق تفتیش کر رہا تھا۔

ماں نے بتایا کہ لڑکی ہمیشہ مٹھی ہی پہنا کرتی تھی یعنی شلوار اور قمیض کا رنگ ایک ہو جاتا تھا۔ یہ بات میرے کام کی تھی۔

میں نے اُس سے پوچھا ”لڑکی کے کتنے سوٹ تھے؟“
اس نے بتایا ”پانچ“

میرے پوچھنے پر اس نے ہر ایک سوٹ کا رنگ بھی بتا دیا میں نے اسے کہا کہ آئیے سوٹ وہ پہن کر گئی ہے۔ باقی جا سوٹ مجھے دکھاؤ۔ وہ اٹھی تو میں بھی اس کے ساتھ لائین لے سکے ہیں۔ پڑا۔ لڑکی کا سوٹ کیس الگ تھا۔ میں نے لائین پڑے رکھی۔ لڑکی کا باپ اور بھائی بھی ساتھ کھڑے تھے۔ سوٹ کیس سے یہ کپڑے برآمد ہوئے۔ تین سوٹ تین ایک ہی رنگ کی تھیں کی شلوار اور قمیض جن میں ایک سوٹ پھولدار تھا اور ایک قمیض آسمانی رنگ کی نکلی۔ تینیں اُس شلوار کے ساتھ کی تھی جو باہر سے خون آلود برآمد ہوئی تھی۔ کپڑوں کا پورا پورا گھڑا نہیں تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ لڑکی یہ سوٹ پہن کر گئی ہے اور آسمانی رنگ کی شلوار ویسے ہی ساتھ لے گئی تھی۔ راستے میں پھینک جانے کے لیے۔ یہ یاد رکھیے کہ شلوار ایسی بگہ بھینکی گئی تھی کہ ہاتھ درخت تھے۔ قریب پانی کا چھوٹا سا جوڑ تھا۔ کھیتوں میں کام کرنے والے وہاں آرام کے لیے بیٹھے تھے۔ وہاں سے راستہ بھی گذرتا تھا۔

گھر میں ماں نے چوتھا جوڑا بہت تلاش کیا نہ ملا۔ گھومتی گھومتی نقدی یا زیور کی کوئی چیز غائب نہیں تھی۔ میں سوچنے لگا کہ لڑکی کو ان بوڑھوں نے خود قتل نہیں کیا۔ اگر کو بھی انہوں نے قتل نہیں کیا تو قاتل کون ہے اور لڑکی کس کے ساتھ گئی؟۔ یہ امر یقینی تھا کہ لڑکی اپنی رضی سے گئی ہے۔

میں نے اس کی ماں کو الگ کر کے کہا ”جستہ تک تم کوئی سراغ نہیں دو گی۔ لڑکی نہیں ملے گی۔ یہ بتاؤ کہ اگر کے علاوہ گاؤں کے کسی اور لوگ نے لڑکی کے کبھی پسند کیا تھا؟ یا تمہیں کبھی شک ہوا تھا؟“

اُس نے قسمیں کھاکر کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی اور نہ ہی اُس نے کبھی اکبر کے متعلق پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔

”لڑکی کسی دوسرے گاؤں میں کبھی گئی تھی؟“

”ہاں۔“ ماں نے بلا جھجک کہا۔ ”فلاں گاؤں میں میری بہن ہے۔ لڑکی وہاں جایا کرتی تھی۔ تین تین چار چار روز رہتی تھی۔“

”تمہاری اس بہن کا کوئی لڑکا جو ان ہے؟“

”نہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”سب سے بڑے لڑکے کی عمر ابھی چھ سال ہے۔“

”لڑکی دوسرے گاؤں جایا کرتی تھی۔“ یہ الفاظ میرے دماغ میں اُٹک گئے۔ میں وہاں

سے خوش و غم نگلا۔ میری تفتیش غلط راستے پر نہیں جا رہی تھی۔ میں گاؤں سے نکلا تو سرکاری چوکیہ راستے میں کھڑا ملا۔ گاؤں میں صرف اسے پتہ تھا کہ میں آ رہا ہوں۔ وہ میری واپسی کے انتظار

میں وہاں کھڑا تھا۔ اُس نے پوچھا۔ ”میرے لیے کوئی حکم؟“

میں نے اُسے کہا کہ فلاں گاؤں کا چوکیدار صبح میرے پاس آجاتے اور اسے سختی سے

کہنا کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔

میں تھانے چلا گیا اور جب چار پائی پر لیٹا تو دو گھنٹے غیند ہی نہ آئی۔ میں نے اکبر کے

قتل کو ابھی نظر انداز کر رکھا تھا۔ ساری وجہ تو یہ لڑکی پر سختی اور پولیس والوں میں جو چھٹی جس ہوتی ہے

وہ مجھے بتا رہی تھی کہ لڑکی کا سراغ مل گیا تو اکبر کا قاتل بھی مل جائے گا۔

دیہات کے سرکاری چوکیدار بڑے کام کے لوگ ہوتے تھے۔ تھانے میں گھر گھر کی خبریں

دیا کرتے تھے۔ اُن کی بیویاں بھی ہماری خبر ہوتی تھیں۔ مغرب لوگ تھے۔ اُن کی بیویاں بڑے

گھروں میں کام کاج کیا کرتی تھیں اور ہر گھر میں آتی جاتی تھیں۔

صبح ہی صبح دوسرے گاؤں کا چوکیدار آگیا۔ وہ کوئی بڑا گاؤں نہیں تھا، مگر کسی

گھر مکان آئے تو سارے گاؤں کو پتہ چل جاتا تھا۔ میں نے اس چوکیدار سے اس لڑکی کے متعلق

پوچھا تو اُس نے یہ رپورٹ دی۔ لڑکی اپنی خالہ کے پاس آیا کرتی ہے۔ تین چار دن رہتی

ہے۔ گاؤں کا ایک جوان سال آدمی نور احمد، فوج میں نامک ہے۔ سال میں دو دفعہ چھٹی آتا ہے۔

ایک بار دس بارہ دنوں کے لیے اور ایک بار مینے کی چھٹی لے کر۔ وہ جب چھٹی آتا ہے تو لڑکی

اپنی خالہ کے پاس ضرور آتی ہے اور پانچ چھ دن رہتی ہے۔ اس کا چھوٹا مہائی چھوڑ جاتا ہے

اور لینے کے لیے بھی آجاتا ہے۔ میری (چوکیدار کی) جوبی نے بتایا ہے کہ لڑکی نور احمد سے

ملتی ہے۔ وہ اُس کی خالہ کے گھر بہت آتا جاتا ہے۔ رات کو دیر سے وہاں سے نکلتا ہے۔ اس

میں کوئی شک نہیں کہ لڑکی کا اس کے ساتھ دوستانہ ہے۔ لڑکی کی اس کے ساتھ شہ زوبی نہیں

ہو سکتی کیونکہ ذات نہیں ملتی۔

میں نے چوکیدار سے پوچھا کہ لڑکی کی گشتہ گی کے دنوں نور احمد چھٹی آیا تھا؟ اُس نے

بتایا کہ نہیں۔ دو مہینے گزرے۔ وہ چھٹی آیا تھا۔

نامک نور احمد کا تعلق

میں نے نور احمد کی یونٹ کا نمبر معلوم کر لیا اور پتہ پتا ڈال دیا۔ گاؤں کے ریلوے

سٹیشن سے چھاونی پینتیس میل دور تھی۔ میں نے دوسرے دن بھی وہ لڑکی کے باپ اور چچا

کو ساتھ لیا اور اُس چھاونی میں جا پہنچا۔ پولیس کپتان کا بیٹہ کوارٹر بھی وہیں تھا۔ دفتر ہی

طریقہ تو کچھ اور ہوتا ہے لیکن میں نے یہ دلییری کی کی سیدھا پولیس کپتان کے دفتر میں چھانک

مجھے ڈر تھا کہ وہ ڈانٹ کر بلکہ گالیاں دے کر دفتر سے نکال دے گا اور مجھے اس بدتمیزی پر

معتدل کر دے گا کہ میں دفتری طریقہ اختیار کرنے کی بجائے اپنے آپ کو اتنا بڑا افسر سمجھ بیٹھا ہوں کہ پولیس کپتان کو براہ راست بنے چلا گیا ہوں۔ لیکن مجھے اس چیز کا بھرپور سمجھنا کہ اس نے اس کیس کو دلچسپ کہا تھا اور اتنی دلچسپی لی تھی کہ مجھے مذاق میں کہا تھا کہ وہ مجھے سکاٹ لینڈ یا ڈیوچ دے گا۔

میں نے اندر اطلاع بھجوائی تو اس نے فوراً بلالیا۔ میں نے پہلے تو اس غیر کاری حرکت کی معافی مانگی پھر خوشامد اور جی حضور کی کمالات دکھانے شروع کیے مگر اس نے دھماکے سے کہا کام بولو کیا ہے کس واسطے دھماکا کیا؟

میں نے جلدی جلدی اسے اپنی تفتیش کی تفصیل سنائی۔ اُس کا غصہ مسکراہٹ میں بدل گیا۔ میں نے اُسے بتایا کہ نامک نور احمد فلاں راجہ جمنٹ میں ہے۔ اُس کے کانڈنگ آفیسر سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ اُسے کہیں کہ میری مدد کرے۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ لڑکی کا باپ اور چچا بھی ساتھ ہیں تاکہ لڑکی براہمد ہو تو اُس کی شناخت کر سکیں۔

پولیس کپتان نے کہا کہ ان دونوں کو رجمنٹ میں نہ لے جانا۔ انہیں پولیس لائنز میں ٹھہراؤ۔ اُس نے مجھے کہا کہ میں وہاں وردی میں نہ جاؤں تاکہ ملزم اگر مجھے دیکھ لے تو شک نہ کرے ورنہ باوردی تھانیدار کو دیکھ کر وہ چونکا ہو جائیگا۔ اُس نے اسی وقت اپنے پی اے سے کہا کہ فلاں رجمنٹ کے سی۔ او رکمانڈنگ آفیسر سے ملا دو۔ نمبر مل گیا۔ پولیس کپتان نے سی۔ او کو سارا کیس سنایا۔ سی۔ او انگریز تھا۔ اُس نے مجھے اُسی وقت بلالیا۔

میں نے لڑکی کے باپ اور چچا کو پولیس لائنز میں چھوڑا۔ وردی آماری اور بیگ سے اپنے کپڑے پہن کر رجمنٹ میں گیا۔ گوراکمانڈنگ آفیسر بڑی عزت سے پیش آیا۔ میں انگریزی میں اُسے کہانی سنانے لگا تو میں نے محسوس کیا کہ میری انگریزی سنانے کے اندر

یہی ٹھیک رہتی ہے۔

صاحب نے مسکرا کر کہا۔ ”ہم اردو ٹھیک سمجھتا ہے۔ اردو بولو“

اُسے مجھ پر یا شاید اپنی مادی زبان پر رحم آگیا تھا۔ میں نے اردو میں اپنے دار و دات اور اپنی تفتیش سنائی۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ بور ہو گا لیکن وہ اتنی دلچسپی سے سناتا کہ ایک بار بول پڑا۔ ”بہت اچھا آپکڑ۔ بہت اچھی سٹوری ہے اور ٹھیک سے سناتا۔ بہت سناتا۔“ میں نے باقی کہانی مزے لے لے کر سنائی اور اسے بتایا کہ مجھے شبہ ہے کہ اس جملے کا نامک نور احمد لڑکی کو لے آیا ہے اور میں اس سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں۔

اُس نے اسی وقت صوبیدار میجر کو اور نور احمد کے کہنی صوبیدار کو بلایا۔ دونوں آئے تو سی۔ او نے ان سے پوچھا۔ نامک نور احمد شادی شدہ ہے؟ اور کیا وہ فیملی کو اڑیس پاتا ہے؟

کہنی صوبیدار نے کہا۔ ”نہیں صاحب! وہ شادی شدہ نہیں ہے اور بارک میں رہتا ہے۔“

فوج میں شادی شدہ افراد میں سے کچھ کو فوجی وارڈن ملے ہیں جو بارکوں کے قریب ہی ہوتے ہیں۔ بارکوں میں جو افراد رہتے ہیں وہ بغیر اجازت باہر نہیں جاسکتے۔ میں نے سی۔ او سے کہا کہ مہربانی کر کے یہ انتظام کریں کہ رات کے وقت نامک، نور احمد پر نظر رکھیں۔

صوبیدار میجر نے کہا۔ ”نہیں صاحب! اساتذہ ہی بنید انہیں جتنا کہ رات کے وقت کوئی جوان یا عہدیدار لائٹوں سے غیر حاضر ہو۔“

میں نے اُسے کہا۔ ”جناب! میں پولیس کا آدمی ہوں۔ اگر ایک سنواری لڑکی اپنی شہوار کو خون گھاگھا کر سارے گاؤں کو یہ دھوکہ دینے کے لیے راتے میں سپینک گولی پھینکے گا تو اس

کی آبروریزی ہوئی ہے اور وہ قتل ہو گئی ہے تو فوج کا ایک نامک تو بہت کچھ کر سکتا ہے۔“
سی۔ اونے انہیں حکم دیا کہ رات کے وقت وہ کسی کی ڈیوٹی لگائیں جو چوری چھپے اس
کا خیال رکھے اور وہ جہاں کہیں جاتے۔ پک کر اُس کا پیچھا کرے اور دیکھے کہ وہ کہاں جاتا
ہے۔ سی۔ اونے مجھے کہا کہ میں کل ساڑھے آٹھ بجے صبح اُس کے دفتر میں آجاؤں۔
میں نے صوبیدار میجر اور صوبیدار کراچی اپنی طرف سے کچھ ہدایات دیں اور وہاں سے
پولیس لائنز چلا گیا۔

میں دوسرے دن ساڑھے آٹھ بجے سی۔ اوکے دفتر میں گیا۔ برآمدے میں صوبیدار میجر
اور صوبیدار کھرے تھے۔ اُن کے ساتھ ایک نامک اور ایک حوالدار بھی کھڑا تھا۔ حوالدار جنٹل
پولیس کا تھا۔ صوبیدار میجر نے اندر جا کر سی۔ اوکو میری اطلاع دی پھر مجھے بلایا۔
سی۔ اونے ہنس کر کہا۔ ”آپ کا ٹمک ٹمیک ہے صاحب!“

مجھے بتایا گیا کہ رجمنٹل پولیس کے حوالدار نے رات چھپ کر دیکھا۔ نور احمد رات گیارہ
بجے کے بعد بارک سے نکلا اور سنٹر لوئ کی نظر سے بچا ہوا لائٹوں کی حدود سے باہر نکل گیا۔ پولیس
حوالدار نے اُس کا تعاقب کیا۔ نور احمد تیز تیز چلتا چھاؤنی کے اُس علاقے میں پہلا گیا جہاں بیرے
اور ملازم وغیرہ معمولی معمولی سے مکانات میں رہتے ہیں۔ نور احمد نے ایک مکان کے دروازے
پر دستک دی۔ دروازہ کھلا اور وہ اندر چلا گیا۔ رجمنٹل پولیس کا حوالدار ادھر ادھر ہٹتا رہا اور چھپا
رہا۔ نور احمد صبح چار بجے اس مکان سے نکلا اور بارک میں آ گیا۔

یہ خون وہ نہیں تھا

میں نے سی۔ او سے کہا کہ اس مکان پر چھاپا مارنا ہے۔ میرے ساتھ رجمنٹ کے

کسی ذمہ دار افسر کا ہونا ضروری ہے۔ اس نے صوبیدار میجر کو یہی کہہ دیا کہ وہ میرے ساتھ رہے۔
نامک نور احمد کو پابند کر لیا گیا۔

میں دوڑا گیا۔ پولیس لائنز سے لڑکی کے باپ اور چچا کو ساتھ لے آیا۔ صوبیدار میجر
پولیس حوالدار اور نامک نور احمد کو ساتھ لے کر ہم اُس علاقے میں گئے جہاں وہ مکان تھا۔ راستے
میں نور احمد نے کسی کے ساتھ کوئی بات نہ کی۔ عائشہ کے باپ اور چچا کو وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اُن
کے ساتھ اس نے صرف ہاتھ ملایا تھا۔ وہ گھبرا یا ہوا بھی نہیں تھا۔

اُس علاقے میں پہنچ کر میں نے سب کو روکا اور نور احمد سے میں نے کہا ”نامک
نور احمد آپ ہمیں اُس مکان میں لے چلیں جہاں آپ نے فلاں گاؤں کے فلاں آدمی کی بیٹی
عائشہ کو رکھا ہوا ہے۔“

میں یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ اُس نے گھبرانے یا جھوٹ بولنے یا ٹال مٹول کرنے کی بجائے
یہ کہا۔ ”بسم اللہ۔ آؤ۔ سارے آجاؤ۔“

مجھے یہ ڈر محسوس ہوا کہ مکان میں لڑکی نہیں ہوگی ورنہ نور احمد اتنی دلیری کا مظاہرہ نہ کرتا۔
میرے پاؤں تلے سے زمین نکل رہی تھی۔ نور احمد نے ہماری راہنمائی کی اور ایک کچے سے مکان
کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا۔ ایک لڑکی کا چہرہ نظر آیا اور چہرہ کو اڑکے پیچھے ہو گیا۔
نور احمد نے ہمیں کہا ”آجاؤ۔“ اور دروازے کے پیچھے کھڑی لڑکی سے کہا ”گھبرا
نہیں۔ اللہ مالک ہے۔“

ہم اندر گئے۔ عائشہ سامنے کھڑی تھی۔ میں تو اسے نہیں پہچانتا تھا۔ اس کے باپ
اور چچانے اسے شناخت کر کے مجھے بتایا کہ یہی ان کی گمشدہ بیٹی ہے۔ نور احمد پورے اطمینان سے
اُگ کھڑا رہا۔ عائشہ کے باپ اور چچانے گالی گلوچ شروع کر دی۔ میں نے انہیں روک دیا اور

عائشہ سے کہا۔ ”تمہیں ہمارے ساتھ چلنا پڑے گا۔“

”یہ تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔“ نور احمد نے فوجیوں کے لہجے میں کہا۔ ”اس کی عمر بیس سال ہے۔ یہ اچھی مرضی سے میرے ساتھ شادی کچھی ہے۔“ نور احمد اندر گیا اور ایک سوٹ کیس سے اس نے نکاح نامہ نکال کر میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ اغوا کی واردات ہے اور اس کا تعلق ایک آدمی کے قتل کے ساتھ بھی ہے۔

نور احمد کی جگہ صوبیدار میجر بول پڑا۔ اس نے کہا۔ ”تھانیدار صاحب! فوج کا آدمی ہے اور ہمارے رہنما کا نامک ہے۔ اب آپ جو کارروائیاں کریں گے وہ ہمارے ہی اور صاحب کے آرڈر سے کریں گے۔ یہ گاؤں نہیں ہے، فوج ہے۔ یہ فوج کا دستور چلتا ہے، پولیس پولیس انہیں۔“

صوبیدار میجر کے لہجے میں میرے لیے کوئی جھڑپ نہیں تھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اپنے نامک کی طرف ذرا ہی کر رہا ہے۔ میں نے انہیں اسے کی کوشش کی تو صوبیدار میجر نے بڑی کے باپ اور چچا سے کہا کہ آپ ذرا باہر چلے جائیں۔ وہ چلے گئے تو صوبیدار میجر نے ہم سب کو اندر لے جا کر ایک چارپائی پر بٹھایا۔ لڑکی کو صحن میں بٹھایا۔ اس نے نور احمد سے کہا میں صحیح واقعہ سنارہا ہوں۔ پھر جراثیم کھائے گا۔“

نور احمد غالباً اشارہ سمجھ گیا۔ اس نے صاف صاف بتا دیا کہ اُسے جانتی تھی اور وہ لڑکی کو چاہتا تھا۔ اس کے گاؤں میں لڑکی اپنی خالہ کے ہاں جاتی تھی اور وہاں پہلی بار وہ ملے تھے۔ پھر ہر چھٹی کے دوران وہ ملتے رہے۔ ان کی محبت پاک تھی۔ ان کی شادی ذات کے فرق کی وجہ سے نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے لڑکی کو ایک رات بتائی کہ وہ مدر جگہ آئے گا اور لڑکی آجائے۔ انہوں نے یہ پروگرام دو ماہ پہلے بنایا تھا جب نور احمد چھٹی گیا ہوا تھا۔

نور احمد نے اُسے کہا تھا کہ ایک فالٹو شنوار ساتھ لانا۔ وہ جتن جھانپتی تھی۔ گانڈی پر گیا اور گاؤں سے اڑھائی میل دور ان کا جویشن تھا وہاں اُترا۔ اس کی عیب میں چاقو تھی۔ رات تک وہ ادھر ادھر چھپتا پھرتا رہا۔ مقررہ وقت پر مقررہ جگہ پہنچا۔ لڑکی اُٹھی۔ ایک شنوار اس کے ہاتھ میں تھی۔ نور احمد نے اپنی انگلی میں چاقو کی نوک ماری اور وہ شنوار اسے اپنی جگہ پر مل دیا اور شنوار ایسی جگہ چھینک دی جہاں سے لوگ نزلتے تھے۔ اس نے یہ ڈرامہ سنا۔ کھینکا تھا کہ شنوار برآمد ہوگی تو لوگ بھی سمجھیں گے کہ لڑکی کو خواب کر کے کہیں قتل کروایا گیا ہے۔ صوبیدار میجر نے کہا۔ ”لوگ ٹھیک کہتے ہیں کہ فوجی بیوقوف ہوتے ہیں۔ بسبب تم اتنی دلیری کر رہے تھے تو شنوار اور خون کا نامک بنانے کی کیا ضرورت تھی؟“ صوبیدار میجر نے مجھ سے کہا۔ ”انپکٹر صاحب! فوجی میں دلیری ضرور ہوتی ہے عقل نہیں ہوتی۔“

”جی ہاں۔“ میں نے کہا۔ ”اس نے تو بے عقلی کی جے کین میری قتل کا ایسا امتحان لیا کہ ساری عمر یاد رکھوں گا۔ اسے یہ پتہ نہیں تھا کہ شنوار والا خون ڈاکٹروں سے ٹیسٹ کروایا جائے گا اور پتہ چل جائے گا کہ یہ خون کیسا ہے۔“

بہر حال نور احمد نے بتایا کہ اس نے اس قسم کا ایک کامانی اپنے کپٹن کلرک سے مسمیٰ تھی۔ اُس کی فوجی عقل کو یہ طریقہ بڑا ہی اچھا اور کامیاب لگا۔ اُس نے شنوار وہاں بٹھائی اور جب پولن ایک میل آگے گئے تو اسے اچانک بانگ اُٹھنے پہنچے۔ آواز آئی کہ ٹھہر جائیں۔ مرد ہو تو لڑکی مردوں کی طرح لے جاؤ۔“

وہ فوجی تھا۔ برما فرنٹ پر لڑ کر آیا تھا۔ یہ سب سے پیچھے مڑا۔ عائشہ ایک طرف بٹھ گئی۔ وہ آدمی کھڑکی اپنے سر سے اوپر اور پیچھے لے جا چکا تھا۔ عائشہ ذرا پیچھے تھی۔ اس نے اتنی پھرتی دکھائی کہ جب تک کہ آگے ہوئی اور کمر لڑی جو ابھی اس آدمی کے سر سے پیچھے ہی تھی

عائشہ نے پکڑ لی اور زور سے پیچھے کھینچی۔ وہ مرد تھا۔ لٹماڑی اس کے ہاتھ سے نہ نکلی۔ البتہ اس کا وارڈ رک گیا۔ نور احمد نے اچھل کر اُس کے پیٹ میں لات ماری۔ کٹماڑی اس آدمی کے ہاتھ سے چھوٹ گئی، اور عائشہ کے ہاتھ میں رہ گئی۔ عائشہ نے کٹماڑی نور احمد کو دے دی۔

انہیں ابھی معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ یہ آدمی کون ہے۔ اندھیرا لگا ہوا تھا۔ نور احمد نے کٹماڑی کے تین وار کیے۔ ایک گر ن پر لگا۔ ایک پٹھر پر اور آخری وار سر پر لگا۔ نور احمد نے کٹماڑی اس کے سر میں ہی رہنے دی اور عائشہ کو لے کر ٹیشن کی طرف چل پڑا۔ نور احمد نے اسے لڑکھڑاتے دیکھا تھا۔ گرتے نہیں دیکھا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ جو کوئی بھی متاعب وار کرنے کے قابل نہیں رہا۔ عائشہ اور نور احمد کو بالکل علم نہیں تھا کہ وہ کون تھا۔ میں نے نور احمد کو بتایا کہ وہ عائشہ کا پہلا منگیتر اکبر تھا۔

وہ دلیر تھا یا بیوقوف؟

خون کے نشان کھوجیوں نے مجھے دکھائے تھے۔ ان سے بات کی کہانی مکمل ہوتی تھی۔ اکبر کٹماڑی اٹھا کر یا کٹماڑی کے سہارے وہاں گئے گاؤں کو چل پڑا تھا اور کھد میں جا کر مر گیا تھا۔ اپنے قتل کا آلہ قتل اس کے اپنے ہی پاس رہا۔ نور احمد صبح سے پہلے چھاؤنی پہنچ گیا۔ اُس نے مکان کا انتظام اور اس کے دوستوں نے نکاح کا انتظام کر رکھا تھا۔ نکاح پڑھا گیا۔ اب وہ ہرات یہ منظر مول لیتا تھا کہ رات گیارہ بجے کے بعد چوری چھپے اپنی بیوی کے پاس چلا جاتا تھا اور صبح چار بجے باک میں آجاتا تھا۔

یہ سرائے لگانا نامکن تھا کہ اکبر ان کے پیچھے کس طرح چلا گیا تھا۔ اس نے شاید رات کو عائشہ کو گاؤں سے باہر جاتے دیکھ لیا ہوگا اور کٹماڑی کے کہ اس کا پیچھا کیا ہوگا۔ بہ حوال

یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

نور احمد نے جس دلیری سے اپنے جرم کی تفصیل سُنادی۔ اس سے یہ رات قائم کرنا مشکل تھا کہ وہ دلیر ہے یا بے وقوف۔ میرے خیال میں اس میں دونوں ہی صفتیں تھیں۔ دیکھو کہ جتنا کہ اس جہان کا مستقبل کس طرح تاریک ہو گیا ہے اور اُس نے ایک نوجوان لڑکی کی بھی زندگی تباہ کر دی ہے۔ نور احمد کو تواب جیل جانا تھا۔ بہ حال اس کی رہنمائی کے غمزدگی نے میری اور اس کی ساری شکلیں آسان کر دیں۔ وہ اس طرح کہ جب میں نے لڑکی کی برائگی کے کاغذات تیار کر لیے اور صوبیدار اور پولیس حوالدار سے دستخط لینے لگا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

صوبیدار میرے لئے کہا۔ ”ہمارے سامنے کوئی لڑکی برآمد نہیں ہوتی۔ جہاں سے سی۔ و صاحب سے بات کرو۔“

ہم رجسٹر کے دفتر میں گئے۔ مجھے بابہ کچھ یاد آیا گیا۔ صوبیدار میرے پیٹے سی۔ و کے دفتر میں جانے کی بجائے کسی اور افسر کے دفتر میں چلا گیا۔ پھر میں نے دو انگریز افسروں کو صوبیدار میرے ساتھ سی۔ و کے دفتر میں جاتے دیکھا۔ بہت دیر بعد نامک نور احمد کو گاؤں لایا گیا۔ کوئی ایک گھنٹہ بعد سب باہر نکلے۔

اتنی دیر میں ان کا جنرل پولیس حوالدار یہ رہ پاس بیٹھا رہا اور اُس نے مجھے کہا۔ ”آپ کو یہ آدمی نہیں ملے گا۔ فوجی ایک دوسرے کی پس پوری مدد کیا کرتے ہیں۔ یہ نامک ہمارے رجسٹر کا ہی نہیں ڈیڑھن کا بھی اتھلیٹ ہے۔ فوج میں اتھلیٹ کو گھوڑے کی طرح پانا جاتا ہے اور اسے رجسٹر کی عزت سمجھا جاتا ہے۔“

آخر مجھے سی۔ و نے اندر بلایا اور صرف اتنا کہا۔ ”آپ اپنے کھنے کی طرف سے ہمیں کہیں“

تھکہ آپ کو ہمارا ایک نامک کیوں مطلوب ہے۔ آپ جاسکتے ہیں۔
 میں پولیس کپتان کے پاس گیا۔ اُسے پوری رپورٹ دی۔ اُس نے اُسی وقت سی۔او۔کو
 ٹیلی فون کیا، لیکن صرف ایک منٹ میں سی۔او نے بات ختم کر دی۔ پولیس کپتان نے ریسپور
 بٹنی زور سے رکھا اور چٹائی زبان کی موٹی ساری گالی دی۔
 اس کے بعد پولیس اور فوج میں خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ رجمنٹ نے لکھا کہ
 واردات والی رات نامک نور احمد ڈیوٹی پر تھا اور اس عرصے میں رجمنٹ لائنز سے کبھی غیر متحر
 نہیں ہوا۔

ہمیں اپنی کارروائی پوری کرنی تھی۔ نامک نور احمد کو بہر حال ہم نے بڑے جتن کر کے پولیس
 کی حراست میں لیا اور چالان عدالت میں دے دیا لیکن ملازم کی رجمنٹ نے دستاویزی ثبوت
 پیش کر دیا کہ ملازم واردات کی رات موقعہ واردات سے پینتیس میل دور نائٹ ڈیوٹی پر تھا۔ ہمارا
 کیس ایسا چوٹ بڑا کہ مجسٹریٹ نے مقدمہ سیشن سپرد کیا ہی نہیں اور ملازم کو چھوڑ دیا۔
 لیکن نور احمد اور عائشہ سزا سے بچ نہ سکے۔ بعض قارئین کرام کو ۱۹۷۶ء کا آخری مہینہ
 یاد ہو گا جب ملک میں اسمبلیوں کے انتخابات ہو رہے تھے۔ مسلمان پاکستان کے نام پر اور غیر مسلم
 متحدہ ہندوستان کے نام پر ایکشن رٹ رہے تھے۔ ملک کا بچہ بچہ اس ایکشن میں سپاہیوں کی طرح
 لڑ رہا تھا۔ بکری کی توجہ ایکشن پر تھی۔ انہی دنوں اخباروں میں چھوٹی سی ایک خبر چھپی تھی۔
 ”جہلم چوٹی میں ایک شقی اعلیٰ دیہاتی نے ایک رجمنٹ کی بارک میں حاکم نور احمد نام کے ایک
 نامک کو گولہ مار کر مار دیا۔ اس سے پہلے وہ اُس کی بیوی کو جو قاتل
 کی اپنی بہن تھی۔ اُس کے بچان میں قتل کر آیا تھا۔ فوجیوں نے قاتل پر قابو پا لیا اور اسے پولیس
 کے حوالے کر دیا۔ قتل کی وجہ دیرینہ عداوت بیان کی جاتی ہے۔“

